کرنا چاہئے، کمافی الحدیث لیؤمکم اقرأکم۔ واللہ اعلم، ۶ رجمادی الاولی ۵۱ھ

محلہ کی مسجد میں اگر جماعت فوت ہو جائے تو کیا کریں

سوال (۵) اگر مسجد میں جماعت فوت ہوئی ہو تو تنہا مسجد میں نماز ادا کرنا بہتر ہے یا مکان پر اور فضیلت مسجد میں نماز پڑھنے کی جو پچیس یا پانچسو یا ہزار یا پچاس ہزار یا لاکھ کا مسجد محلہ سے لے کر کعبہ تک کے بارہ میں آیا ہے تو یہ باعتبار جماعت کے یا تنہا اور یہ سب واجبات سے ہے یا مندوبات سے، بینوا توجروا۔

الجواب: قال فی الخلاصۃ (ص ۲۲۸ ج ۱) رجل فاتتہ الجماعۃ فی مسجدہ ان ذہب الی مسجد آخر لیصلی فیہ بالجماعۃ فہو حسن وان صلی فی مسجد حیہ وحدہ فحسن وان دخل منزلہ فصلی باہلہ فحسن اھ، اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اپنی مسجد میں اگر جماعت فوت ہو جاوے تو دوسری مسجد میں جا کر جماعت سے نماز پڑھنا بہتر ہے، اور اگر تنہا اسی مسجدِ محلہ میں پڑھ لے یہ بھی اچھا ہے، اور اگر اپنے گھر پر آ کر اہل وعیال کے ساتھ جماعت کر کے پڑھے یہ بھی بہتر ہے، اور بظاہر سب سے بہتر صورت اُولیٰ ہے، اور اخیر کی دونوں صورتیں فضیلت میں برابر ہیں، کیونکہ تنہا مسجد میں پڑھنے سے جماعت کا ثواب نہ ہوگا، مگر مسجد کی فضیلت حاصل ہو جاویگی اور گھر پر جماعت کرنے سے مسجد کی فضیلت فوت ہو جاوے گی مگر جماعت کا ثواب مل جائیگا مگر میرے خیال میں تیسری صورت دوسری سے افضل ہے، کیونکہ جماعت کی فضیلت مسجد کی فضیلت سے زیادہ ہے۔ البتہ اگر مسجدِ محلہ میں کوئی بھی نماز نہ پڑھتا ہو اس وقت مسجد میں تنہا نماز پڑھنا گھر پر جماعت کرنے سے افضل ہے، اور مسجد میں نماز پڑھنے پر جو ثواب احادیث میں وارد ہے وہ ہر حال میں ہے خواہ تنہا پڑھے یا جماعت سے، اور جماعت کا ثواب اس کے علاوہ ہے (کذا دل علیہ اطلاق الحدیث) واللہ اعلم، جماعت حنفیہ کے نزدیک واجب عین ہے، اور مسجد میں جماعت کرنا سنتِ مؤکدہ ہے، واللہ اعلم، قال فی الخلاصۃ قال الصدر الشہید انما الاساءۃ فیما اذا ترک اہل المسجد کلہم الجماعۃ فہم اساؤا وترکوا السنۃ وان صلوا بالجماعۃ فی البیت اختلف المشائخ فیہ والصحیح ان للجماعۃ فضیلۃ وللجماعۃ فی المسجد فضیلۃ اخری فہو قد اتی باحدی الفضیلتین وترک الاخری وہکذا الجواب فی المکتوبات اھ ص ۶۳ ج ۱، ۲۴ رجمادی الاولیٰ ۵۱ھ

امام کا کتنا اونچا کھڑا ہونا مکروہ ہے؟

سوال (۶) .... امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا مکروہ ہے خواہ کتنی ہی اونچی ہو، اس کی دلیل بحر الرائق (ج ۲ ص ۲۶) میں ہے

اور محراب میں بھی امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے، وقت فرصت جواب مرحمت ہو،

الجواب؛ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ امام کا مطلقاً کسی قدر اونچا کھڑا ہونا مکروہ نہیں مثلاً دو انگل یا چار انگل اونچا ہو یہ جائز ہے، بحر الرائق کی عبارت سے میرے اس قول کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں قولہ وانفراد الامام علی الدکان وعکسہ اما الاول فلحدیث الحاکم مرفوعاً نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یقوم الامام فوق ویبقی الناس خلفہ وعللوہ بانہ تشبہ باھل الکتاب فانھم یتخذون لامامھم دکانا واطلقہ فشمل ما اذا کان الدکان قدر قامۃ الرجل اودون ذلک وھو ظاھر الروایۃ وصححہ فی البدائع لاطلاق النھی وقیدہ الطحاوی بقدر القامۃ ونفی الکراھۃ فیما دونہ اھ غالباً رفشمل ما اذا کان الدکان قدر قامۃ الرجل اودون ذلک) سے آپ کو یہ شبہ ہوا ہے کہ ذرا سی بلندی بھی مکروہ ہے، حالانکہ صاحبِ بحر کا یہ مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود طحاوی کے قول کو رَد کرنا ہے، کہ انھوں نے قدِ آدم بلندی کو مکروہ کہا ہے، اس سے کم کو مکروہ نہیں کہا، یہ تقیید صحیح نہیں، کیونکہ اطلاقِ حدیث قدِ آدم اور اس سے کم دونوں کی کراہت کو مقتضی ہے، رہا یہ کہ قدِ آدم سے کم جس قدر بھی ہو سب مکروہ ہے، حتیٰ کہ ایک دو انگل بلندی بھی، یہ اس عبارت سے مفہوم نہیں ہوتا، بلکہ آگے چل کر خود بحر الرائق میں تصریح ہے کہ تھوڑی سی بلندی مکروہ نہیں ہے، وقال قاضی خان فی شرح الجامع الصغیر انہ مقدر بذراع اعتبارا بالسترۃ وعلیہ الاعتماد وفی غایۃ البیان وھو الصحیح وفی فتح القدیر وھو المختار، اس میں تصریح ہے کہ صحیح اور معتمد قول یہ ہے کہ ایک ذراع بلندی مکروہ ہے، اس پر اعتماد ہے، اس سے کم مکروہ نہیں، اس کے بعد لکھتے ہیں ولکن قال رای صاحب الفتح ۱۲) الاوجہ الاطلاق وھو ما یقع بہ الامتیاز لان الموجب وھو شبہ الازدراء یتحقق فیہ غیر مقتصر علی قدر الذراع اھ یعنی صاحب فتح نے کہا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ذراع کی قید نہ لگائی جائے، بلکہ اطلاق پر رکھا جاوے کہ جتنی بلندی سے امتیاز حاصل ہو وہ مکروہ ہے، سو اوّلاً یہ صاحب فتح کی رائے ہے روایت نہیں ہے، دوسرے ان کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ذرا سی بلندی بھی مکروہ ہے، کیونکہ وہ اگر ذراع کی قید نہیں لگاتے تو یہ قید ضرور بڑھاتے ہیں کہ جتنی بلندی سے امام کو امتیاز ہو جائے، وہ مکروہ ہے، اس سے کم مکروہ نہیں، اور ظاہر ہے کہ ایک دو انگل

بلندی سے امام کو امتیاز حاصل نہیں ہوتا، دوسرے اگر ذرا سی بلندی بھی مکروہ ہوجاوے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ مسجدوں کا فرش آلات سے جانچ کر لگانا ضروری ہو کیونکہ جب بدون آلات سے دیکھے کیف ما اتفق فرش لگایا جاوے گا تو ایک دو انگل کسی جگہ سے اونچا نیچا ہوجانا ضرور ممکن ہے، حالانکہ زمانۂ قدیم میں اس طرح آلات سے فرش کی برابری نہیں دیکھی جاتی تھی، اور نہ حدیث کا یہ مفہوم ہے، حدیث کا مطلب تشبّہ اہل کتاب سے روکنا ہے، اور وہ لوگ امام کے لئے خاص طور پر اونچی جگہ ممتاز بناتے تھے، ایک دو انگل بلندی سے ان کا تشبّہ لازم نہیں آتا، رہا محراب میں کھڑا ہونا وہ اُس وقت مکروہ ہے جبکہ امام پورا محراب میں ہو اور اگر قدم باہر ہوں اور سجدہ محراب میں ہو یہ جائز ہے، قال الشرنبلالی فی نور الایضاح ویکرہ قیام الامام بجملتہ فی المحراب لا قیامہ خارجہ وسجودہ فیہ (ص ۲۱۱) واللہ اعلم قال الشامی وفی التتارخانیۃ ویکرہ ان یقوم فی غیر المحراب الا لضرورۃ اھ ومقتضاہ ان الامام لو ترک المحراب وقام فی غیرہ یکرہ ولو کان قیامہ فی وسط الصف لانہ خلاف عمل الامۃ وھو ظاھر فی الامام الراتب دون غیرہ والمنفرد اھ، واللہ اعلم، ۲ر جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۴۲ھ

غیر مقلد کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم | **سوال (۷)** ....

.... غیر مقلدین کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے، آیا بطریق اکمل واحسن نماز ادا ہوجاتی ہے یا کسی قسم کی خرابی لازم آتی ہے؟

الجواب: غیر مقلد اگر ائمہ اربعہ کو بُرا نہ کہتا ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے بشرطیکہ طہارت وغیرہ میں مواقع خلاف کا مراعی ہو، واللہ اعلم، ۳ر شوال سنہ ۴۲ھ

امامت کی فضیلت کا ثبوت | **سوال (۸)** زید کہتا ہے کہ امامت کا ثواب کہیں قرآن وحدیث یا فقہ کی کتابوں سے ثابت نہیں، اسی وجہ سے میں امامت نہیں کرتا، تو کیا واقعی کسی حدیث میں امامت کے ثواب کا کوئی درجہ ہے، اگر ہو تو استدلال احادیث صحیح سے جواب عطا فرمایا جاوے

الجواب: فضیلتِ امامت میں حسب ذیل احادیث وارد ہیں جو اس وقت میری نظر سے گذری ہے، عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من أمّ قوما فلیتق اللہ ولیعلم انہ ضامن مسئول

لما ضمن وان احسن کان لہ من الاجر مثل اجر من صلی خلفہ من غیر ان ینقص من اجورھم شیئا وما کان من نقص فھو علیہ رواہ الطبرانی فی الاوسط من روایۃ معارک بن عباد قلت وھو حسن علی قاعدۃ المنذری کما لا یخفی وعن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلثۃ علی کثبان المسک اراہ قال یوم القیمۃ عبد ادی حق اللہ وحق موالیہ ورجل أم قوما وھم بہ راضون ورجل ینادی بالصلوٰت الخمس فی کل یوم ولیلۃ رواہ احمد والترمذی وقال حدیث حسن ورواہ الطبرانی فی الصغیر والاوسط باسناد لا بأس بہ ولفظہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثۃ لا یھولھم الفزع الاکبر ولا ینالھم الحساب ھم علی کثیب من مسک حتی یفرغ من حساب الخلائق رجل قرأ القرآن ابتغاء وجہ اللہ وأم بہ قوما وھم بہ راضون الحدیث کذا فی الترغیب للمنذری، ص ۷۸، ج ۱۔

ان احادیث سے امامت کی حسب ذیل فضیلتیں ثابت ہوئیں، بشرطیکہ امام شرائطِ صلوٰۃ کی پوری رعایت کرے، (۱) جتنے آدمی اس کے پیچھے ہوتے ہیں ان سب کی نمازوں کے برابر اس کو بھی ثواب ملتا ہے اور اس کی نماز کا ثواب علیحدہ ہے، (۲) قیامت کی گھبراہٹ سے مامون رہے گا (۳) حساب کتاب سے محفوظ رہے گا (۴) مشک کے ٹیلوں پر قیامت میں بے فکر بیٹھا رہے گا، یہاں تک کہ مخلوق حساب سے فارغ ہو، اور فقہاء نے لکھا ہے کہ امامت اذان سے افضل ہے، کیونکہ امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا حق ادا کرتا ہے، ۱۵ شوال سنہ ۴۵ھ

اگر نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہو تو مجذوم کا گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے، اور اسے جماعت کا ثواب ملیگا

سوال (۹)

ایک آدمی کو عارضہ جذام کا ہوگیا ہے، مگر جسم مجذوم کا بالکل سلامت ہے، کسی عضو میں فرق نہیں ہے، اور ہر کس و ناکس سے ملتا رہتا ہے، اور ہر مقام پر آتا جاتا ہے، مثلاً مسجد و خانقاہ، مجلس و محفل وغیرہ اور وہ آدمی نماز جماعت کا شوقین اور پابند ہے، لیکن بعض آدمی اس سے نفرت کرتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ نماز جماعت میں شامل ہوگا تو میں نماز میں مسجد میں نہ پڑھوں گا مگر اکثر لوگ ملتے جلتے ہیں اور نماز باجماعت اس کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اور اس کی مجالست و مخالطت رکھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ مرض خداوند تعالیٰ کے اختیار میں ہے جس کو چاہے

دیدیوے، اور مجذوم کہتا ہے کہ قرآن وحدیث سے علماء منع فرمادیں تو میں اپنے مکان پر نماز جماعت ترک کرکے پڑھ لیا کروں، لہذا مسلمانوں کی رائے سے یہ استفتاء ارسال خدمت والا ہے، کہ بحوالہ کتب معتبرہ کے ارشاد فرمادیں تاکہ مسلمانان اس کے مطابق عمل کریں، یعنی اس بیچارے جذامی کو ساتھ لے کر نماز پڑھیں یا پرہیز کریں؟

الجواب: جب مجذوم سے نمازیوں کو ایذاء ہوتی ہے تو اس کو نماز اپنے گھر پڑھنا چاہئے، جماعت یا جمعہ وغیرہ وغیرہ میں شریک نہ ہونا چاہئے، اس کو گھر پر نماز پڑھنے میں بھی جماعت کا ثواب ملے گا، جبکہ وہ جماعت کا شوق دل میں رکھتا ہے، فی الفتاوی الشامیہ وکذلک الحق بعضھم بذلک من بفیہ بخراو بہ جرح لہ رائحۃ وکذلک القصاب والسماک والمجذوم والابرص اولی بالالحاق وقال سحنون لا اری الجمعۃ علیھما الی ان قال وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیقعد فی بیتہ صریح فی ان اکل ھذہ الاشیاء (مثل الثوم والبصل) اذا کان عن ضرورۃ ۱۲) عذر فی التخلف عن الجماعۃ وایضا ھنا علتان اذی المسلمین واذی الملائکۃ نبا لنظر الی الاولی یعذر فی ترک الجماعۃ وحضور المسجد الخ ص ۶۹۲ ج ۱۔

۳۰ ر ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ،

بیٹھ کر نماز پڑھانیوالے امام کے پیچھے نماز کا حکم۔

سوال (۱۰) ایک صاحب بعمر ۱۸ سال سے لڑکے اور لڑکیاں پڑھاتے رہے، اور مسجد میں پیش امام بھی رہے ہیں، اور اب انکی عمر ۸۵ سال ہے، یا زیادہ کی ہوگی، اور پھر یہ امر ربی ہوا کہ ۳۴ سال قحط جو ہوا بسبب تنگی گھاس درخت سے گر کر ضرب شدید ٹانگوں میں ہوگئی، اور ہڈی وغیرہ میں کچھ ضرب نہیں ہوئی، اور پھر وہ ہی اپنا کام بیٹھ کر کرتے رہے، اور نماز باقاعدہ پڑھارہے ہیں، کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین اس مسئلہ میں کہ ان کے مقتدیوں کی نماز میں کچھ فرق تو نہیں پڑتا، .... بسبب ناطاقتی کے بیٹھ کر پڑھاتے ہیں،

الجواب: اگر یہ شخص بوجہ عذر کے بیٹھ کر نماز پڑھاتا ہے اور رکوع وسجدہ بجالاتا ہے، یعنی رکوع وسجدہ کے لئے محض اشارہ نہیں کرتا، بلکہ جس طرح تندرست آدمی بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے ہیں کہ رکوع کے لئے گھٹنوں کے مقابل سر جھکاتے ہیں، اور سجدہ کے لئے زمین پر سر ٹیکتے ہیں اسی طرح وہ بھی کرتا ہے تو مقتدیوں کی نماز

صحیح ہے، مگر اس صورت میں بھی احتیاط یہی ہے کہ امام ایسا آدمی ہو جو کھڑا ہو کر قیام اور رکوع بجالا وے، اور اگر یہ شخص سجدے کے لئے زمین پر سر نہیں ٹیک سکتا بلکہ اشارہ سے سجدہ کرتا ہے تو مقتدیوں کی نماز درست نہ ہوگی، قال فی نورالایضاح وصح اقتداء قائم بقاعد اھ قال الطحطاوی ای یرکع ویسجد وہذا عندہما خلافا لمحمد وقولہ احوط کما فی البرہان وغیرہ اھ ص ۱۷۲، واللہ اعلم ۱۶ر ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ

احق بالامامت کو مقدم کرنا سنت مؤکدہ ہے یا مستحب اور غیر احق کو مقدم کرنے کا حکم،

سوال (۱۱) باب الامامۃ میں جو احق بالامامت الاعلم باحکام الصلوٰۃ مذکور ہے، تو باب اول کتب فقہ کی ترتیب کا ملحوظ رکھنا از قبیلہ مندوبات ہے یا سنت مؤکدہ ہے، بہشتی زیور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت ہے۔ **مسئلہ**: اجارہ علی الطاعات متقدمین کے نزدیک ناجائز ہے، البتہ متاخرین بعض طاعات میں بضرورت اس کے جواز کے قائل ہیں، پس امامت کے لئے کسی کو اجورہ پر مقرر کرنا بے ضرورت جائز ہے یا نہیں، یعنی فی زمانہ جو متولیان و منتظمان کی مساجد کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ وہ کسی حافظ وغیرہ کو اجرت پر امام مقرر کرتے ہیں اور قوم میں بعضہم فوق بعض عالم، فاضل، قاری موجود ہوتے ہیں، ان سے اس بارے میں کچھ مشورہ نہیں کیا جاتا، اور مقتدیوں میں سے جو پنجگانہ نماز میں حاضر رہتے ہیں اور بہت سے ان میں احق بالامامۃ ہوتے ہیں ان سے نہیں کہا جاتا کہ تم میں جو احق بالامامۃ ہو وہ کار امامۃ اپنے ذمہ لے، بلکہ محض اپنی رائے سے جو مناسب اجورہ پر کوئی معمولی شخص دستیاب ہوگیا کہ نہ وہ ذی علم ہوتا ہے نہ صحت کے ساتھ مثل قاریوں کے قرآن شریف پڑھ سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ محض حافظ ہوتا ہے اور اس کو امام مقرر کردیتے ہیں، پھر بسا اوقات اُن لوگوں کو جو احق بالامامت ہوتے ہیں ان کو اس شخص کی اقتداء میں گوناگوں وجوہ سے ضیق واقع ہوتی ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ اگر نماز پڑھانا ہمارے متعلق ہوجاوے تو ہم اس کو بہ طیب خاطر گوارہ کریں اور ہمیں تنخواہ وغیرہ سے کچھ غرض نہیں، لیکن متولیان و منتظمان مساجد اس طرف توجہ نہیں کرتے، تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگر قوم میں عالم فاضل افضل لوگ موجود ہوں تو ان کی موجودگی میں متولیانِ مساجد کو بلا مرضی ان کی کے کسی غیر احق کو امام مقرر کرنا جائز ہے اور موافق سنت ہے یا نہیں اور متولیانِ مساجد کو اور قوم کو ایسا حق حاصل ہے یا نہیں؟ کہ وہ بموجودگی احق بالامامۃ کے

غیر کو بلا مرضی و استمزاج احق بالامامۃ امام مقرر کرسکیں، اور اگر قوم یا متولیانِ مساجد بھی غیر احق کو مقدم کریں تو احق اور افضل کو حقِ منع حاصل ہے یا نہیں، باب الجنائز در مختار میں مذکور ہے ثم الولی بترتیب عصوبۃ الانکاح الا الاب فیقدم علی الابن اتفاقا، قال الشامی قولہ فیقدم علی الابن اتفاقا الخ ہو الاصح لان للاب فضیلۃ علیہ وزیادۃ سن والفضیلۃ والزیادۃ تعتبر ترجیحا فی استحقاق الامامۃ کما فی سائر الصلوٰۃ، بحر عن البدائع، بعدازاں در مختار میں یہ مذکور ہے ولہ ای للولی و مثلہ کل من یقدم من باب اولی الاذن لغیرہ فیہا لانہ حقہ فیملک ابطالہ الا انہ ان کان ہناک من یساویہ فلہ ای لذلک المساوی ولو اصغر سنا المنع لمشارکتہ فی الحق، شامی لکھتے ہیں فلو کان شقیقین فالاسن اولی لکن لو قدم احدا فللاصغر منعہ ولو قدم کل منہما واحدا فمن قدمہ الاسن اولی، بحر، پس جب کہ ان عبارات سے یہ معلوم ہوگیا کہ باب اولیٰ کا حکم باب الامامۃ اور باب الجنائز میں برابر ہے، از روئے استحقاق کے تو اس سے ظاہر تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ متولیانِ مساجد اور قوم اگر کسی غیر اولیٰ کو بموجودگی اولیٰ امام بنادیں تو اَولیٰ شخص کو حقِ منع حاصل ہے، اور کتبِ فقہ میں جو اجورہ علی الطاعات متأخرین کے نزدیک مجوز ہے وہ بشرطِ ضرورت ہے، چنانچہ یہ امر مصرح ہے کہ اہداء ثواب کے لئے قراءۃ قرآن اجورہ پر ناجائز قرار دیا گیا ہے، بوجہ اس کے کہ اس کو ایک امرِ غیر ضروری مانا ہے، نیز کتاب الفرائض باب الرد میں یہ امر مصرح ہے کہ رد علی الزوجین بموجودگی دیگر ورثاء ناجائز ہے، البتہ اگر ماسوا زوجین کے کوئی اور وارث نہ ہو تو ان پر رَد صحیح ہے، پس یہ صورتیں مقتضی اس امر کی ہیں کہ بے ضرورت اجورہ پر امام مقرر کرنا بھی ناجائز ہے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ بموجودگی اَولیٰ و افضل غیر اَولیٰ کو ہمیشہ کے لئے امام مقرر کیا جاوے، بینوا توجروا؟

الجواب، قال فی الدر والاحق بالامامۃ تقدیما بل نصبا مجمع الانہر الاعلم باحکام الصلوٰۃ اھ قال الشامی قولہ تقدیما ای علی من حضر معہ قولہ بل نصبا ای للامام الراتب وفی الدر ایضا ولو قدموا غیر الاولی اساءوا بلا اثم وفی رد المحتار قال فی التتارخانیۃ ولو ان رجلین فی الفقہ والصلاح سواء الا ان احدہما اقرأ فقدم القوم الآخر فقد اساءوا وترکوا السنۃ ولکن

لا یاثمون لانهم قد موا رجلا صالحا وکذا الحکم فی الامارۃ والحکومۃ اما الخلافۃ وهی الامامۃ الکبری فلا یجوز ان یترکوا الافضل وعلیه اجماع الامۃ اھ فافهم وفی الدر ایضا واعلم ان صاحب البیت ومثله امام المسجد الراتب اولی بالامامۃ من غیرہ مطلقا وقال الشامی ای تقدیمه ان کان غیرہ من الحاضرین هو اعلم واقرأ منه الخ (ص ۵۸۳ ج ۱) وفی الدر ایضا وکذا تکرہ خلف امرد الی ان قال ومن ام باجرۃ، قال الشامی بان استوجر لیصلی اماما سنۃ او شهرا بکذا ولیس منه ما شرطه الواقف علیه فانه صدقۃ ومعونۃ له رحمتی ای یشبه الصدقۃ ویشبه الاجرۃ کما سیاتی انشاء اللہ تعالی فی الوقف علی ان المفتی به مذهب المتاخرین من جواز الاستیجار علی تعلیم القرآن والامامۃ والاذان للضرورۃ اھ (ص ۵۸۷ ج ۱) وفی الدر ایضا طالب التولیۃ لا یولی الا المشروط له النظر لانه مولی فیرید التنفیذ وفیه ایضا ثم اذا مات المشروط له بعد موت الواقف ولم یوص لاحد فولایۃ النصب للقاضی اذ لا ولایۃ لمستحق الا بتولیۃ اھ (ج ۳، ص ۶۳۵ و ۶۳۶) وفی رد المحتار وفی البیری عن حاوی الحصیری عن وقف الانصاری فان لم یکن من یتولی من جیران الواقف وقرابته الا برزق و یفعل واحد من غیرهم بلا رزق فذلک الی القاضی ینظر فیما هو الاصلح لاهل الوقف اھ وفیه ایضا من الاشباہ اذا ولی السلطان مدرسا لیس باهل لم تصح تولیتہ لان فعله مقید بالمصلحۃ خصوصا ان کان المقرر عن مدرس اهل فان الاهل لم ینعزل وصرح البزازی فی الصلح بان السلطان اذا اعطی غیر المستحق فقد ظلم مرتین بمنع المستحق واعطاء غیر المستحق اھ (ص ۵۹۷ ج ۳)

ان عبارتوں سے امور ذیل مستفاد ہوئے (۱) سنت یہ ہے کہ احق بالامامۃ کو امام مقرر کیا جاوے، (۲) اگر متولیانِ مسجد غیر احق کو مقرر کریں تو اس کی دو صورتیں ہیں یا اگر وہ امامت کا اہل بھی نہیں مثلاً مسائل صلوٰۃ سے جاہل ہے، یا قرآنِ قدر صلوٰۃ جواز پڑھنے سے عاجز ہے یا فاسق ہے، تب تو متولیوں کے امام بنانے سے وہ امام ہی نہ ہوگا، اور اگر متولی اس کو تنخواہ مسجد کی آمدنی سے دیں گے تو ظالم و گنہگار رہوں گے، اور اگر

اہل ہے گو احق نہ ہو تو اس کا امام مقرر کرنا خلاف سنت ہے مگر متولیان کو گناہ نہ ہوگا، (۳) جب کوئی شخص امام راتب مقرر ہوجائے بشرطیکہ وہ نااہل نہ ہو تو پھر وہی احق بالامامت ہے گو اس کے پیچھے اس سے افضل واکمل موجود ہوں، (۴) مستحق امامت کو قبل از تقرر بوجہ اپنے علم وفضل وغیرہ کے کسی امام کو امامت سے روکنے کا حق نہیں (۵) جو شخص خود امام بننا چاہتا ہو وہ امامت کا مستحق نہیں، گو کیسا ہی افضل ہو، ہاں اگر اس کے سوا اور کوئی اہل نہ ہو تو وہی مستحق ہے، یا وہ بلا تنخواہ امامت پر راضی ہو اور دوسرے تنخواہ کے بغیر راضی نہیں تو متولیان کو وقف کی مصلحت پر نظر کرنا چاہیئے، اور جو مناسب ہو اس کو امام مقرر کرنا چاہیئے، اگر بلا تنخواہ امامت کرنے والا ویسے ہی پابندی کرسکے جتنی تنخواہ والا کرتا ہے، اور وہ احق بالامامت بھی ہو اور اکثر نمازی اس کو پسند بھی کرتے ہوں، تو تنخواہ دار کا ایسی حالت میں رکھنا وقف کی مصلحت کے خلاف ہے (۶) اگر واقف نے وقفِ مسجد میں امام کی تنخواہ مشروط کردی ہو تو وہ اجرت نہیں بلکہ وہ اعانت وامداد ہے، جو اتفاقاً جائز ہے، اور مشروط نہ کی ہو تو وہ اجرت ہے جو متأخرین کے نزدیک جائز ہے، واللہ اعلم، ۲۲ صفر ۱۳۴۱ھ

امامت کے لئے عمامہ باندھنا سوال (۱۲)

آیا عمامہ باندھنا فعل رسول اللہ ﷺ ہے، اور ہمیشہ یا گاہ بگاہ، کیا آپ ہمیشہ نماز عمامہ سے پڑھاتے تھے، یا کبھی بلا عمامہ بھی نماز پڑھایا ہے، اگر کوئی پیش امام کبھی بلا عمامہ نماز پڑھاوے تو وہ تارکِ سنت کہا جائے گا، یا اس کا ثواب کم ہوجائے گا یا کیا بحوالہ کتب احادیث صحیحہ ارشاد فرمائے گا، اور شرح سفر السعادت بمقابلہ کتب احادیث صحیحہ کیا امر رکھتی ہے، بینوا توجروا،

الجواب: عمامہ باندھنا نماز اور غیر حالتِ نماز دونوں میں سنت ہے، امام کے لئے بھی اور مقتدی کے لئے بھی، لیکن بدون عمامہ کے بھی نماز پڑھنا جائز ہے، اس سے نماز میں کچھ کراہت نہیں ہوتی، بلکہ جہاں عمامہ کو نماز کے لئے لوگ ضروری سمجھتے ہوں وہاں امام کو اصلاح عقیدۂ عوام کے لئے گاہے گاہے عمامہ کا ترک کردینا افضل ہوگا قال العلامۃ المحدث عبد الرؤف المناوی فی شرح الشمائل للترمذی مانصہ والعمامۃ سنۃ لاسیما للصلوٰۃ وبقصد التجمل لاخبار کثیرۃ فیہا واشتداد ضعف کثیر فیہا یجبرہ کثرۃ طرقہا وزعم وضع اکثرھا

تساهل وتحصل السنة بكونها على الرأس او القلنسوة تحتها الى ان قال ولابأس بلبس القلنسوة اللاصقة بالرأس والمرتفعة المضربة وغيرها تحت العمامة وبلاعمامة لان ذلك كله جاء عن المصطفى صلى الله عليه وسلم وبذلك ابين بعضهم ما اعتيد فى بعض الاقطار من ترك العمامة من اصلها وتمييز علمائهم بطيلسان على قلنسوة بيضاء ولكن الافضل العمامة اه وقال العلامة القارى فى شرح الشمائل ايضا ولابى داؤد والمصنف فرق ما بيننا وبين المشركين العمائم على القلانس قال المصنف غريب وليس اسناده بالقائم اه ص ۱۶۵ و ۱۶۶ ج ۱ ، وفى زاد المعاد لابن القيم وكانت له صلى الله عليه وسلم عمامة تسمى السحاب كساها عليا وكان يلبسها ويلبس تحتها القلنسوة وكان يلبس القلنسوة بغير عمامة ويلبس العمامة بغير قلنسوة وكان اذا اعتم ارخى عمامته بين كتفيه اه ص ۳۴ ج ۱ ، قلت وهذا عام للصلوة ولغيرها ، والله اعلم ، ۱۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۱ھ

امام اعظمؒ کو برا بھلا کہنے والے کے پیچھے نماز کا حکم ،

سوال (۱۳۱) بعد تھوڑے عرصہ کے جناب حافظ صاحب مسجد میں نماز مغرب کے قبل تشریف لاکر مصلّیوں سے کہنے لگے کہ دیکھئے دیکھئے صاحبو اس کتاب نام لامعلوم میں لکھا ہے ، کیا لکھا ہے مسئلہ مردود امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک زنا کی خرچی حلال عینی کی شرح میں موجود ہے ، بس مصلّیوں میں سے ایک شخص بول اٹھا کہ جناب حافظ صاحب آپ شاید امام صاحب کے حالات سے واقف نہیں ، امام صاحب وہی ہیں کہ ایک وضو سے چالیس برس تک نماز فجر کی پڑھی ، تو حافظ صاحب نے جواب دیا کہ امام صاحب نے بدعت کیا ، تو اسی مصلّی نے کہا کہ او نماز یو دیکھو اعتقاد حافظ صاحب کا معلوم ہوگیا اور ان کے پیچھے نماز ہرگز نہ ہوگی ، کیونکہ اس روز بالا ئمہ کو ید وڑی بنایا ، اور آج امام صاحب کو زنا کی تہمت لگایا اور بدعتی بنایا ، افسوس ! جناب حافظ صاحب آپ اگر جماعت مسلمان علم والوں میں ہوتے تو اس گفتگو پر جماعت سے گوشمالی دے کر نکال دیئے جاتے اور امام بننے کے لائق نہ رہتے ، اور دیکھو بھائیو میں اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا ، اور اگر جماعت ہوتی رہے گی تو وارکعوا مع الراکعین کے خیال سے جماعت میں شریک ہوکر نماز اپنی دُہرالوں گا ، چونکہ حافظ صاحب اس محلہ کے امام ہیں ، خلاصہ

یہ ہے کہ اظہارِ حق ہو اس شخص کا کلام ارقام سے باہر ہے، ایسے کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں، اور ایسے اعتقاد والے کو کیا کہنا چاہئے، صاف صاف مدلل تحریر ہو؟

الجواب: جس نے امام اعظم کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کئے وہ خود مردود ہے، اس کے پیچھے نماز درست نہیں مسلمانوں کو کوئی اور امام صالح حنفی متقی تلاش کرنا چاہئے، واللہ اعلم ۱۴ر رجب ۱۳۴۱ھ

امام اگر ایک سجدہ کرکے بیٹھ جائے الخ

سوال (۱۴) امام نے دوسری رکعت میں ایک سجدہ کرکے بیٹھ گیا تو اب لقمہ کس طرح دیوے، کہ امام کو معلوم ہوجاوے کہ میں دوسرا سجدہ بھول گیا،

الجواب: جب امام ایک سجدہ کرکے بیٹھ جاوے تو مقتدی سبحان اللہ کہدیں اس سے امام کو یاد آجاوے گا کہ مجھ سے کچھ رہ گیا ہے،

صفوں کا قبلہ کی جانب سے ٹیڑھا بچھانا،

سوال (۱۵) مسجد کا پیش امام مسجد میں صفیں غیر رخ بچھاتا ہے اگر کوئی مقتدی صف کو درست کرتا ہے تو خفا ہوتا ہے، اور کہتا ہے کہ صفیں درست ہیں، مگر صفیں بالکل ٹیڑھی ہوتی ہیں جس کا خاکہ یہ ہے قبلہ صحیح صف مسجد اس حالت میں نماز میں کراہیت تو نہیں ہوگی،

الجواب: صورتِ مذکورہ میں نماز تو سب کی ہوجاتی ہے، مگر امام کا بلا وجہ صفیں ٹیڑھی بچھانا اور اس پر اصرار کرنا موجبِ نقصانِ صلوٰۃ ہے، اور باعثِ تشویشِ قوم لہذا اس کو اس لغو حرکت سے احتراز کرنا چاہئے، قال فی الخلاصۃ فی القبلۃ المختار انہ ینظر الی غروب الشمس فی اقصر یوم فی الشتاء، والی الغروب فی اطول یوم فی الصیف فیجعل ثلثی ذلک عن یمینہ والثلث عن یسارہ ویصلی فیما بین ذلک، ص ۷۰، ج ۱، ۲۲ر رمضان ۱۳۴۱ھ

اعرج کے لئے صف اول میں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے،

سوال (۱۶) لنگڑا آدمی جو کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھ سکتا، وہ بیٹھ کر اپنی نماز پڑھتا ہے، اس کو جماعت میں صف اول میں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جائز ہے، واللہ اعلم ۱۱ر شعبان ۱۳۴۲ھ

دو منزلہ مسجد میں اوپر نیچے ایک جماعت کرنے کا حکم،

سوال (۱۷) دو منزلہ مسجدوں میں امام کے سامنے اوپر کو کھلا ہونا (جیسا کہ دیکھا جاتا ہے) ضروری ہے یا بغیر اس کے بھی بیک

جماعت دونوں منزلوں میں نماز جائز ہے ؟

الجواب ؛ جب مسجد کی منزل اسفل نمازیوں سے بھر جاوے تو اوپر کی منزل میں کھڑے ہو کر مقتدی جماعت میں شریک کر سکتے ہیں بشرطیکہ امام سے آگے نہ بڑھیں، اور امام کے افعال کی اطلاع ہوتی رہے، امام کے سامنے اوپر کا حصہ کھلا ہونا شرط نہیں، البتہ اس سے اطلاع احوالِ امام میں سہولت ہوتی ہے، واللہ اعلم، ۲۴ر شعبان ۴۲ھ

سوال (۱۸) .... طاق اور محراب میں امام کا کھڑا ہونا

مسجد کی کمانوں میں اور مسجد کے دونوں ستونوں کے درمیان میں امام کو کھڑا ہو کر نماز پڑھانا جائز ہے یا نہ، اگر امام کمان سے ذرا ہٹ کر پیچھے کھڑا ہو تو پیچھے کی صف والے کو سجدہ کی جگہ نہیں رہتی، لہذا امام عین کمان میں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں، فقط بینوا توجروا،

الجواب ، کمانوں اور ستونوں میں بتمامہ امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے، لیکن اگر جگہ تنگ ہو تو کراہت باقی نہ رہے گی، قال فی مراقی الفلاح ویکرہ قیام الامام بجملتہ فی المحراب لاقیامہ خارجہ وسجودہ فیہ والکراہۃ لاشتباہ الحال علی القوم واذا ضاق المکان فلاکراہۃ اھ (ص ۲۱۱) ۲۵ر شعبان ۴۲ھ

سوال (۱۹) .... بیٹھ کر امامت کرانے والے اعرج کے پیچھے نماز کا حکم

.... قصبہ مراد نگر میں ایک مسجد کے پیش امام ہیں جو کبھی اپنی ٹانگوں سے مجبوری کی حالت میں تھا، لیکن وقتی اور جمعہ کی نماز کھڑے ہو کر بدقت تمام ادا کرتا تھا، اب معذوری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا، اور بیٹھ کر وقتی اور جمعہ کی نمازوں کی امامت ادا کرتا ہے، ایسی حالت میں نماز جمعہ خصوصاً اور وقتی نماز عموماً اس کے پیچھے جائز ہیں یا نہیں، جواب سے مشرح طور پر آگاہی بخشی جاوے ؟

الجواب ، قال فی الدر وکذا تکرہ خلف امرد وسفیہ ومفلوج وابرص شاع برصہ اھ قال الشامی وکذلک اعرج یقوم ببعض قدمہ فالاقتداء بغیرہ اولی والظاہر ان العلۃ النفرۃ ولذا قید الابرص بالشیوع لیکون ظاہرا ولعدم امکان اکمال الطہارۃ ایضا فی المفلوج وغیرہ اھ (ص ۵۸۷، ۱۲ ملخصا) صورتِ مسئولہ میں اگر امام مذکور کے برابر یا اس سے زیادہ علم و قراءت والا کوئی دوسرا امام مل سکے تو اس کی اقتداء افضل ہے، اور اس صورت میں امام اعرج کی اقتداء

مکروہ ہوگی، اور اگر کوئی اس جیسا نہ مل سکے تو اسی امام کے پیچھے نماز بلا کراہت درست ہوگی
واللہ اعلم۔ ۱۹ ذیقعدہ ۴۲ھ

امام کے بدعتی ہونے پر مسجد کی جماعت ترک کرنے اور گھر میں جماعت کرنے کا حکم،

سوال (۲۰) واضح ضمیر منیر ہو کہ کسی جا میں بعض اشخاص نے تمام بدعات مروجہ فی زماننا کو اعتصاما بالکتاب والسنۃ دفعتہ چھوڑ دیا، اور اپنی اموات وغیرہ میں کتب فقہ کی ہدایات کے مطابق عامل بن گئے۔ اور کسی کے بُرا بھلا کہنے کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے، اور فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کو پسند کیا، تو مبتدع امام کا مسئلہ معلوم کرنے پر اُن کو خیال ہوا کہ ہم اہل سنت بدعتیوں کے پیچھے کیوں پڑھیں، ہم اپنی جماعت الگ قائم کر سکتے ہیں، اور چونکہ ہماری جماعت کے آدمی بیس پچیس کی تعداد سے متجاوز ہیں، مگر باوجود ایں ہمہ مساجد کے اماموں کو بسبب مبتدعین کے غلبہ کے معزول و برطرف نہیں کر سکتے، اب یا تو تارکِ جماعت ہو کر فرادی فرادی نمازیں مسجدوں میں پڑھا کریں، یا کسی مکان مثل گھیرلہ وغیرہ کے محلہ میں اپنی جماعت کے لوگوں کو جمع کر کے بجماعت اپنی نمازیں پڑھا کریں، پس اُن لوگوں نے اس صورت ثانی کو اختیار کر کے محلہ کی مسجد کے قریب ایک وسیع گھیرلہ میں اپنی جماعت قائم کر لی ہے، تو کیا یہ جماعت قائم کر لینا ان کا جائز بلا کراہت کے ہوگا یا مکروہ ہے، کیونکہ مسجد میں نماز پڑھنے کی صورت یہ ہے کہ فرادی فرادی پڑھیں، اس میں تو ہمیشہ کے لئے تارکِ جماعت بنتے ہیں، اور مبتدع کے پیچھے مکروہ ہے، اور وہاں یعنی اس گھیرلہ میں اپنی جماعت مستقل ہوتی ہے، چونکہ مسجد میں فتنہ و فساد کے عذر سے جماعت نہیں قائم کر سکتے۔ اور اس مکان میں کوئی مانع نہیں ہے، تو یہ مذکور لوگ تمام یا اکثر اپنی جماعت جو کرتے ہیں اس میں ان کا یہ عذر شرعی عذر ہے یا نہیں، اگر ہے تو کیا ان کی نماز بسبب اس عذر کے مسجد کے جماعت کے برابر فضیلت رکھے گی یا نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری کے باب الجہاد میں یہ حدیث ہے کہ اذا مرض العبد او سافر کتب لہ مثل ما کان یعمل مقیما صحیحاً، اس سے تو فضیلت مسجد کے برابر ہی سمجھی جاتی ہے، اور ہدایہ کی اس حدیث (صلوٰۃ القاعد علی النصف من صلوٰۃ القائم) کے تحت میں صاحب کفایہ لکھتے ہیں وصلوٰۃ المعذور لیست علی النصف بل ہو مثل صلوٰۃ القائم، اور اس سے عذر کو پورا دخل معلوم ہوتا ہے، اور اسی بناء پر وہ لوگ اپنی جماعت اُس گھیرلہ میں قائم کرتے ہیں، پس جو امر مفتی بہ ہو اس سے مطلع فرمائیں،

الجواب: قال فی البحر وذکر فی غایۃ البیان معزیا الی الاجناس ان
تارک الجماعۃ یستوجب اساءۃ ولا تقبل شہادتہ اذا ترکہا استخفافا
بذلک ومجانۃ اما اذا ترکہا سہوا او ترکہا بتاویل بان یکون الامام من
اہل الاہواء او مخالفا لمذہب المقتدی لایراعی مذہبہ فلا یستوجب
الاساءۃ وتقبل شہادتہ اھ (ص ۳۴۵ ج ۱) وفیہ ایضا وذکر الشارح
وغیرہ ان الفاسق اذا تعذر منعہ یصلی الجمعۃ خلفہ وفی غیرہا ینتقل
الی مسجد اٰخر وعلل لہ فی المعراج بان فی غیر الجمعۃ یجد اماما غیرہ
فقال فی فتح القدیر وعلی ہذا فیکرہ الاقتداء بہ فی الجمعۃ اذا تعددت
اقامتہا فی المصر علی قول محمدؒ وہو المفتی بہ لانہ بسبیل من التحول
حینئذ اھ (ص ۳۴۹ ج ۱) وفی تعلیق البحر لابن عابدین عن القنیۃ اختلف
العلماء فی اقامتہا فی البیت والاصح انہا کاقامتہا فی المسجد الا فی الفضیلۃ
وہو ظاہر مذہب الشافعی اھ (ص ۳۴۵ ج ۱) عبارت اولیٰ سے بدعتِ امام مسقط
جماعت معلوم ہوتا ہے، اور عبارتِ ثانیہ سے وجوب تحول بجانب امامِ دیگر مفہوم ہوتا ہے
اور عبارت ثالثہ سے جماعتِ خانہ کا حکم مثل جماعتِ مسجد معلوم ہوتا ہے، صرف فضیلت
کا فرق ہے، پس اگر عذر بدعتِ امام کی وجہ سے گھر میں جماعت اہلِ سنت کے ساتھ نماز
پڑھی جاوے تو عبارات مذکورہ سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، رہا یہ کہ اس صورت میں جماعت
بیت سے مسجد کی فضیلت حاصل ہوگی یا نہیں اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ
مراقی الفلاح میں کہا ہے واذا انقطع عن الجماعۃ لعذر من اعذارہا المبیحۃ
للتخلف وکانت نیتہ حضورہا لولا العذر الحاصل یحصل لہ ثوابہا لقولہ
صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ ما نوی اھ
(ص ۱۷۴) اور اوپر بدعتِ امام کا عذر ہونا معلوم ہوچکا ہے، ان مقدمات سے مستنبط ہوسکتا
ہے کہ اس صورت میں مسجد کی فضیلت بھی حاصل ہوجاوے گی، واللہ اعلم، لیکن اس پر
خدشہ یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ نے حجاج وغیرہ کے پیچھے جماعت ترک نہیں کی، حالانکہ وہ
بھی اپنے کسی گھر میں الگ جماعت کرسکتے تھے، اگر یہ افضل ہوتا تو صحابہ ضرور ایسا کرتے،
ہاں یہ ممکن ہو کہ انھوں نے خوف کی وجہ سے تخلف جماعت نہ کیا ہو، فقط ۱۹ ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ

تجوید سے قرآن مجید پڑھنے والے کی غیر مجوّد کے پیچھے نماز کا حکم،

سوال (۲۱) .... اگر کوئی بڑا عالم نماز میں حا کی جگہ ہا، یا عین کی جگہ الف اور ضاد کو دال پڑھے تو جو کوئی عالم نہیں لیکن قرآن صحیح پڑھتا ہے اس کی اقتدا اس عالم کے ساتھ کرنا جائز ہے یا نہیں، بر تقدیر اوّل پھر نماز کا اعادہ کرنا چاہیئے یا نہیں؟

الجواب، اگر یہ عالم اپنی قدرت کے موافق تصحیح حروف میں سعی کر چکا پھر بھی صحیح پڑھنے پر قادر نہیں ہوا، یا اس کی زبان میں علت ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح پڑھنے سے معذور رہے، ان دو صورتوں میں صحیح پڑھنے والے کی نماز اس کے پیچھے درست ہو جائے گی، اور اگر اس نے سعی نہیں کی، نہ اس کی زبان میں علت ہے، تو اس کے پیچھے صحیح قرآن پڑھنے والے کی نماز درست نہیں، اس صورت میں اس نماز کا اعادہ واجب ہے، جو اس کے پیچھے پڑھی گئی ہو، واللہ اعلم، ۲۲ ذی الحجہ ۴۲ھ

صحیح خواں کی غلط خواں کے امام کے پیچھے نماز کا حکم،

سوال (۲۲) اگر محلہ کی مسجد کا امام قرآت میں ایسی غلطیاں کرتا ہو کہ بجائے معروف صیغوں کے مجہول اور بجائے مجہول کے معروف اور بجائے صاد کے سین پڑھتا ہو تو اس صورت میں وہ شخص جو قرآن صحیح پڑھتے ہوں محلہ کی مسجد کے خیال سے اسی مسجد میں اسی امام کے پیچھے نماز پڑھیں یا دوسری جگہ؟

الجواب، غلط خواں امام کے پیچھے صحیح قرآن پڑھنے والے کی نماز بعض صورتوں میں فاسد ہو جاتی ہے، اس لئے بہتر تو یہ ہے کہ اگر فساد نہ ہو تو غلط خواں امام کو امامت سے الگ کر کے صحیح خواں امام مقرر کیا جائے، اگر اس میں فتنہ کا احتمال ہو تو صحیح قرآن پڑھنے والے غلط خواں کی اقتدار نہ کریں، بلکہ مسجد محلہ کو چھوڑ کر کسی صحیح خواں امام کی اقتدار کریں، واللہ اعلم، ۲۲ ذی الحجہ ۴۲ھ

اعرج کی امامت مکروہ کا بیان اور اس کی تفصیل،

سوال (۲۳) .... زید کے عذر کی وجہ سے چلتے وقت بایاں قدم ذرا دبا کر چلتا ہے، اور نماز میں سجدہ اور قعدہ اولیٰ سے اٹھتے وقت دایاں قدم تقریباً ایک بالشت آگے بڑھ جاتا ہے، ایسے حالت میں شخص مذکور فقہائے حنفیہ کے نزدیک اعرج کے حکم میں داخل ہے یا نہیں، اور درمختار کی عبارت (ولوام قوما وہم لہ کارہون ان الکراہۃ لفساد فیہ اولانہم احق بالامامۃ منہ کرہ لہ ذلک تحریما لحدیث ابی داؤد الخ) کی رُو سے کیا شخص مذکور کی امامت مکروہ تحریمی ہوگی؟ جبکہ شخص مذکور بحالتِ قیام دونوں قدم پر کھڑا ہوتا ہو، اور بااین ہمہ خود بھی امامت

سے گریز کرتا ہو معتبر اور صاحبِ فہم اصحاب ان کے اعلم اور اقرء ہونے کی وجہ سے جبراً امام بناتے ہیں، اور یہاں فسادِ خَلقی اور خُلقی دونوں مراد ہیں یا صرف فسادِ خُلقی مثل فسق و فجور وغیرہ کے مراد ہے، اور اگر فسادِ عام مراد ہے تو صورتِ حاضرہ اس میں داخل ہے یا نہیں، اور اگر داخل بھی ہو تو صورتِ واقعہ اس طرح ہونے پر کہ اوّل کسی ذاتی کاوش کی وجہ سے ایک شخص شخصِ مذکور سے ناراض ہو کر اس کی امامت سے مُنہ موڑتا ہے، پانچ چھ روز کے بعد ایک شخص کو اپنا ہم خیال بنا کر مسجد اور جماعت سے علیحدہ کرتا ہے، پھر بعد ایک ماہ کے ایک تیسرے شخص کو مع اس کے اتباع کے مسجد اور جماعت معہودہ سے علیحدہ کر کے طرح طرح کے فساد برپا کرتا ہے، اور اعرجیت کی صورت کو آڑ بنا کر اس سے اپنے فساد میں امداد لیتا ہے، ایسی حالت میں کیا ان علیحدہ شدہ بعض قوم کی نفرت شرعاً مقبول ہوگی یا نہیں، بحوالہ کتاب بیان فرما کر ثواب دارین حاصل کریں،

الجواب ؛ قال فی الدر وکذا تکرہ خلف امرد وسفیہ ومفلوج وابرص شاع برصہ اھ، قال الشامی وکذلک اعرج یقوم ببعض قدمہ فالاقتداء بغیرہ اولیٰ الیٰ ان قال والظاہر ان العلۃ النفرۃ اھ وفی الدر ایضاً ھذا ان وجد غیرھم ای من ھو احق بالامامۃ منھم ۱۲ شامی، والا فلا کراھۃ بحر بحثاً قال الشامی وقد علمت انہ موافق للمنقول عن الاختیار وغیرہ ۱۲) اھ (ص ۵۸۷ ج ۱)

چونکہ اعرج میں یقوم ببعض قدمہ کی قید لگائی گئی ہے، اور قیود فقہیہ احترازی ہوتی ہیں اس لئے معلوم ہوا کہ جو شخص دونوں پیروں پر بخوبی کھڑا ہوتا ہے وہ اس اعرج میں داخل نہیں جس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، کیونکہ عرج قلیل موجبِ نفرت نہیں ہوتا، پھر جس اعرج کے پیچھے نماز مکروہ بھی ہے تو کراہت اس وقت ہے جبکہ مقتدیوں میں اس سے افضل موجود ہو اور اگر اس سے علم و قرأت میں افضل کوئی نہ ہو تو اعرج کامل کے پیچھے نماز میں کچھ کراہت نہیں رہتی اور اس حالت میں لوگوں کی نفرت کا کچھ اعتبار نہیں کیا جائے گا، قال فی البحر قید کراھۃ امامۃ الاعمیٰ فی المحیط وغیرہ بان لا یکون افضل القوم فان کان افضل فھو اولیٰ الیٰ ان قال ولعل وجھہ ان تنفر الجماعۃ بتقدیمہ یزول اذا کان افضل من غیرہ بل التنفیر یکون فی تقدیم غیرہ اھ (ص ۵۸۵ ج ۱)

پس بصورت مذکورہ اس اعرج کے پیچھے نماز بلاکراہت درست ہے، اور نفرتِ قوم کا اعتبار

نہیں خصوصاً جبکہ اس نفرت کا منشاء ذاتی عداوت ہو جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے۔
ہذا واللہ اعلم بالصواب، ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

اس شخص کی امامت کا حکم جس کی بیوی اعزہ سے ملاقات کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہو

سوال (۲۴) بکر ایک امام مسجد ہے، اور ایک چھوٹے موضع کا رہنے والا ہے، اور اکثر بکر کی زوجہ اپنے عزیز واقارب سے بغرض ملاقات ایک چادر اوڑھ کر چلی جاتی ہے، اور عام طور سے کسی جگہ نہیں آتی جاتی، جیسا کہ عام زمینداران کی مستورات کھیت وغیرہ میں کھلے منہ روٹی وغیرہ لے کر جاتی ہیں اور دن میں بہت کم ادھر اُدھر آتی جاتی ہے، بلکہ اکثر رات کو چلی جاتی ہے بکر کی امامت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں بکر کی امامت درست ہے، لیکن یہ لازم ہے کہ بکر اپنی زوجہ کو تاکید کرے کہ جب اعزہ واقارب سے ملنے جایا کرے تو چادر سے سارا بدن خوب چھپا کر جایا کرے، ۵ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

عورتوں کی تنہا جماعت کا حکم

سوال (۲۵) ....

پردہ نشین لکھی پڑھی عورت نماز عیدین اور نماز جمعہ اپنے گھر میں صرف عورتوں ہی عورتوں کی امام بن کر پڑھا سکتی ہے؟ اگر نماز جمعہ نہیں پڑھا سکتی تو کیا عیدین کی نماز پڑھانے کی اجازت ہے، اور کچھ کراہت تو نہیں؟ اگر باجماعت نہیں تو عیدین میں عورتیں ایک گھر میں جمع ہو کر علیحدہ علیحدہ اپنی دو رکعت پڑھ سکتی ہیں، اور کیا روایات ذیل سے جماعتِ نساء کی اباحت پر استدلال صحیح ہے؟ خاص کر عیدین کی جماعتِ نساء پر، مفصل جواب تمام شبہات کو دفع فرماتے ہوئے دستخطِ خاص سے مزین فرمادیں،

روایات یہ ہیں، سنن ابو داؤد میں حدیث طویل میں مروی ہے وکانت ای ام ورقۃ قد قرأت القرآن فاستاذنت النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان تتخذ فی دارھا مؤذنا فاذن لھا وامرھا ان تؤم اھل دارھا،

کتاب الآثار محمد بن الحسن میں ہے اخبرنا ابو حنیفۃ نا حماد عن ابراھیم عن عائشۃ انھا کانت تؤم النساء فی شھر رمضان فتقوم وسطھن،

تخریج رافعی میں ہے اخرج ابن ابی شیبۃ ثم الحاکم من طریق ابن ابی لیلی عن عطاء عن عائشۃ انھا کانت تؤم النساء فتقوم معھن فی الصف،

واخرج الشافعی وابن ابی شیبۃ وعبد الرزاق عن ام سلمۃ انھا کانت امّت النساء فقامت وسطھن، اور مستدرک میں یہ ہے ان عائشۃ کانت تؤذن وتقیم وتؤم النساء فتقوم وسطھن، بعض میں مطلق امامت کا ذکر ہے، اور بعضوں میں مقید برمضان، نیز کارہین جماعت ان روایات کا کیا جواب دیتے ہیں،

الجواب: اخرج الھیثمی فی مجمع الزوائد عن عائشۃ رض ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لاخیر فی جماعۃ النساء الا فی المسجد او فی جنازۃ قتیل رواہ احمد والطبرانی فی الاوسط الا انہ قال لاخیر فی جماعۃ النساء الا فی المسجد جماعۃ وفیہ ابن لھیعۃ وفیہ کلام اھ (ص ۱۵۵ ج ۱) قلت قد حسن لہ الترمذی واحتج بہ غیر واحد کما فیہ ایضا (ص ۱۲۶ وص ۵ ج ۲) ولا یخفی ان جماعۃ النساء فی مسجد الجماعۃ لا تکون الا مع الرجال فمعنی الحدیث لاخیر فی جماعۃ النساء الا مع الرجال فعلم ان جماعۃ النساء وحدھن مکروھۃ لنفیہ صلی اللہ علیہ وسلم الخیریۃ عنھا، وقد اجمعت الامۃ علی کراھۃ خروج النساء الی مسجد الجماعۃ ایضا ولو خرجن فلم یجوز احد من الائمۃ ان یجمعن وحدھن بل لابد لھن من الصلوٰۃ خلف الرجال فافھم وکل ما ورد عن عائشۃ وام سلمۃ فی امامتھا النساء فلا یخلو عن مثل لیث بن ابی سلیم وابن ابی لیلی وغیرھما ممن فیہ مقال فلم یکن راجحا علی اثر ابن لھیعۃ ھذا وروایۃ ابراھیم عن عائشۃ منقطعۃ فلا ترجیح لہ ایضا ولا یخفی ترجیح المرفوع علی الموقوف ولم یتبین مخالفۃ عمل الراوی لروایتہ ھل کانت قبل الروایۃ او بعدھا فلا یعل بفعل عائشۃ رض اثرھا المرفوع فافھم والبسط فی الاعلاء (ص ۱۱۴ و ۱۱۵ ج ۲)

روایات مذکورۂ سوال کا جواب تو عبارت عربی میں دیدیا گیا کہ حضرت عائشہؓ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ عورتوں کی جماعت میں خیر نہیں ہے، اسی پر حنفیہ کا عمل ہے، اور اسی سے اُن کے قول کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، پس عورتوں کو باہم جماعت کرنا مکروہ ہے، اور عید کی جماعت تو صرف عورتوں سے منعقد ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ وہ مثل جمعہ کے ہے، جس کے لئے رجال کا وجود شرط ہے، اور اس کے

سوا بجم) اُن کی جماعت مکروہ ہے، اور عید کے دن الگ الگ بھی نماز پڑھنا ایک گھر میں جمع ہو کر مکروہ ہے، کیونکہ اجتماع نساء فتنہ سے خالی نہیں، ہاں ہر عورت اپنے گھر میں بہ نیت نفل جتنی چاہے نماز پڑھے، واللہ اعلم، ۱۹ رجب ۱۳۴۵ھ

امام رکوع میں ہو اور مقتدی تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کرلے تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں

سوال (۲۶) ...... امام رکوع میں ہو تو تحریمہ کہہ کر فوراً مقتدی رکوع کر سکتا ہے یا نہیں، اس کی نماز ایسا کرنے سے ہوگی یا نہیں؟ ایک شخص مسجد میں ایسے وقت آیا کہ امام رکوع میں ہے، اس نے تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کرلی، یعنی تکبیر تحریمہ کہہ کر قیام کچھ نہیں کیا، فوراً جھک گیا تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب: اگر تکبیر تحریمہ بحالتِ قیام کہی ہے یا بحالت انحنا کہی ہے، اگر وہ اقرب الی القیام تھا تو نماز درست ہے، اور اگر بحالت انحنا کہی اور اقرب الی الرکوع تھا تو نماز درست نہیں ہوئی، غرض تکبیر تحریمہ کا بحالتِ قیام یا بحالت اقرب الی القیام ہونا فرض ہے، تکبیر تحریمہ کے بعد مزید قیام فرض نہیں قال فی مراقی الفلاح والثانی من شروط صحۃ التحریمۃ الاتیان بالتحریمۃ قائما او منحنیا قلیلا قبل وجود انحناءہ بما ھو اقرب للرکوع قال فی البرھان لو ادرک الامام راکعا نحنی ظہرہ ثم کبران کان الی القیام اقرب صح الشروع ولو اراد بہ تکبیر الرکوع وتلغو نیتہ لان مدرک الامام فی الرکوع لا یحتاج الی تکبیر مرتین خلافا لبعضھم وان کان الی الرکوع اقرب لا یصح الشروع اھ ص ۱۲۷، ۳ شعبان ۱۳۴۱ھ

جماعتِ ثانیہ

سوال (۲۷) ...... جس مسجد میں امام اور مؤذن مقرر ہے اور اس گاؤں کے تمام آدمی اس مسجد میں اول جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، اس کے بعد اگر دو ہی آدمی پھر جماعت کریں مکروہ تحریمی ہوگا یا نہیں چند کتب معتبرہ کی عبارت نقل فرما کر جواب عنایت فرماویں، بینوا توجروا،

الجواب واللہ المؤفق للصواب: ذکر فی رد المحتار عن المنبع ثم قال فی الاستدلال ولنا انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کان خرج لیصلح بین

عہ قلت اخرجہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط عن ابی بکرۃ ورجالہ ثقات کذا فی مجمع الزوائد (ص ۱۶۱ ج ۲) ظ

قوم فعاد الی المسجد وقد صلیٰ اهل المسجد فرجع الی منزله فجمع اهله و صلیٰ ولو جاز ذلك لما اختار الصلوٰة فی بیته علی الجماعة فی المسجد ولان فی الاطلاق هكذا تقلیل الجماعة معنی فانهم لا یجتمعون اذا علموا انها لا تفوتهم ومقتضی هذا الاستدلال كراهة التكرار فی مسجد المحلة ولو بدون اذان ویؤیده ما فی الظهیریة ولو دخل جماعة المسجد بعد ما صلیٰ فیه اهله یصلون وحدانا وهو ظاهر الروایة اه وهذا مخالف لحكایة الاجماع المارة رهو ما ذكره قبل عن المنبع والتقیید بالمسجد المختصة بالمحلة احتراز من الشارع وبالاذان الثانی احتراز عما اذا صلیٰ فی المسجد المحلة جماعة بغیر اذان حیث یباح اجماعًا اه (ص ۵۲۲ ج ۱)

لبدائع فی بیان ما یفعله بعد فوات الجماعة ما نصه لا خلاف فی انه اذا فاتته الجماعة لا یجب علیه الطلب فی مسجد اخر لكن كیف یصنع ذكر فی الاصل انه اذا فاتته الجماعة فی مسجد حیه فان اتی مسجدا اخر یرجو ادراك الجماعة فیه فحسن وان صلیٰ فی مسجد حیه فحسن لما روی عن الحسن قال كانوا اذا فاتتهم الجماعة فمنهم من یصلی فی مسجد حیه ومنهم من یتبع الجماعة اراد به الصحابة رضی الله عنهم ولان فی كل جانب مراعاة حرمة وترك اخری ففی احد الجانبین مراعاة حرمة مسجده وترك الجماعة وفی الجانب الاخر مراعاة فضیلة الجماعة وترك حق مسجد فاذا تعذر الجمع

؎ اورد علیه بعض الناس نقلًا عن التحریر المختار بقوله ولا یتم الاستدلال به الا اذا وجد جماعة یصلی بهم فی المسجد ومع ہذا اختار الصلوٰة فی منزله باهله اه قلت عدم وجدانه مثل هذه الجماعة بعید لانه صلی الله علیه وسلم لم یكن یذهب للصلح بین الاقوام وحده بل كان یذهب بجماعة من اصحابه كما هو المعروف من عادته ولو سلم تنزلا فكان یمكن ان یجمع الصلوٰة باهله فی المسجد فان النساء كن یشهدن الصلوٰة فیه مع النبی صلی الله علیه وسلم كما عرف فی موضعه فاستدلال به تام ولا یضره الاحتمالات البعیدة ۱۲ ظ ، علی انه قد ثبت عن الصحابة انهم لم یجمعوا فی المسجد ثانیا مع قدرتهم علی ذلك كما سیأتی ،

؎ سیأتی ما یدل له مؤیده ۱۲ منه

بینهما مال الی ایهما شاء وذکر القدوری انه اذا فاتته الجماعة جمع باهله فی منزله وان صلی وحده جاز لما روی عن النبی صلی اللہ علیه وسلم انه خرج من المدینة الی صلح بین حیین من احیاء العرب فانصرف منه وقد فرغ الناس من الصلوٰة فمال الی بیته وجمع باهله فی منزله وفی هذا الحدیث دلیل علی سقوط الطلب اذ لو وجب لکان اولی الناس به رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وذکر الامام السرخسی ان الاولی فی زماننا انه اذا لم یدخل مسجده ان یتتبع الجماعة وان دخل مسجده صلی فیه اھ (ص ۱۵۶ ج ۱)

قلت وهذا یدل علی کراهة الجماعة الثانیة مطلقا ولو بدون اذان لانه حصر صنع فاتت الجماعة فی تتبعها فی مسجد اٰخر ان کان یرجو ادراکها فیه وفی صلوٰته فی مسجد حیه منفردا وعلله بان فی کل جانب مراعاة حرمة وترک اخریٰ فاذا تعذر الجمع بینهما مال الی ایهما شاء فلو کانت الجماعة الثانیة بدون الاذان غیر مکروهة لانتفی ذلک التعذر بان یجمع ثانیا فی مسجد حیه کما لا یخفی فالظاهر ان المذهب عندنا وظاهر الروایة هو الکراهة مطلقا ولو بدون اذان فان صاحب البدائع والقدوری والسرخسی اعرف الناس بالمذهب من غیرهم وتقییدها بالاذان لعلها فی النوادر قال الشعرانی فی رحمة الامة ومن دخل مسجدا فوجد امامه قد فرغ من الصلوٰة فان کان المسجد فی غیر ممر الناس کره له ان یستانف فیه جماعة عند ابی حنیفةؒ ومالکؒ والشافعیؒ وقال احمدؒ لا یکره اھ (ص ۳۴) والدلائل ایضا تقتضی الکراهة مطلقا منها ما قدمر ذکره ومنها ما رواه سحنونؒ عن ابن القاسم عن مالک عن عبد الرحمٰن بن المجبر قال دخلت مع سالم بن عبد اللہ مسجد الجحفة وقد فرغوا من الصلوٰة فقالوا الا تجمع الصلوٰة فقال سالم لا تجمع صلوٰة واحدة فی مسجد واحد مرتین رجاله کلهم ثقات قال ابن وهب واخبرنی رجال من اهل العلم عن ابن شهاب ویحیٰی بن سعید وربیعة واللیث مثله اھ من المدونة الکبریٰ لمالک (ص ۸۹ ج ۱) فهؤلاء اکابر التابعین کرهوا الجماعة الثانیة

فی مسجد واحد ولم یقیدوها بالاذان وقال الشافعی[عه] وانا قد حفظنا ان قد فاتت رجالا معه صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ فصلوا بعلمہ منفردین وقد کانوا قادرین علی ان یجمعوا وان قد فاتت الصلوٰۃ فی الجماعۃ قوما فجاؤا المسجد فصلی کل واحد منهم منفردا وقد کانوا قادرین علی ان یجمعوا فی المسجد اھ من الام (ص ۱۳۷ ج ۱) قلت فلو کانت الجماعۃ الثانیۃ غیر مکروھۃ بدون الاذان لما ترکها الصحابۃ وهم سابقون الی الغایات راغبون الی افضل الطاعات قال الشافعی رحمہ اللہ وانما کرهت (ای تکرار الجماعۃ فی المسجد ۱۲ منہ) ذلک لهم لانہ لیس مما فعل السلف قبلنا بل قد عاب بعضهم اھ من الام (ص ۱۳۶ ج ۱) قلت وکما لم یفعلہ السلف بالاذان ثانیا فی المسجد کذا لم یفعلوہ فیہ بدون الاذان ایضا ومن ادعی غیر ذلک فلیأت ببرهان قال الشافعی رحمہ اللہ واحسب کراهیۃ من کرہ ذلک منهم انما کان لتفرق الکلمۃ وان یرغب رجل عن الصلوٰۃ خلف امام جماعۃ فیتخلف هو ومن اراد عن المسجد فی وقت الصلوٰۃ فاذا قضیت دخلوا فجمعوا فیکون فی هذا اختلاف وتفرق کلمۃ وفیهما المکروہ وانما اکرہ هذا فی کل مسجد لہ امام ومؤذن فاما مسجد بنی علی ظهر الطریق او ناحیۃ لا یؤذن فیہ مؤذن راتب ولا یکون لہ امام معلوم ویصلی فیہ المار ویستظلون فلا اکرہ ذلک لانہ لیس فیہ معنی الذی وصفت من تفرق الکلمۃ ثم قال وانما کرهوا لئلا یجمعوا فی مسجد مرتین ولا باس بان یخرجوا الی موضع فیجمعوا فیہ اھ من الام (ص ۱۳۶ و ۱۳۷ ج ۱) قلت وهذا کلہ موافق لما ذکرہ اصحابنا غیر انهم عللوا الکراهۃ بتقاعد القوم من الجماعۃ الاولی ولا یخفی ان العلۃ التی ذکرها الشافعی اشد واحذر لانها وقوعا واکثر لاسیما فی زمان الفساد وانقطاع الوداد ومقتضاها کراهۃ التکرار ولو بدون اذان هذا هو الحق الراجح عندی والمراد بالکراهۃ کراهۃ التحریم،

[عه] هذا یؤید ما ذکرہ صاحب البدائع عن الحسن و الامام الشافعی رحمہ اللہ مجتهد امام فی الفقہ والحدیث فتعلیقہ حجۃ ۱۲ منہ.

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ مسجد محلہ میں جس میں امام اور موذن مقرر ہے دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے، خواہ بدون اذان ثانی کے ہو یا مع اذان واقامت کے، دلائل کا مقتضی یہی ہے، اور ظہیریہ اور بدائع وغیرہ سے بھی اطلاق کراہت ہی مستفاد ہوتا ہے، گو بعض فتاویٰ میں بدون اذان ثانی کے جماعت ثانیہ کو مباح لکھا ہے، مگر دلائل پر نظر کرکے یہ قید ضعیف معلوم ہوتی ہے، اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جاوے تو اباحت سے مراد کراہت تحریمیہ کی نفی ہوگی، کراہت تنزیہیہ کی نفی مراد نہیں، کذا قالہ بعض اکابرنا منہم قطب دفتہ مولانا الشیخ رشید احمد قدس سرہ، دوسرے جن روایات میں اطلاق ہے ان کا مقتضی یہ ہے کہ بدون اذان کے بھی کراہت ہے، اور جن میں تقیید ہے، یعنی جن میں بدون اذان کے اجماعاً مباح کہا ہے، اگر امام صاحب سے یہ روایت صحیح ہو تو اُن کا مقتضا اباحت بدون الاذان ہے، اور جب کراہت واباحت میں تعارض ہو تو کراہت کو ترجیح ہوگی، ۱۴ر رمضان ۱۳۴۴ھ

| حکم نماز امام بلا عمامہ | **سوال** (۲۸) امام اگر بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے اور مقتدی عمامہ

باندھے ہوئے ہوں اُن کی نماز ہو جاوے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اگر پیش امام بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے تو جو مقتدی عمامہ باندھے ہوئے ہوں ان کی نماز نہ ہوگی،

الجواب: اگر امام بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے اور مقتدی عمامہ باندھے ہوئے ہوں تو سب کی نماز درست ہے، کسی کی نماز فاسد نہ ہوگی، البتہ امام مالک کے نزدیک امام مسجد کو بغیر چادرہ اوڑھے امامت کرنا مکروہ ہے، لیکن اس کے ترک سے کسی کی نماز فاسد ان کے نزدیک بھی نہیں ہوتی، قال مالك واكره للامام ان يصلي بغير رداء الا ان يكون امام قوم في سفر او رجلا ام قوما في موضع اجتمعوا فيه او في داره فاما... مسجد جماعة او مساجد القبائل... فاكره له ذلك واحب الى ان لو جعل عمامة على عاتقه اذا كان مسافرا او صلّى في داره اهـ (ص ۸۵ ج ۱ مدونہ) قلت والخروج من الخلاف مستحب عندنا ايضا والله اعلم، ۳ر محرم ۱۳۴۵ھ

| ولد الزنا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے | **سوال** (۲۹) ولد الزنا کی امامت مکروہ تحریمی ہوگی یا نہیں؟

الجواب: ولد الزنا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، فی الدر (ص ۵۸۴ ويكره) تنزيها (امامة عبد) الى ان قال (وولد الزنا) هذا ان وجد

غیرهم والا فلا کراهة بحر بحثا وقال الشامی تحت قول الدرر ونحوه الاعشی) لکن ما بحثه فی البحر صرح به فی الاختیار حیث قال ولو عدمت ای علة الکراهة بان کان الاعرابی افضل من الحضری والعبد من الحر وولد الزناء من ولد الرشدة والاعمیٰ من البصیر فالحکم بالضد اھ ونحوه فی شرح الملتقی للبهنسی وشرح درر البحار ولعل وجهه ان تنفیر الجماعة بتقدیمه یزول اذا کان افضل من غیره بل التنفیر یکون فی تقدیم غیره اھ (ص۵۸۵ ج۱)

۲۶ ذیقعدہ سنہ ۴۳ھ

ستونوں کے درمیان صفیں بنانا مکروہ ہے ،

سوال (۳۰) ما تقولون ان مسجداً له اعمدة هل یجوز ان یجعل الصفوف بینها ام لا ؟

الجواب ؛ یکره الصف بین السواری ما لم یضطر الیه لورود النهی عن ذلك ولعل فقهه انتفاء رص الصفوف وهو ما مور به فی قوله صلی الله علیه وسلم تراصوا اخرج ابن ماجة وابن خزیمة والحاکم عن معاویة بن قرة عن ابیه قال کنا ننهی ان نصف بین السواری علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ونطرد عنها طرداً رجاله رجال الصحیح الا هارون بن مسلم وهو حسن الحدیث وثقة ابن حبان وروی الترمذی عن عبد الحمید بن محمود قال صلینا خلف امیر من الامراء فاضطرنا الناس فصلینا بین الساریتین فلما صلینا قال انس بن مالك کنا نتقی هذا علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم قال الترمذی حدیث حسن صحیح (ص۳۱ ج۳) قال العلامة العینی فی شرح البخاری اذا کان منفردا لا بأس فی الصلوٰة بین الساریتین اذا لم یکن فی جماعة وقیل بغیر جماعة لان ذلك یقطع الصفوف وتسویة الصفوف مطلوبة فی الجماعة اھ (ص۴۲۸ ج۲) وفی فتح الباری قال المحب الطبری کره قوم الصف بین السواری للنهی الوارد عن ذلك ومحلها الکراهة عند عدم الضیق والحکمة فیه اما الانقطاع الصف او لانه موضع النعال اھ (ص۴۷۷ ج۱) قلت وقواعدنا لا تاباه لا سیما والعینی من ائمتنا وقد منعه ایضاً والله اعلم ،

مقتدی نابالغ ہوں تو جماعت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

سوال (۳۱) اگر امام کے پیچھے مقتدی نابالغ ہوں تو جماعت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: نابالغ مقتدی اگر سمجھدار ہے تو جماعت صحیح ہے، فی العالمگیریۃ (ص۵۲ ج۱) اذا زاد علی الواحد فی غیر الجمعۃ فھو جماعۃ وان کان معہ صبی عاقل کذا فی السراجیۃ۔

بلا عذر جماعت چھوڑنا گناہ اور اصرار فسق ہے۔

سوال (۳۲) جس مسجد میں پانچ وقت باقاعدہ جماعت ہوتی ہے اسی مسجد میں ایک شخص اکثر پہلے نماز پڑھ لیتا ہے، اور بعض اوقات اذان مسجد میں سنکر نماز پڑھ کر چلا جاتا ہے، اس کی نماز جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب: جماعت سے نماز پڑھنا سنت مؤکدہ قریب واجب ہے، لہذا بلا عذر اس کا چھوڑنا گناہ ہے اور ترک جماعت کا عادی ہونا فسق ہے ایسا شخص شرعاً فاسق ہے الاحقر عبدالکریم، ۱۴ صفر ۵۲ھ

محراب اور در میں امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے

سوال (۳۳) .... امام مسجد کے در میں کھڑا ہو اور مقتدی فرش کے اوپر کھڑے ہوں، ایک شخص نے منع کیا کہ محراب میں امام کے کھڑے ہونے سے نماز نہ ہوگی، ایک دوسرے شخص نے کہا کہ محراب نہیں ہے یہ در ہے، محراب اس کو کہتے ہیں جو مسجد کے اندر دیوار میں گہرا ہوتا ہے، اس میں اگر امام کھڑا ہو اور مقتدی سے غائب ہو اس میں نماز پڑھانے سے نماز نہ ہوگی، اب حضور جو تحریر فرمادیں وہ عمل کیا جاتے۔

الجواب: فی الدر المختار (وقیام الامام فی المحراب لا سجودہ فیہ) و قدماہ خارجہ لان العبرۃ للقدم (مطلقا) وان لم یتشبہ حال الامام ان علل بالتشبیہ الخ وقال الشامی تحت (قولہ ان علل بالتشبیہ) قیل للکراھۃ وحاصلہ انہ صرح محمد فی الجامع الصغیر بالکراھۃ ولم یفصل فاختلف المشائخ فی سببھا فقیل کونہ یصیر ممتازا عنھم فی المکان لان المحراب فی معنی بیت اٰخر و ذلک صنیع اھل الکتاب واقتصر علیہ فی الھدایۃ واختارہ الامام السرخسی (ص ۶۷۵)

اس سے معلوم ہوا کہ مختار وجہ کراہت کی تشبیہ و امتیاز ہے، اور اس میں اندر والی محراب اور دروازے برابر ہیں، لہذا مسجد کے در میں کھڑا ہونا بھی مکروہ ہے، واللہ اعلم

احقر عبدالکریم عفی عنہ، جمادی الاولیٰ ۵۲ھ الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

امام نے سہواً بلا وضو نماز پڑھادی تو اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ | سوال (۳۴) اگر کوئی .... پیش امام بھول کر بلا وضو نماز پڑھادیوے جب نماز کا وقت نکل جاوے تب یاد آوے

کہ بلا وضو نماز پڑھادی ہے، اس حالت میں کیا کرنا چاہیئے، ایسا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے یہ کارڈ لکھا گیا ہے، اور سب مقتدی جواب کے انتظار میں ہیں، کہ نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب: امام پر لازم ہے کہ جن اشخاص کے متعلق معلوم ہو کہ وہ اس نماز میں شریک تھے، ان سب کو جس طرح ممکن ہو اطلاع کر دے، اور امام عادل ہو تو اُن پر اس کی اطلاع سے اعادہ کرنا ضروری ہے، اور اگر امام عادل نہ ہو تو اعادہ مستحب ہے، کما فی الدر ۳۴۹ الشامی (ص ۶۱۸ ج ۱) (واذا ظہر حدث امامہ بطلت فیلزم اعادتہا کما یلزم الامام الاخبار بالقدر الممکن) بلسانہ او بکتاب او رسول علی الاصح (لو معینین والا لا یلزمہ، بحر، قال الشامی واذا ظہر ای بشہادۃ الشہود او باخبارہ عن نفسہ وکان عدلا والا ندب کما فی النہر عن السراج،

عبدالکریم عفی عنہ ۶ رج ۲ ۱۳۴۵ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد

امرد کی امامت مکروہ ہے | سوال (۳۵) بے ریش بالغ کے پیچھے نماز درست ہے؟ جب ایک ڈاڑھی والا آدمی ایک ہی لیاقت کا موجود ہے،

الجواب: فی الشامی (وکذا تکرہ خلف امرد) الظاہر انہا تنزیہیۃ ایضا والظاہر ایضا کما قال الرحمتی ان المراد بہ الصبیح الوجہ لانہ محل الفتنۃ الخ، اس سے معلوم ہوا کہ حسین امرد کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، واللہ اعلم،

احقر عبدالکریم عفی عنہ ۵ محرم ۱۳۴۵ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفاعنہ ۶ محرم ۱۳۴۵ھ

ایضاً ایضاً ایضاً | سوال (۳۶)............ ایک حافظ جس کی عمر ۱۷ یا ۱۸ سال کی ہے، اور وجود ظاہری بھی بالغ نظر آتا ہے، لیکن ڈاڑھی ابھی تک نہیں آئی، اور تین چار سال تک رمضان شریف میں قرآن شریف نفلوں میں سناتا رہا، بوجہ نابالغی کے جب بالغ ہوا تب محراب سنائی، اب اس کو ایک مسجد میں لوگ امام مقرر کرتے ہیں اور اردو دو چار جماعت تک پڑھا ہوا ہے اور پڑھتا ہے، اور دینیات مفتاح الجنۃ وغیرہ بھی پڑھتا ہے، اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اس امرد بالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا تو بلا کراہت جائز ہے، جبکہ اور

حافظ غیر امرد نہ ملے، لیکن فرائض کی نماز میں بہتر یہ ہے کہ اس کو امام نہ بنایا جاوے، اگر وہ خوب صورت ہو، اور اگر خوب صورت اور محل فتنہ نہ ہو تو فرائض میں بھی اس کی امامت بلا کراہت درست ہے، قال فی الدر وکذا تکرہ خلف امرد وسفیہ الخ قال الشامی الظاهر انها تنزیه ایضا والظاهر ایضا کما قال الرحمتی ان المراد به الصبیح الوجه لانه محل الفتنة اھ (ص ۵۸۷ ج ۱) قلت انما قلت بجواز امامته فی التراویح لاختلاف الفقهاء فی جواز امامة الصبی فیها فجوزها مشایخ بلخ والاصح عدم الجواز کما فی الشامیة عن الهدایة (ص ۶۰۴ ج ۱) فلما اختلفوا فی الصبی الغیر البالغ فینبغی ان یتفقوا علی جواز امامة الامرد البالغ اذا لم یوجد حافظ غیره ولان فیه ابقاء لحفظ القرآن ولعل مشایخ بلخ جوزوا امامة الصبی فیها نظرا الی ذلک ولکن الصبی لیس باهل لها والامرد البالغ اهلها وانما الکراهة لعارض فتنفی بالضرورة، والله اعلم، ۲۰ رشعبان ۱۳۴۵ھ

داڑھی کے سفید بال اکھڑوانے والے کی اقتداء کا حکم،

سوال (۳۷) زید پیش امام ہے اور اپنی داڑھی کے سفید بال اکھڑواتا ہے، آیا اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں، اور داڑھی کے سفید بال اکھڑوانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر یہ شخص قبل از وقت بوڑھا ہو گیا ہو تو نتف شیب جائز ہے بشرطیکہ محض زینت کی نیت نہ ہو، بلکہ ارضاء زوجہ مقصود ہو یا اور کوئی ضرورت ہو، اور اگر بوڑھا قبل از وقت نہیں بلکہ وقت پر ہوا ہے ... تو نتف شیب مکروہ ہے اور کراہت تنزیہیہ ہے، قال فی الهندیة ونتف الشیب مکروه للتزیین لا لترهیب العدو وکذا نقل عن الامام کذا فی جواهر الاخلاطی (ص ۲۳۵ ج ۶) قلت والاحتیاط عن موضع لا یحضرنی الآن لفظه لا باس به فی ذلک والجمع بینهما ما ذکرته ولعله جمع حسن، والله اعلم، ۲۱ رشعبان ۱۳۴۵ھ

جو شخص تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لیتا ہو اس کی اقتداء کا حکم

سوال (۳۸) آجکل ایک فصلی حافظ صاحب تراویح پڑھاتے ہیں، اور میں بھی اس جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں، یہ یقینی بات ہے کہ بعد ختم کلام مجید حافظ صاحب کی خدمت کی جاوے گی، اور مجھ کو بھی

شامل ہونا پڑے گا، ایسی حالت میں میرے لئے تراویح کا پڑھنا ایسے امام کے پیچھے جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: اگر یہ حافظ قرآن ختم قرآن کی اجرت پہلے سے طے کر لیتا ہے اور یہ شخص اس مسجد میں جہاں تراویح پڑھاتا ہے امام بھی نہیں تو یہ فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا نہ چاہئے، بلکہ الم ترکیف سے چند آدمیوں کے ساتھ جدا جماعت کرلی جاوے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو تنہا پڑھ لی جائے، اور اگر یہ شخص پہلے سے اجرت طے نہیں کرتا بلکہ قرآن تراویح میں سنا دیتا ہے، اور بعد تراویح کے لوگ حسب ہمت خدمت کر دیتے ہیں، اور یہ کمی بیشی پر کچھ اعتراض و مطالبہ نہیں کرتا، تو گو اس صورت میں بھی یہ رقم تو اس کو لینا جائز نہیں لکونہ معاوضۃ الختم لان المعروف کالمشروط، مگر یہ شخص مرتکب کبیرہ نہیں، اس کے پیچھے نماز جائز ہے، واللہ اعلم، ۱۰ رمضان شریف ۴۵ھ

صحتِ اقتداء کے لئے علم بانتقالاتِ امام شرط ہے رویت نہیں،

سوال (۳۹) میرے سابق محلہ کی مسجد جناب نے دیکھی ہے اس کی سطح مستوی ہے، اور جمعہ کے دن کثرتِ مصلیان کی وجہ سے وہاں کچھ نمازی کھڑے ہو جاتے ہیں، مگر مسجد کی چھت ہیں کوئی زینہ دستندا (؟)، جیسا کہ دو منزلہ مساجد میں اکثر معمول ہے نہیں ہے بکر کی آواز بلکہ خود امام کی قرأت و تکبیر کی بھی آواز جاتی ہے، مگر امام کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا، ایسی صورت میں اوپر کھڑے ہونے والے نمازیوں کی نماز ہو جاوے گی یا نہیں، اور دوسرے مکانات کی چھتوں پر بھی لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، جو محض مکبر کی تکبیر پر رکوع و سجدہ میں جاتے ہیں، اس میں اور اس میں کیا فرق ہے، اور چونکہ یہ واقعہ ہے اس لئے اس کے جواب کے قبل از جمعہ.... ضرورت ہے تاکہ نماز صحیح نہ ہو تو روک دیا جائے، روایات کی چنداں ضرورت نہیں، محققانہ قول فیصل مفتی بہ درکار ہے،

الجواب: صحتِ اقتداء کے لئے علم بانتقالات امام شرط ہے، رویت ضروری نہیں، پس سقف مسجد پر نماز پڑھنے والوں کی نماز درست ہے، گو امام کو دیکھتے نہ ہوں قال فی الدر وعلمہ بانتقالاتہ الخ قال الشامی ای بسماع او رؤیۃ للامام او لبعض المقتدین رحمتی وان لم یتحد المکان ط اھ (ص ۵۷۵ ج ۱) ۱۸ رمضان ۴۲ھ

تحقیق تسویۂ صفوف والصاق القدم بالقدم

سوال (۴۰) جماعت میں صفوں کو سیدھا کرنیکی

تاکید ہو! کندھے سے کندھا ملا دیں، اور حضرات اہل حدیث فرماتے ہیں کہ سد الخلل سے مراد پیر سے پیر بھی ملا کر صف میں نمازی کھڑے ہوں، اور الصاق سے مراد حقیقۃً ملانا ہے تو کیا ان کا کہنا حق ہے، اور احناف غلطی پر ہیں کہ جو پیروں کو نہیں ملاتے۔

۲۔ کیا سد الخلل کندھے کے ملانے سے ہوتا ہے کہ نہیں، اگر ہوتا ہے تو کیا پیروں کو فراخ کر کے ملانے سے سد الخلل نہیں ہوگا، ان کو واضح کر کے جواب لکھیں، اس میں ہمارے یہاں کے احناف بھی مبتلا ہوتے ہیں،

الجواب: عن انس مرفوعاً قال رصوا صفوفکم وقاربوا بینہا وحاذوا بالاعناق رواہ ابو داؤد والنسائی وصححہ ابن حبان بلوغ المرام (ص ۴۷ ج ۱) قال فی مجمع البحار تراصوا فی الصفوف ای تلاصقوا حتی لا یکون بینکم فرج من رص البناء اذا الصق بعضہا ببعض اھ (ص ۱۲ ج ۲) وفی الباب عن النعمان بن بشیر یقول اقبل علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوجہہ فقال اقیموا صفوفکم ثلثا واللہ لتقیمن صفوفکم او لیخالفن اللہ بین قلوبکم قال فقد رأیت الرجل منا یلزق منکبہ بمنکب صاحبہ ورکبتہ برکبتہ وکعبہ بکعبہ اخرجہ ابو داؤد وصححہ ابن خزیمۃ (فتح الباری، ص ۱۷۶ ج ۲) وعن انس مرفوعاً قال اقیموا صفوفکم فانی اریکم من وراء ظہری وکان احدنا یلزق منکبہ بمنکب صاحبہ وقدمہ بقدمہ رواہ البخاری قال الحافظ فی الفتح (ص مذکور) و اخرجہ الاسمٰعیل (فی مستخرجہ الصحیح) من روایۃ معمر عن حمید بلفظ قال انس فلقد رأیت احدنا الیٰ اٰخرہ وزاد معمر فی روایۃ ولو فعلت ذلک باحدہم الیوم لنفر کانہ بغل شموس اھ وذکرت فی اعلاء السنن اخذت طائفۃ فی زماننا بظاہر ہذا الحدیث فتراہم یلزقون اقدامہم باقدام من یلیہم فی الصف ولا یزالون یتکلفون ذلک الی اٰخر الصلوٰۃ ولا یخفی ان فی الزاق الاقدام بالاقدام مع الزاق المناکب بالمناکب والرکب بالرکب مشقۃ عظیمۃ لا سیما مع ابقائہا کذلک الی اٰخر الصلوٰۃ کما ہو مشاہد والحرج مدفوع بالنص علی ان الزاق تلک الاعضاء باجمعہا حقیقۃ غیر ممکن اذا کان المصلون مختلفی القامۃ فالمراد منہ جعل بعضہا فی محاذات بعض قال

الحافظ فی الفتح تحت قول البخاری باب الزاق القدم بالقدم فی الصف المراد بذلک المبالغۃ فی تعدیل الصف وسد خللہ (ص مذکور) وفی عون المعبود قولہ صلی اللہ علیہ وسلم حاذوا بالمناکب ای اجعلوا بعضہا حذاء بعض بحیث یکون منکب کل واحد موازیاً لمنکب الآخر ومسامتالہ فتکون المناکب والاعناق والاقدام علی سمت واحد اھ (ص ۲۱۵ ج ۱) وقال الشیخ ولو حمل الالزاق علی الحقیقۃ فالمراد منہ احداثہ وقت الاقامۃ لتسویۃ الصف فان احداث الالزاق فی تلک الاعضاء طریق تحصیل ہذہ التسویۃ ولا دلالۃ فی الحدیث علی ابقاءہ فی الصلوٰۃ بعد الشروع فیہا ومن ادعی ذلک فلیأت بحجۃ علیہ اھ قلت وقول انس کان احدنا وقولہ ولقد رأیت احدنا یفید ان الفعل المذکور کان فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یبق بعدہ کما صرح بہ فی روایۃ معمر بقولہ ولو فعلت ذلک باحدہم لنفر کانہ بغل شموس فلو کان ذلک سنۃ مقصودۃ من سنن الصلوٰۃ لم یترکہا الصحابۃ والتابعون ولم یتنفر منہا احد فالصحیح ما قلنا ان ذلک کان للمبالغۃ فی تسویۃ الصف حین الاقامۃ لا بعدہا فی داخل الصلوٰۃ اھ (ص ۲۹۹ ج ۴)

ان عباراتِ مذکورہ سے واضح ہوگیا کہ سد الخلل سے مراد یہ ہے کہ نمازی خوب مل کر کھڑے ہوں کہ درمیان میں فرجہ نہ رہے، اور یہ بات کندھا ملانے سے حاصل ہوتی ہے، قدم سے قدم ملانے سے فرجہ پیدا ہو جائے گا، اور قدم سے قدم ملانا نماز شروع کرنے سے پہلے اسی غرض سے ہے تاکہ صف سیدھی ہو جائے نماز کے اندر قدم سے قدم ملانا سنت نہیں ہے، اس لئے احناف غلطی پر نہیں ہیں،

۲، پیروں کو فراخ کرکے ملانے سے سد الخلل نہ ہوگا، بلکہ کندھے سے کندھا ملانے سے سد الخلل ہوگا، کیونکہ ان اللہ یحب الذین یصفون کما تصف الملائکۃ کانہم بنیان مرصوص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمازیوں کو بنیان مرصوص کی طرح مل کر کھڑا ہونا چاہئے، اور یہ تراص الزاق مناکب ہی سے ہوتا ہے، واللہ اعلم، ۲۱ ذی الحجہ ۴۵ھ

اس شخص کی اقتداء کا حکم جو خارج مسجد بدون اتصالِ صفوف امام کی آواز یا مسجد کے اندر موجود مقتدیوں کی حرکات دیکھ کر نماز ادا کرے

سوال (۴۱) مقتدی اگر مسجد سے باہر ہوں یعنی جس جگہ وہ کھڑے ہیں وہ مسجد کی حد سے

باہر ہے، اور وہاں تک صفیں بھی متصل نہیں ہے، تو اس صورت میں اگر مقتدی امام کی آواز سنتے ہوں، یا مسجد کے اندر جو مقتدی ہیں ان کی حرکات کو دیکھتے ہیں تو باہر والے مقتدیوں کی نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ایسے مقتدیوں کی نماز درست ہو جاوے گی، قال فی الدر وشرط عشرة نية المؤتم الاقتداء واتحاد مكانهما وصلوتهما و صحة صلوة امامه وعدم محاذات امرأة وعدم تقدم عليه بعقبه وعلمه بانتقالاته وبحاله من اقامة وسفر ومشاركة فی الاركان وكونه مثله اودونه فيها،

قال الشامی تحت قوله (وشرط عشرة) هذه الشروط فی الحقيقة شروط الاقتداء وقوله (واتحاد مكانهما) فلو اقتدى راجل براكب اوبالعكس او راكب براكب دابة اخرى لم يصح لاختلاف المكان فلو كانا على دابة واحدة صح لاتحاده كما فی الامداد وسيأتی واما اذا كان بينهما حائط فسيأتی ان المعتمد اعتبار الاشتباه لا اتحاد المكان فيخرج بقوله وعلمه بانتقالاته وسيأتی تحقيق هذه المسئلة بمالامزيد عليه قال الشامی تحت (قوله وعلمه بانتقالاته) ای بسماع اورؤية الامام اوبعض المقتدين رحمتی وان لم يتحد المكان، اس جواب کی بنا اس پر ہے کہ صحتِ اقتدا کے لئے اتحادِ مکان امام و مقتدی شرط نہیں، اور یہ بنا صحیح نہیں کیونکہ شرط اتحادِ مکان امام ابوحنیفہؒ کا مذہب مشہور ہے، تمام متون میں یہ شرط مذکور ہے، اور طحطاوی نے جو وان لم يتحد المكان فرمایا ہے اس کا منشا بعض فروع سے مغالطہ میں پڑنا ہے، جیسا کہ خود درمختار اور شامی میں صفحہ ۶۱۳ و ۶۱۴ پر ان فروع کی تفصیل آتی ہے، ان فروع کو اور متون کے اشتراطِ مکان کو دیکھ کر قول فیصل یہ ہے کہ اتحادِ مکان کا مشروط ہونا تو یقینی ہے، اور جس نے اس شرط کی نفی کی یہ اس کی غلطی ہے، کیونکہ جو شرط متون میں بالاتفاق مذکور ہے، اور امام کے مذہب میں اس شرط کا ہونا مشہور ہے اس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، لیکن اتحادِ مکان کا مدار عرف پر ہے، اگر عرفاً مکانِ مقتدی مکانِ امام سے متحد ہو تو اقتدا صحیح ہے اور عرفاً متحد نہ ہو تو اقتدا صحیح نہیں، اس لئے بعض فروع میں بعض مشائخ نے اقتدا

کو صحیح کہا، کیونکہ اُن کے نزدیک اتحادِ عرفی موجود تھا، اور بعض نے صحیح نہیں کہا، اُن کے نزدیک اتحادِ مکان عرفاً تھا، باقی اشتراط اتحادِ مکان پر سب متفق ہیں، ہکذا ینبغی ان یفہم المقام والعلم عند اللہ الملک العلام، ۲۶ر صفر ۴۶ھ

جو شخص قطرہ آنے کا مریض ہو اسکی اقتدا، جائز ہے یا نہیں؟

سوال (۴۲): .... ایک شخص بڑا ذی علم اور خاندانِ انصار میں سے ہے، اور شریعت کا بڑا پابند ہے اور عابد بھی ہے، یعنی نماز تہجد و اشراق و چاشت وغیرہ کا بڑا پابند ہے، ہر وقت ہی یادِ الٰہی کرتا رہتا ہے، روزانہ قرآن شریف کی منزل سے بھی زیادہ تلاوت کرتا ہے، اب کچھ عرصہ سے قطرہ کی تکلیف ہوگئی ہے، یعنی پیشاب کے کچھ دیر بعد قطرہ آجاتا ہے، اور بعض دفعہ بالکل نہیں آتا، مگر اس شخص کے دل پر عشاء و تہجد کے وقت پر، کیونکہ ان دونوں وقتوں میں وضو سے پیشتر پیشاب کرنا پڑتا ہے، اسی کا خیال آتا ہے، اور پھر وہ دیکھ بھی لیتا ہے کہ اگر دوبارہ قطرہ آگیا ہو تو دوبارہ وضو کرلے، اگر کپڑے کو لگ گیا تو کپڑا پاک کرلے، ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں اگر اس کے پیچھے نماز نہ پڑھے وہ کیسا ہے؟ بینوا توجروا؟

الجواب: اگر یہ شخص پورا محتاط ہے کہ وقت شروع نماز سے اتنی دیر پہلے پیشاب کرنے کا اہتمام رکھتا ہے جس میں آمد قطرہ سے اطمینان کلی ہوجاوے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اتفاقاً کبھی قطرہ آجانے پر جب وہ دیکھ لیتا ہو اور نماز کا اعادہ کرلیتا تھا اور مقتدیوں کو بھی اعادہ کا امر کرتا ہے اس سے اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں رُکاوٹ نہ ہونا چاہئے، اور اگر یہ پورا محتاط نہیں، یا باوجود احتیاط کے بھی قطرہ کا مریض ہو جس کی علامت یہ ہے کہ وہ روزانہ یا مہینہ میں اکثر اوقات اعادہ صلوٰۃ کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جاوے، بلکہ کوئی تندرست آدمی امام بنایا جاوے، لان عدم الاہتمام بالاستبراء حرام و مرتکبہ فاسق لوجوب الاستبراء بحیث یطمئن قلبہ قبل الشروع فی الصلوٰۃ صرح بہ فی مراقی الفلاح فی فصل الاستبراء وان کان مبتلی بظہور القطرۃ مع الاہتمام بالاستبراء ایضاً وکان ذلک منہ کثیراً فہو مریض، کالمعذور والصحیح اولیٰ منہ، واللہ اعلم، ۱۱ر رجب ۴۶ھ

لواطت سے تائب کی اقتدا کا حکم

سوال (۴۳) ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کہ جس سے فعل قومِ لوط علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سرزد ہوا ہو مگر اس فعل شنیع سے توبہ کرلی ہو، اور

آئندہ اسی عہد پر قائم رہنے کا عزم رکھتا ہو کیسا ہے، اور اگر مقتدی ایسے شخص کو امام بنادیں تو اُن پر کچھ وبال ہوگا یا نہیں؟ اور اس فعلِ بد کا کفارہ کیا ہو سکتا ہے، بینوا بالتفصیل توجروا من اللہ الجلیل،

الجواب: التائب من الذنب کمن لاذنب لہ، اس فعل کا کفارہ توبۂ صادقہ ہی ہے جو شخص توبہ کرلے اور قرائن سے اس کی توبہ صحیح معلوم ہو کہ اب اس فعل سے اور اس کے مقدمات سے کلی اجتناب کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز بلاکراہت جائز ہے، لیکن اگر یہ شخص بدنام ہو چکا ہو اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگ کنارہ کریں تو کسی ایسے شخص کو امام بنانا چاہئے جو بدنام نہ ہو، لفضیلۃ الاورع من غیرہ وکون تقلیل الجماعۃ مکروہا، واللہ اعلم، شعبان ۴۶ھ

جس لڑکے کی عمر پندرہ سال ہو اس کی اقتداء میں تراویح بلاکراہت جائز ہے، البتہ فرائض میں اس کو امام بنانا مناسب نہیں،

سوال (۴۴) ایک لڑکا جس کا عمر پندرہ برس کی ہے کیا یہ لڑکا تراویح میں امام بن سکتا ہے، اور تراویح میں امام بنانے کی صورت میں کیا فرض نماز کی امامت کر سکتا ہے، اور فتاوے عالمگیریہ مطبوعہ نولکشور جلد سوم صفحہ ۹۰۶ میں یہ عبارت ہے،

بلوغ الغلام بالاحتلام اوالانزال والجاریۃ بالاحتلام اوالحیض اوالحمل کذا فی الدرالمختار والسن الذی یحکم ببلوغ الغلام والجاریۃ اذا انتہیا الیہ خمس عشرۃ سنۃ عند ابی یوسفؒ ومحمدؒ وھو روایۃ عن ابی حنیفۃ وعلیہ الفتوٰی وعن ابی حنیفۃ رح ثمانی عشرۃ سنۃ للغلام وسبع عشرۃ سنۃ للجاریۃ کذا فی الکافی، کیا اس عبارت پر قیاس کرکے تراویح وغیرہ میں اس لڑکے کی امامت کا حکم دے سکتے ہیں؟

الجواب: جس لڑکے کی عمر پندرہ سال کی پوری ہو وہ قول مفتیٰ بہ میں بالغ ہے اس کے پیچھے تراویح کی نماز بلاکراہت درست ہے، البتہ فرض میں امام نہ بنایا جاوے، لکراھۃ المکتوبۃ خلف الامرد الذی یشتھی ولم یعتبر ھذہ الکراھۃ فی التراویح لتوسیع الفقھاء فی امر النافلۃ حتی ان بعضھم جوز صلوٰۃ البالغ خلف الصبی الذی لم یبلغ فی التراویح وان کان ذلک ضعیفا ولکنہ مشعر بتوسیعھم فی امر النافلۃ فافھم، ۲۷ شعبان ۴۶ھ

ستونوں کے درمیان صف بندی بلاعذر مکروہ ہے

سوال (۴۵)..................

.... مسجد کے دروازوں یا بیچ مسجد میں ستونوں کے درمیان مقتدی صف باندھکر اقتدا کریں مثلاً اس کے دروازوں میں سے ہر ایک دروازہ میں تین چار مقتدی سما سکتے ہیں، پھر بیچ میں ستون آجاتا ہے تو آیا یہ ستون کا درمیان آجانا مانع اقتدا ہے یا مستلزم کراہت کا ہے، اور یہ کراہت کا لزوم عام ہے یا خاص، باوجود گنجائش و عدم تنگی کے وقت پر منحصر ہے؟ بینوا توجروا،

الجواب، قال العینی فی شرح البخاری اذا کان منفردا لا باس بالصلوٰۃ بین الساریتین اذا لم یکن فی جماعۃ وقید بغیر جماعۃ لان ذلک یقطع الصفوف وتسویۃ الصفوف فی الجماعۃ مطلوبۃ اھ (ص ۴۷۸ ج ۲) وفی الدر فی کراھۃ قیام الامام فی المحراب وعلی مکان مرتفع ما نصہ وھذا کلہ عند عدم العذر کجمعۃ وعید فلو قاموا علی الرفوف والامام علی الارض او فی المحراب لضیق المکان لم یکرہ اھ (ص ۶۷۶ ج ۱) وذکر الحافظ فی الفتح عن المحب الطبری کرہ قوم الصف بین السواری للنھی الوارد عن ذلک ومحل الکراھۃ عند عدم الضیق اھ (ص ۴۷۷ ج ۲) قلت وکلام علمائنا یوافقہ فی ھذا التقیید واللہ اعلم

ستونوں کے درمیان صف بندی کرنا بلا عذر مکروہ ہے، مگر مانع اقتدا نہیں ہے، اور یہ کراہت عام ہے اس صورت کو بھی جبکہ صف ستونوں کے درمیان اس طرح باندھی جائے کہ فرجہ باقی نہ رہے، کیونکہ اس صورت میں بھی ستون قاطع صف ہے، البتہ اگر جمعہ وعید کے موقع پر تنگی ہو تو ایسی حالت میں صف بین السواری بلا کراہت جائز ہے، واللہ اعلم، ۴ شوال ۴۶ھ

جماعت کے سنت مؤکدہ قریب من الواجب ہونے کا مطلب اور یہ کہ جماعت کن لوگوں پر واجب ہے، اسکی مختلف صورتوں کے متعلق استفتاء،

سوال (۴۶) ...... یہ جو فقہاء نے لکھا ہے کہ جماعت پنجگانہ سنتِ مؤکدہ قریب بواجب ہے، یہ خاص مسجدِ محلہ میں محلہ والوں پر ہے یا عام ہے، مثلاً اہلِ محلہ نے گھر میں جماعت سے نماز پڑھ لی تو آیا اُن پر سے حضور مسجدِ محلہ کی جماعت کا سقوط ہو جاوے گا یا نہیں، ایسا ہی کوئی باہر جانے والا ہے اپنی مسجد محلہ میں قبل جماعت فقط تین چار آدمیوں سے جماعت کرکے باہر چلا جاوے تو بھی جماعت ساقط ہو جاوے گی یا نہ؟

(۲) سوائے مسجد محلہ کے کوئی سفر میں ہو، یا اگر شرعی مسافر نہ ہو لیکن اپنے وطن کے سوا اور کہیں ہو تو بھی اس پر حضور مسجد کی جماعت کا لازم ہے یا نہیں، دوسرے یہ ہے کہ جو

وعید تارکِ جماعت پر وارد ہوا ہے وہ مطلقاً جماعت کے تارک کو ہی یا مسجد محلہ کی جماعت کے تارک پر؟ اکثر کتب میں اس کی تفصیل و تفریق نہیں لکھی ہے، اس لئے بعض اس کے قائل ہونے لگے ہیں کہ جماعت مؤکد عام ہے، اس کی تحقیق و تفصیل سے آگاہی بخشئے گا؟

الجواب: حنفیہ کے نزدیک صلوات مکتوبہ کی جماعت مسجد محلہ میں سنت مؤکدہ بلکہ واجب ہے، گھر میں جماعت کرنے سے جماعت کا ثواب مل جاویگا، لیکن ترک سنتِ مؤکدہ اور ترکِ واجب کا گناہ ہوگا، قال فی التنویر والجماعة سنة مؤكدة للرجال واقلها اثنان وقيل واجبة وعليه العامة اھ قال فی الدر عن البحر وهو ای الوجوب الراجح عند اهل المذاهب اھ (ص ۵۷۶ ج ۱) اس سے تو جماعت کا وجوب معلوم ہوا، رہی اس کی دلیل کہ مسجد میں جماعت کرنا واجب ہے، سو حنفیہ سب اس پر متفق ہیں کہ اجابتِ اذان واجب ہے، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ اجابت باللسان واجب ہے، یا بالقدم، شرنبلالی نے نور الایضاح و مراقی الفلاح میں دونوں کو واجب کہا ہے (ص ۱۱۱) اور قاضی خاں و حلوانی وغیرہ نے صرف اجابت بالقدم کو واجب کہا ہے، اور اجابت باللسان کو مستحب کہا ہے، قال فی البحر قال قاضی خان اجابة المؤذن فضيلة وان تركها لا يأثم واما قوله عليه السلام من لم يجب الاذان فلا صلوٰة له فمعناه الاجابة بالقدم لا باللسان فقط اھ وقال الحلوانی الاجابة بالقدم لا باللسان حتى لو اجاب باللسان ولم يمش الى المسجد لا يكون مجيبا ولو كان فی المسجد حين سمع الاذان ليس عليه الاجابة اھ (ص ۲۵۹ ج ۱) اور ظاہر ہے کہ اجابت بالقدم سے مراد یہی ہے کہ مسجد جاکر جماعت سے نماز پڑھے وفی رد المحتار فيما اذا فاتته الجماعة فی مسجد حية وذكر القدوری يجمع باهله ويصلی بهم يعنی و ينال ثواب الجماعة كذا فی الفتح وذكر الشرنبلالی بان هذا ينافی وجوب الجماعة واجاب بان الوجوب عند عدم الحرج وفی تتبعها فی الاماكن القاصية حرج مع ما فی مجاوزة مسجد حية من مخالفة قوله صلى الله عليه وسلم لا صلوٰة لجار المسجد الا فی المسجد اھ (ص ۵۸۰ ج ۱)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ گھر میں جماعت کرنا اس وقت جائز ہے جبکہ مسجد محلہ میں جماعت نہ مل سکی ہو، اور اگر مسجد محلہ میں جماعت ابھی نہیں ہوئی تو گھر میں جماعت

کرنا جائز نہیں، بحر میں ہے وسئل الحلوانی عمن یجمع باھلہ احیانا ھل ینال ثواب الجماعۃ اولا قال لا ویکون بدعۃ ومکروھا اھ (ص ۳۴۶ ج ۱) اس میں صاف تصریح ہے کہ گھر میں جماعت کرنا بدعت و مکروہ ہے، یعنی جب کہ مسجد محلہ میں جماعت ملنے کی امید ہو، اور اگر وہاں جماعت ہو چکی تو پھر گھر میں جماعت کرنے سے جماعت کا ثواب مل جائے گا، لیکن ترکِ جماعت فی المسجد کا گناہ بھی ہوگا، اگر اس نے قصداً کسل وغیرہ کی وجہ سے دیر کی ہو، اور اگر عذر شرعی کی وجہ سے دیر ہوگئی تو گناہ نہ ہوگا، پس صاحب قنیہ نے جو مطلقاً لکھا ہے اختلف العلماء فی اقامتھا فی البیت والاصح انھا کاقامتھا فی المسجد الا فی الفضیلۃ وھو ظاھر مذھب الشافعی کذا فی حاشیۃ البحر اھ یہ صحیح نہیں، کیونکہ اصحابِ مذہب کی تصریحات اس کے خلاف ہیں، اور صاحبِ قنیہ کی نقل ضعیف ہے، اور یہ قول احادیث صحیحہ کے بھی خلاف ہے عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال من سرہ ان یلقی اللہ غدا مسلما فلیحافظ علی ھٰؤلاء الصلوات الخمس حیث ینادی بھن فان اللہ شرع لنبیہ صلی اللہ علیہ وسلم سنن الھدی فانھن من سنن الھدی وانی لا احسب منکم احد الا لہ مسجد فی بیتہ یصلی فیہ فلو صلیتم فی بیوتکم وترکتم مساجدکم لترکتم سنۃ نبیکم ولو ترکتم سنۃ نبیکم لضللتم الحدیث اخرجہ النسائی و اللفظ لہ ومسلم وابوداؤد ولفظ مسلم قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علمنا سنن الھدی وان من سنن الھدی الصلوٰۃ فی المسجد الذی یؤذن فیہ اھ، اس میں صاف مسجد میں حاضر ہو کر نماز ادا کرنے کو سنت مؤکدہ اور گھر میں نماز پڑھنے کو ضلالت کہا ہے:

وعن ابن عباس رض مرفوعاً من سمع النداء ولم یجب فلا صلوٰۃ لہ الا من عذر صححہ الحاکم وابن حبان، وعن علی رض مرفوعا لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد رواہ ابن حبان وسندہ حسن والتفصیل فی اعلاء السنن اور جو شخص سفرِ شرعی سے کم مسافت کا مسافر ہے وہ بحکم مقیم ہے، اس پر بھی جماعت مسجد کا اہتمام واجب ہے لاستثناء الفقہاء المسافر دون المقیم، البتہ اگر اس حالت میں جماعت سے کوئی دوسرا عذر مانع ہو تو تخلف عن الجماعۃ کی گنجائش ہے، والاعذار مذکورۃ فی الفقہ بالبسط واللہ تعالیٰ اعلم

۲ ربیع الاول ۴۲ھ

بدعتی اور غیر مقلد کی اقتدا کا حکم اور انمیں کون اور کس کی اقتدا بہتر ہے؟

سوال (۴۷) ۱؎ ہم لوگ تھوڑے آدمی اہل سنت والجماعت حنفی المذہب ہیں، ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ نے کوئی اچھی بات نہیں چھوڑی، جو کچھ ان سے ثابت ہو اس پر عمل کرنا چاہئے اپنی طرف سے کوئی نیا کام ایجاد نہ کرنا چاہئے، اپنے امام کا پورا مقلد حقیقی طور پر رہنا چاہئے۔

۲؎، دوسری جماعت جو اپنے کو حنفی اور مقلد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی کہتے ہیں تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر بہت کام جس کا امام صاحب سے ثبوت نہیں کرتے ہیں مثلاً مولود، وقت ذکر پیدائش قیام، فاتحہ مروجہ، گیارہویں، رجبی شریف، عرس، اور زیارت مزار بزرگان کے واسطے پھولواری شریف، اجمیر شریف، بہار شریف وغیرہ بھی جاتے ہیں، اذان میں اشہد ان محمد رسول اللہ پر جب مؤذن پہونچتا ہے تو یہ انگوٹھوں کے ناخن کو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں، ان میں سے کوئی کام جائز ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیے گا،

۳؎، تیسری جماعت ہے جو تقلید شخصی کو ناجائز کہتے ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن و حدیث کے مطابق عمل چاہئے، البتہ قرآن وحدیث میں جو مسئلہ نہ ملے تو اماموں کا قول قابل عمل ہے، آمین آواز سے کہتے ہیں، رفع یدین کرتے ہیں، رکوع سے اٹھ کر اللہم ربنا لک الحمد پورا پڑھتے ہیں سجدہ سے اُٹھ کر اللہم اغفرلی پورا پڑھتے ہیں، مولود، نیاز، گیارہویں، رجبی شریف عرس وغیرہ نہیں کرتے ہیں ۱۲

اب قابل غور بات یہ ہے کہ دو مسجدیں یہاں ہیں، ایک مسجد میں جماعت نمبر ۲ حنفی مذہب کے امام ہیں، جماعت بھی ان کی کثیر ہے، ہم لوگ جماعت ۱؎ ان کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو ہم لوگوں کے لڑکوں پر بُرا اثر...... پڑتا ہے، یعنی یہ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بھی حنفی یہ بھی حنفی، تو اتنی بڑی جماعت جو کام کرتی ہے وہ ضرور جائز ہی ہوگا، ورنہ اُن کے علماء تو منع کرتے، علماء تو خود مولود، نیاز، عرس وغیرہ میں شریک ہوتے ہیں، اور اس کی تعریف کرتے ہیں، اور دوسری مسجد میں امام غیر مقلد ہیں، ان کی جماعت کثیر اس مسجد میں نماز پڑھتی ہے، یہاں ہم لوگ اگر نماز پڑھیں تو مقتدی بننا پڑتا ہے، ان کے ساتھ نماز پڑھنے میں ہم لوگوں کے لڑکوں پر بُرا اثر پڑنے کا خوف نہیں، کیونکہ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ یہ لوگ غیر مقلد ہیں، اُن کا مذہب ہی دوسرا ہے، مگر آمین، رفع یدین یہ لوگ کرتے ہیں، ایسی حالت میں ہم لوگوں کا جماعت ۲؎ کے ساتھ نماز پڑھنا بہتر ہے یا جماعت ۳؎ غیر مقلدوں کے

ساتھ نماز پڑھنا اچھا ہے،

جوابات: (۱) حنفی مقلدوں کو یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کتاب اللہ اور حدیث کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے جو کچھ انھوں نے مسائل شرعیہ بیان فرمائے ہیں وہ قرآن وحدیث کے خلاف ہرگز نہیں، اور خطاء سے بجز انبیاء ؑ کے کوئی معصوم نہیں، ممکن ہے کہ امام صاحب سے کسی جگہ خطا بھی ہوئی ہو، مگر یہ احتمال جیسا امام صاحب کے متعلق ہے تمام ائمہ اور محدثین کے متعلق بھی ہے، پس جو شخص کسی مسئلہ میں امام صاحب کو خطاء پر بتلائے اگر وہ مجتہد ہے تو ممکن ہے کہ خود اسی کا قول خطا ہو، اور اگر مجتہد نہیں تو اس کو امام صاحب جیسے مجتہد اعظم کی شان میں ایسی بات کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے، جو سخت بے ادبی ہے، پس حنفی یوں سمجھیں کہ ہم قرآن وحدیث ہی کا اتباع کرتے ہیں، اس تفسیر کے موافق جو امام ابو حنیفہ رحؒ نے بیان فرمائی ہیں، اور جو لوگ مجتہد نہ ہوں ان پر واجب ہے کہ قرآن وحدیث کے سمجھنے میں کسی مجتہد کا اتباع کریں، محض اپنی سمجھ سے مطلب نہ گھڑیں، کیونکہ ہر علم میں ماہرین کا اتباع لازم ہے، اور قرآن وحدیث کے ماہر مجتہدین ہی ہیں،

(۲) یہ لوگ بدعتی ہیں، ان سے احتراز کرنا چاہئے، یہ امام ابو حنیفہ رحؒ کے پورے مقلد نہیں بلکہ بہت باتیں اُن کے خلاف کرتے ہیں، چنانچہ جتنی باتوں کا اس نمبر میں ذکر ہے امام ابو حنیفہ نے ان کو جائز نہیں فرمایا، بلکہ ان کے مذہب کی رُو سے یہ سب بدعات ہیں،

(۳) یہ لوگ غیر مقلد ہیں، اور اسلام میں جس قدر فتنے پیدا ہوتے ہیں ترکِ تقلید ہی سے پیدا ہوتے ہیں، پس حنفی مقلدوں کو نمبر ۲ و ۳ دونوں جماعتوں سے الگ رہنا چاہئے، اور کسی کے ساتھ بھی نماز نہ پڑھیں، بلکہ اپنی جماعت الگ کریں، اور بدرجہ مجبوری جماعت نمبر ۲ کے ساتھ نماز پڑھ لیا کریں، کیونکہ وہ لوگ نماز، وضو، پاکی ناپاکی کے مسائل میں امام ابو حنیفہ کے مذہب پر عمل کرتے ہیں تو حنفیوں کی نماز اپنے مذہب کے موافق صحیح ہو جاوے گی، اور جماعت ۳ وضو اور غسل اور پاکی ناپاکی کے مسائل میں امام ابو حنیفہ کے مذہب کی بہت امور میں مخالف ہیں، ان کے پیچھے حنفیوں کی نماز درست نہیں ہوگی، کیونکہ منی اُن کے یہاں پاک ہے، غسلِ جنابت میں کلی کرنا، ناک میں پانی دینا ان کے یہاں ضروری نہیں، خون، پیپ، قے وغیرہ سے ان کا وضو نہیں ٹوٹتا، کنویں میں چوہا وغیرہ مرنے سے کنواں ان کے نزدیک ناپاک نہیں ہوتا، ایسی حالت میں اُن کے وضو اور پاکی کا کیا اعتبار، رہا اولاد کا بگڑنا سو اس کا اندیشہ غیر مقلدوں کے ساتھ

میل جول میں زیادہ ہے، کیونکہ وہ خود نمازی کے اندر بہت باتیں ہمارے خلاف کرتے ہیں، جس سے بچوں کو وحشت ہوگی کہ یہ نئی باتیں کیسی ہیں، پھر ممکن ہے کہ وہ بھی غیر مقلد ہو جائیں، اور یہ سخت فتنہ ہے، جس کے بعد ایمان کی خیر بہت کم ہے، واللہ اعلم، ۱۸ رشوال ۴۶ھ

اگلی صف پُر ہونے کے بعد اکیلا آدمی کیا کرے؟

سوال (۴۸) .... اگر کوئی شخص جماعت کھڑی ہونے کے بعد آئے اور تنہا ہو تو صف میں سے کسی نمازی کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے واسطے پیچھے کو کھینچے تو نیت اول باندھے (یعنی تکبیر تحریمہ اول کہے) یا بدون نیت (و تکبیر تحریمہ) باندھے کھینچ لے، اور اس کو اپنے برابر کھڑا کرکے نیت باندھے، اگر بدون نیت باندھے کھینچے گا تو تعلیم خارج تو نہ ہوگی؟

الجواب: آجکل کسی کو نہ کھینچے، نہ بعد تکبیر تحریمہ نہ قبل تکبیر تحریمہ، بلکہ مسبوق صف کے پیچھے تنہا کھڑا ہو جاوے، اور تفرد خلف الصف میں جو کراہت ہے وہ جب ہے کہ صف میں فرجہ ہو، اور جب صف بھر گئی ہو پھر تفرد میں کراہت نہیں، آجکل فتویٰ اسی پر ہے، اور اگر کوئی مسئلہ جذب ہی پر عمل کرنا چاہے تو جذب عالم بعد التکبیر اولیٰ ہے، اور قبل التکبیر بھی جائز ہے، فساد کسی صورت میں نہیں، اور جذب جاہل میں فساد کا خوف ہے قال فی رد المحتار عن القہستانی عن الجلابی ان المقتدی یتأخر عن الیمین الی خلف اذا جاء آخر اھ وفی الفتح ولو اقتدی واحد بآخر فجاء ثالث یجذب المقتدی بعد التکبیر ولو جذبہ قبل التکبیر لا یضرہ اھ قلت ومسئلۃ المتفرد خلف الصف مثلہ، واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۹ ربیع ا ۴۷ھ

حکم نزاع در امامت

سوال (۴۹) .... جناب کو ماجرائے ذیل میں ثالث ہم لوگوں نے مانا ہے، جیسا فرمان ہو، عمل میں لاویں گے، ایک محلہ کے قدیمی دائمی امام قاری صاحب نے دوسرے ضلع میں بضرورت جانا چاہا، مصلی لوگوں نے جواب دیا کہ منشی لطف الرحمٰن غیر ملکی کو جیسا کہ آگے اور ایک سال چند روز جمعہ (یعنی الکین) دیکر گئے تھے اب بھی دیئے جائیے، امام قدیم نے موافق اجازت مصلی نئے خطیب سے جاکر کہہ کر دوسرے ضلع کو چلے گئے، نئے خطیب نے بعد دو جمعہ آکر مصلیوں سے کہا کہ میں کئی جمعہ کے لئے قبول نہیں کرتا اگر برابر بسر امامتی دوگے پڑھاؤں گا، مصلیوں نے مجبوراً کہا کہ آپ نئے امام ٹھیک ہیں اور قدیمی امام کو آئندہ نہیں رکھیں گے، اور قسم بھی اس پر کھائی، اب قدیمی امام آکر دعویدار ہوئے، اور فساد یہاں تک بڑھا کہ اب (اب سب مصلی اور قدیم وجدید دونوں امام جناب سے دست بستہ

عرض گذار ہیں کہ اس درمیانی قول و قرار و قسم کرنے سے نئے امام کا حق امامت کرنا ہے یا قدیم امام کا، موافق حکم و اجازت مصلّی جو کہ نئے امام کو کہہ کر اور امامت کا حکم دے کر دوسرے ضلع گیا تھا، ابھی اسی کا دعویٰ اور حقِ امامت بحال رہیگا، کس کا خطیبی بحال رہے گا،

الحاصل مصلّی لوگ اور دونوں امام قدیم محلہ و امام و خطیب غیر محلہ سب مل کر دستخط کرکے جناب سے مسئلہ طلب کرتے ہیں، اور ثالث مانتے ہیں کہ کون دائمی خطیب موافق شرع محمدی صلعم کے ہے، موافق اس کے عمل کریں گے،

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام قدیم رخصت لے کر گیا تھا مستعفی ہو کر نہیں گیا تھا، اور اہلِ محلہ یعنی مصلّیوں نے امام جدید کو مقرر کرتے ہوئے امام قدیم کو اطلاع نہیں دی کہ تم کو معزول کر دیا گیا، اس لئے امام قدیم منصبِ امامت پر بدستور باقی ہے، فان الاجارۃ لایصح فسخہا الا بحضرۃ المتعاقدین حقیقۃ او حکما ولم یوجد، اور اس کا دعویٰ حق بجانب ہے، کیونکہ نہ اُس نے استعفیٰ دیا، نہ اس کو عزل کی اطلاع دی گئی، اور امام جدید کا دعویٰ بھی حق بجانب ہے، کیونکہ جس وقت اس نے امامت سے انکار کیا تو اہلِ محلہ نے اس کو ہمیشہ کے واسطے امام بنالیا، اور اس سے عہد بھی کرلیا تھا، پس امام قدیم اور امام جدید دونوں امامت کے عہدے پر قائم ہیں، اور ان ایام کی تنخواہ دونوں کو دینی پڑے گی، اور اب اہلِ محلہ کو اختیار ہے کہ اگر دونوں کو امام نہ رکھ سکیں تو ان میں سے ایک کو جواب دیکر الگ کردیں، خواہ قدیم کو خواہ جدید کو، اور وسعت ہو تو دونوں کو امام بنالیں، یہ تو صورت مسئولہ کا جواب تھا، اب بطور نصیحت کے لکھا جاتا ہے کہ اہلِ محلہ نے اس معاملہ میں یہ سخت کوتاہی کی کہ جس وقت امام جدید کو مستقل امام دائمی بنایا تھا اس وقت امام قدیم کو اطلاع کیوں نہیں دی، کہ تم کو آج سے معزول کر دیا گیا، اور امام جدید نے یہ سخت بے مروتی کی کہ امام قدیم کے منصب کی طمع کی، اور اس کی جگہ پر قبضہ جمانا چاہا، اور امام قدیم نے یہ غلطی کی کہ جب اس کی جگہ اہلِ محلہ نے دوسرے کو رکھ لیا تھا تو اس میں آکر جھگڑا اور منازعت کی، یہ امور علم و اسلام کی شان سے بہت بعید تھے، واللہ اعلم ۲۳ ربیع الثانی ۴۷ھ

صفِ اول میں امام کے پیچھے پھر داہنی اور پھر بائیں جانب کھڑے ہونے کی فضیلت

سوال (۵۰) جماعت کی نماز میں صفِ اول سب سے بہتر جگہ اس شخص کی ہے جو امام کے پیچھے ہوتا ہے اور اس کے بعد جو داہنی طرف اور بعد ازاں وہ شخص جو بائیں طرف ہے، اس ترتیب مراتب کے

بارے میں جو فقہاء کی عبارت ہو وہ بجنسہ تحریر فرمانے کا ارشاد فرمادیں، یہ ترتیب غالباً بحر الرائق میں مذکور ہو، کتاب یہاں میسر نہیں آئی،

الجواب، قال الشامی روی فی الاخبار ان اللہ تعالیٰ اذا انزل الرحمۃ علی الجماعۃ ینزلہا اولا علی الامام ثم تتجاوز عنہ الیٰ من بحذائہ فی الصف الاول ثم الی المیامن ثم الی المیاسر ثم الی الصف الثانی انتہیٰ مافی البحر اھ ص ۵۹۴ ج ۱ قلت والحدیث اخرجہ فی کنز العمال نحوہ قریباً منہ والظاہر من جلالۃ السیوطی انہ لا یسکت عن الموضوع فلا بأس فی الفضائل، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲ رمضان ۴۷ھ

ظلم وفسق کا مرتکب لائق امامت نہیں ہو

سوال (۵۱) .... ایک نابینا حافظ راجپوت مسلمان قاضی صاحب کی بہن کو قرآن شریف پڑھانے جایا کرتے تھے، حافظ صاحب کو لوگوں نے منع کیا، حافظ جی پڑھانے سے منع نہ ہوئے، حافظ جی صاحب نے قاضی کی بہن کا نکاح اس کے تایازاد بھائی سے کردیا، ایک دن گھر میں خوشدامن کے ساتھ لڑائی ہوئی، طعنہ وتشنیع ہونے لگی، غرض قاضی کی بہن کو نکال دیا، اور پھر طلاق نامہ لکھ کر اس کو دیدیا، پھر عدت طلاق ختم کے بعد حافظ صاحب نے اپنی شاگردن سے نکاح پڑھوالیا، قاضی صاحب کی بہن کی اولاد حافظ صاحب کے تخم سے ہوئی، حافظ صاحب کا انتقال ہوگیا، اب حافظ صاحب کے لڑکے مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ میں پڑھنے کے واسطے گئے تو قاضی صاحب نے اپنے بھانجوں کو نکلوادیا، اور یہ کہا یہاں پڑھنے مت آنا، جو پڑھنے آئے تو ماردیں گے، ایسے امام کے پیچھے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟

الجواب: اس قاضی امام کا ان بچوں کو یعنی بھانجوں کو مدرسہ سے نکالنا ظلم ہے، جو محض عصبیت اور جاہلیت پر مبنی ہے، اور ظلم وفسق ہے، لہٰذا جب تک یہ امام اپنے بھانجوں سے اس ظلم کو رفع نہ کرے اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہ کرے، امامت سے الگ کردیا جاوے، فقط واللہ اعلم،

صحتِ اقتدار کیلئے علم بحال وانتقالاتِ امام شرط ہی، سماعِ صوت ضروری نہیں،

سوال (۵۲) دو منزلہ مسجد میں اگر اوپر کے درجہ پر امام مع معتقدین ہو اور نیچے بھی مقتدین ہوں یا بالعکس ہو تو علی الاطلاق سب کی نماز درست ہے، یا اس کے متعلق کچھ شرائط ہیں؟

مثلاً امام کی آواز سب کو پہونچنا ضروری ہے یا نہیں، اگر امام کی آواز نہ پہونچے تو مکبّر کی تکبیر کافی ہے یا نہیں ؟

الجواب، علم بحال الامام و بانتقالاتہ شرط ہے، خواہ سماع صوت امام سے ہو یا سماع صوتِ مکبر سے، اور ایک شرط یہ ہے کہ امام سے تقدم نہ ہو، اگر کوئی متقدم ہو گیا اس کی نماز درست نہ ہوگی،

مسجدِ محلہ میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے

سوال (۵۳) جماعتِ ثانیہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب؛ محلہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے، احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفاعنہ ۱۰ ر صفر ۴۵ھ،

پیش امام تیمم سے جماعت کرا سکتا ہے یا نہیں ؟

سوال (۵۴) پیش امام تیمم سے جماعت کرا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب، اگر امام نے کسی عذر سے تیمم کیا ہے تو شیخینؒ کے نزدیک اس کی امامت صحیح ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک صحیح نہیں، اس لئے بہتر ہے کہ کسی اور شخص متوضی کو امام بنایا جاوے، البتہ اگر اور کوئی شخص امامت کے قابل موجود نہ ہو تو خود ہی پڑھاوے، اور نمازِ جنازہ میں بالاتفاق امامت متیمم جائز ہے فی الدر المختار (وصح اقتداء متوضئ) لا ماء معه (بمتیمم) وقال الشامی ای عندھما وقال محمدؒ لا یصح فی غیر صلوٰۃ الجنازۃ (ص ۶۱۵، ج ۱) احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفاعنہ ۲۹ ربیع الثانی ۴۵ھ

مواضع وقف کے علاوہ وقف کرنیوالے کی نماز اور اس کی اقتداء کا حکم

سوال (۵۵) اگر قاری نے حالتِ نماز میں اضطراراً ایسے موقع پر وقف کر کے اعادہ لفظ موقوف کا کیا جہاں پر اوقاف معتبرہ میں سے کوئی وقف نہیں ہے، تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے، زید کہتا ہے کہ فقہاء نے تکرار کو مکروہ لکھا ہے، اور اس نے لفظ موقوف کا تکرار کیا، لہذا نماز مکروہ ہوئی، نیز ایسے شخص کی امامت جائز نہیں، ثبوت میں فتاوی عالمگیری باب الامامۃ کی یہ عبارت پیش کرتا ہے، ومن یقف فی غیر مواضعہ ولا یقف فی مواضعہ لا ینبغی لہ ان یؤم

اب گذارش یہ ہے کہ تکرار کا اطلاق اعادہ لفظ موقوف پر بھی ہوتا ہے یا نہیں، اگر ہو تو ابتداء مابعد سے کرنی ہوگی، اور یہ صورت قراء کی تصریح کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ وہ لوگ وقف قبیح پر اعادہ لازم کہتے ہیں، آیا یہ لزوم غیر نماز میں ہے یا نماز میں بھی، جواب بالتفصیل ارشاد فرماویں، بینوا توجروا

الجواب: حالتِ اضطرار میں ونفت اور تکرار کا مضائقہ نہیں اور ایک آدھ لفظ کے تکرار کو فقہاء نے مکروہ نہیں کہا، اور عالمگیریہ کی عبارت میں وہ شخص مراد ہے جو بلاضرورت بکثرت ایسا کرتا ہو، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ، **الجواب صحیح** ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ رجب ۱۳۴۸ھ

جب صف میں جگہ نہ ہو تو بعد میں آنیوالا تنہا کھڑا ہو یا کیا کرے؟؟ **سوال** (۵۱) .... جماعت میں پوری صف ہونے کے بعد اگر کوئی شخص آوے اور داہنی بائیں صف میں جگہ باقی نہ ہو تو بائیں جانب سے کسی مقتدی کو کھینچے یا داہنی جانب سے یا بیچ سے، اندیشۂ فساد کی جگہ تو تنہا پیچھے کھڑا ہونا چاہیئے، مگر جہاں اہل علم ہوں وہاں کس طرف سے کھینچے،

الجواب: جب صف میں جگہ نہ ہو تو تنہا صف میں کھڑا ہونا مکروہ تو ہے نہیں جیسا کہ عالمگیری میں محیط سے بروایت محمد بن شجاع وحسن بن زیاد عن ابی حنیفۃ رحمۃ اللہ علیہ ہے، اور صف سے کسی کو کھینچنے میں اندیشہ ہو اور کھینچنا ضروری ہے نہیں فقط اولیٰ ہے، اس واسطے فقہاء نے اب اس سے مطلقاً منع کردیا ہے، اور تنہا کھڑا ہونے کو اولیٰ قرار دیا، فی الطحاوی علی مراقی الفلاح الاصح انہ ینتظر الی الرکوع فان جاء رجل والاجذب الیہ رجلاً ودخل فی الصف والقیام وحدہ اولیٰ فی زماننا لغلبۃ الجھل فلعلہ اذا جرہ تفسد صلوٰتہ، اور اس میں یہ تفصیل کہ اگر عالم بالاحکام ہو تو اس کو کھینچ لے ورنہ نہیں قیل کے ساتھ نقل کی ہے، اور ایسے موقع پر اندیشۂ فساد کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ عین اس وقت اس شخص سے فسادِ صلوٰۃ متوہم ہو جس کو کھینچنا چاہتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کو شائع کرنے سے اور اس پر عمل کرنے سے اندیشہ ہے کہ عوام اپنی نمازیں توڑلیں گے، غلبۂ جہل سے اس طرف اشارہ ہے کہ گو قلیل مقدار میں عالم ہیں، مگر کثرت کے اعتبار کرکے سب جگہ یکساں عمل کریں گے واللہ اعلم، باقی رہی یہ بات کہ اگر کوئی بناء برجواز کسی عالم بالاحکام کو کھینچنا چاہے تو کس جگہ سے کھینچے تو اس کا جزئیہ تو ملا نہیں، لیکن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ رکوع تک انتظار کرے کہ شاید کوئی نمازی آجاوے، اور اگر نہ آوے تو درمیان سے کھینچے، کیونکہ اس میں ایک ہی خرابی ہے، کہ صف مقدم میں جگہ خالی رہے گی، اور کنارہ سے کھینچنے میں اس کے علاوہ یہ بھی

۷ے اس کے ساتھ ہی ایک قید مراقی الفلاح میں یہ بھی ہے لایتأذی بہ ۱۲ منہ

خرابی ہے کہ صف آخر درمیان سے شروع نہ ہوگی، اور جب ہر کہ دونوں جگہ عالم بالاحکام موجود ہوں، ورنہ جہاں ہو وہیں سے گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اسلم یہی ہے کہ تنہا کھڑا ہو جائے، اور قواعد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کھینچنے کے بعد اگر کوئی شخص آجاوے تو جدید آنیوالے کو چاہئے کہ صف مقدم میں جو جگہ خالی ہوا اس کو پُر کرے، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۱۷ر رمضان ۴۸ھ

مسجد کی چھت پر بلاضرورت جماعت کرنا مکروہ ہے،

سوال (۵۷) .... بوجہ گرمی امام دالانِ مسجد اور صحنِ مسجد کو چھوڑ کر مسجد کی چھت پر جا کر جماعت کرے تو اس کا یہ طرز عمل از روئے شرع شریف صحیح ہوگا یا خلاف اور نماز ایسی صورت میں ہو جاوے گی، یا دوبارہ پڑھنی پڑے گی، اس کا جواب باصواب با تشریح مع حوالہ جات تحریر فرمائیں، بینوا توجروا؟

الجواب: نماز صحیح تو ہو جاوے گی، دوبارہ پڑھنے کی کوئی وجہ نہیں، مگر بلاضرورت مسجد کی چھت پر جانا اور نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس واسطے اس سے پرہیز کرنا چاہئے، کما قال العلامۃ الشامی رحمہ اللہ تعالیٰ تحت قول التنویر (والوطئ فوقہ) ثم رأیت القھستانی نقل عن المفید کراھۃ الصعود علی المسجد اھ ویلزمہ کراھۃ الصلوٰۃ ایضاً فوقہ فلیتامل، اور گرمی کی شدت بھی ضرورت اور عذر میں داخل ہے یا نہیں اس کی تصریح نہیں ملی، مگر بظاہر[۱] عذر نہیں معلوم ہوتا، اس لئے احقر کے نزدیک چھت پر جماعت کرنا مکروہ ہے وہو الاحوط، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ، ۱۲ر ربیع الاول ۵۱ھ

تورک واعتماد معذور اور ایسے شخص کی اقتداء کا حکم

سوال (۵۸) ایک شخص امام مسجد مقرر ہے اب اس امام کو کوئی مرض لاحق ہوا ہے، جس کی وجہ سے جلوس عورتوں کی طرح پیر ایک طرف نکال کر کرتا ہے، نیز بیٹھک اور ٹھک میں ہاتھ سے ٹیک لگاتا ہے، ایسے شخص کو امام مقرر رکھنا کیسا ہے، اور ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے، اگر کراہت ہے تو کیسی؟

الجواب: اس کی امامت درست ہے، کچھ کراہت نہیں، تورک واعتماد غیر معذور کے لئے مکروہ ہے، معذور کے لئے مکروہ نہیں، فقد فعلہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین بدن لکبرہ، ۲۰ر محرم ۴۹ھ

---

[۱] چونکہ یہ جزئیہ کہیں مصرح نہیں؟ اس لئے دوسری جگہ بھی تحقیق کر لیا جاتے ۱۲ منہ

فصل فی المسبوق اللاحق

مسبوق کی نماز کا حکم جبکہ وہ سجدۂ سہو میں امام کی متابعت کرے اور امام پر سجدۂ سہو واجب نہ ہو

سوال (۱) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے ایک مرتبہ جناب سے سجدۂ سہو کے متعلق دریافت کیا تھا، اگر بلاضرورت سجدۂ سہو کرلیا جاوے تو کیا نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے؟ چنانچہ جناب نے حسب ذیل فتویٰ صادر فرمایا:۔

(نقل فتویٰ) اگر مصلی سجدۂ سہو کی ضرورت سمجھ کر سجدۂ سہو کرے اور بعد میں معلوم ہو کہ سجدۂ سہو کی ضرورت نہ تھی تو اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب نہیں، الامداد کی عبارت میں دیکھوں تو اس کو حل کرسکتا ہوں، قال فی حاشیۃ نور الایضاح ولو تابع المسبوق امامہ فی سجود السہو فتبین انہ لاسہو علیہ فصلوٰۃ المسبوق جائزۃ عند المتاخرین وعلیہ الفتویٰ اھ (ص ۱۹۷) قلت وھذا فرع لصحۃ صلوٰۃ الامام فان صلوٰۃ المسبوق تفسد بفساد صلوٰۃ امامہ کما لایخفی، الامداد کی عبارت حسب ذیل غور فرمائیے، الامداد بابت ماہ رجب ۱۳۳۳ھ ص ۱۹)

(سوال) اگر اخریین میں کسی نے ضم سورۃ سہوا کیا اور اس نے سجدۂ سہو اس کو موجبِ سہو سمجھ کر کرلیا تو نماز ہو جائے گی یا نہیں، آیا سجدۂ بے ضرورت کو زیادت فی الرکن قرار دیکر اعادۂ صلوٰۃ لازم قرار دیں گے یا نہیں؟

(جواب) فی الدر المختار واجبات الصلوٰۃ ولفظ السلام مرتین فالثانی واجب وفیہ قبیل باب الاستخلاف ولو ظن الامام السہو فسجد لہ فتابعہ (ای المسبوق) فبان ان لاسہو فالاشبہ الفساد لاقتدائہ فی موضع الانفراد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وفی رد المحتار وفی الفیض وقیل لاتفسد وبہ یفتی وفی البحر عن الظہیریۃ قال الفقیہ ابو اللیث فی زماننا لاتفسد لان الجہل فی القراء غالب اھ، وفی الخلاصۃ اذا ظن الامام ان علیہ سہوا فسجد للسہو وتابعہ المسبوق فی ذلک ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سہوا فیہ روایتان اختلف المشایخ لاختلاف الروایتین واشہرھما ان صلوٰۃ المسبوق نفسہ وقال الامام ابو حفص الکبیر لا یفسد والصدر الشہید اخذ بہ فی واقعاتہ

ص ۶۳ ج ۱۶۴)

ان روایات سے امور ذیل مستفاد ہوئے، نمبر ۱ نماز ہوجائے گی، نمبر ۲، اگر دونوں طرف سلام پھیرا ہے تو اعادہ واجب نہیں اور ایک طرف سلام پھیرا ہے تو چونکہ ایک واجب یعنی سلام ثانی ترک کردیا اعادہ واجب ہوگا، نمبر ۳، اگر یہ شخص امام ہے تو اس کے ساتھ اگر کوئی مسبوق ہوا اور اس نے بھی سجدۂ سہو اور اس کے بعد قعدہ میں اس کا اقتداء کیا، اس مسبوق کی نماز درمختار کے قول پر اور وہی مقتضا قواعد کا بھی ہے فاسد ہوگئی لیکن اگر اس مسبوق کو اس فضول سہو کا پتہ ہی نہ لگا، تو یہ معذور ہے، اور میرے نزدیک صاحب فیض اور ابوالیث کے حکم عدم فساد کا محمل اسی کو قرار دیا جاوے تو بہتر ہے کہ جب مسبوق کو پتہ نہ لگے، پس دونوں قولوں میں تطبیق ہوجاوے گی،

الجواب: مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ، جناب کا والا نامہ موصول ہوا تھا، میں سفر میں تھا، اس لئے دیر ہوئی، پھر حضرت مولانا سے دریافت کا موقعہ نہ ملا، کہ آج آپ کا دوسرا خط موصول ہوا تو میں نے اس کی بابت حضرت مولانا سے عرض کیا، حضرت کے ارشاد کے بعد جو رائے میری قائم ہوئی وہ یہ ہے کہ الامداد میں قواعد کے موافق جواب دیا گیا ہے، اور احقر نے متأخرین کے قول مفتیٰ بہ کے موافق جواب دیا ہے، رہا سلام کا مسئلہ تو الامداد میں ایک سلام کے بعد نماز کو ختم مانا ہے، اور دوسرا سلام گویا فوت ہوا اور میرا یہ خیال ہے کہ ایک سلام کے بعد جب سجدۂ سہو کیا گیا پھر دونوں طرف سلام پھیرا گیا تو اس سلام سے سلام ثانی کی قضا ہوگئی، گویا کہ سلام ثانی فوت نہیں ہوا، بلکہ مؤخر ہوا، رہا یہ کہ اس تاخیر سے سجدۂ سہو دوبارہ لازم ہونا چاہئے، اس کا جواب ظاہر ہے کہ ایک بار سجدۂ سہو تمام سہوات کے لئے کافی ہے، بہرحال اس صورت میں اعادۂ صلوٰۃ واجب نہیں، ہذا ما علمتہ واللہ اعلم، دوسرے علماء سے بھی تحقیق کرلیں اور جو محقق ہو اس سے مجھے بھی اطلاع دیں،

فقط ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ

مسبوق نے غلطی سے سلام پھیر دیا اور پھر کسی کے کہنے پر کھڑا ہوگیا

سوال (۲) امام نے سلام پھیرا اور مسبوق نے نادانی یا سہو سے سلام پھیر دیا یا چپ بیٹھا رہا تب امام یا دوسرے مقتدی کے (جو اب خارج نماز میں ہی) بتلانے سے وہ خیال کیا کہ نماز باقی رہی باقی پڑھی، یہ درست ہوئی یا نہ؟

الجواب: اس حالت میں سلام پھیرنے سے نماز فاسد نہیں ہوئی، اور مقتدی

خارج صلوٰۃ یا امام فارغ عن الصلوٰۃ کے بتلانے سے اگر مسبوق کو یاد آگیا اور اپنی یاد پر کھڑا ہوا تو نماز فاسد نہیں ہوئی بشرطیکہ کوئی عمل منافی صلوٰۃ نہ کیا ہو، پس اگر امام کے سلام کے بعد فوراً بتلانے سے کھڑا ہوا تب تو سجدۂ سہو بھی نہیں، اور تین سبحان اللہ کی مقدار دیر ہوئی تو سجدۂ سہو لازم ہے، ۲ر جمادی الثانیہ ۴۱ھ

مسبوق اگر امام کے ساتھ سلام پھیر دے تو کیا حکم ہے؟

سوال (۳) اگر مسبوق نے امام کے ساتھ سجدۂ سہو میں یہ سمجھ کر سلام پھیرا کہ مجھ کو بھی دیگر مقتدیوں کی طرح سلام پھیرنا چاہئے تو اس کا کیا حکم ہے، اور سہواً سلام پھیرا تو کیا حکم ہے؟

الجواب: قال فی الدر ولو سلم (المسبوق) ساهيا ان بعد امامه لزمه السهو والا لا قال الشامی قوله ولو سلم ساهيا قيد به لانه لو سلم مع الامام على ظن ان عليه السلام معه فهو سلام عمد فتفسد كما فى البحر عن الظهيرية اھ ص ۶۴۶ ج ۱ وفی الخلاصة المسبوق اذا سلم مع الامام على ظن ان عليه ان يسلم مع الامام فهو سلام عمد ای يمنع البناء اھ ص ۱۶۹ ج ۱، صورت اولیٰ میں جب کہ مسبوق نے سلام سہو میں امام کی متابعت عمداً کی ہے مسبوق کی نماز فاسد ہوگئی، اور صورت ثانیہ میں جبکہ سہواً سلام پھیر دیا تو حکم یہ ہے کہ اگر یہ سلام امام کے ساتھ پھیرا تب تو مسبوق پر کچھ نہیں، لکونه مقتديا فی هذه الحالة وسهو المقتدی لايوجب شيئا، اور اگر امام کے بعد سلام پھیرا تو مسبوق کے ذمہ سجدۂ سہو لازم آئے گا، لکونه منفردا فی هذه الحالة وسهو المنفرد يوجب سجود السهو، میں کہتا ہوں کہ مقتضیٰ قیاس کا یہ ہے کہ اس صورت میں بھی مسبوق پر سجدۂ سہو لازم نہ آوے، کیونکہ اگر اس نے امام کے بعد بھی سلام پھیرا ہے جب بھی وہ شرکت سجود سہو کی وجہ سے حالت اقتداء کی طرف لوٹ آیا تو یہ سہو بھی سہو منفرد نہیں بلکہ سہو مقتدی ہے وهو لايوجب شيئا قال الطحطاوی فی حاشية مراقی الفلاح اما سلامه بعد سلام الامام من سجود السهو فلا يلزم به سهو لانه لما سجد للسهو معه عاد الى الاقتداء ولا سهو على المقتدی فتأمل فيه کلام ۲۶۹/ ج ۱، ۲ر شعبان ۴۱ھ

امام کے ساتھ ایک رکعت پانیوالے مسبوق پر ایک رکعت ادا کرنیکے بعد قعدہ لازم ہے یا نہیں؟

سوال (۴) درمختار کی اس عبارت فمدرک رکعة من غير فجر يأتي بركعتين بفاتحة وسورة وتشهد بينهما سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ثلاثی اور رباعی نماز کی ایک رکعت پانے والے مسبوق ایک رکعت تسلیم

امام کے بعد پڑھ کر وجوباً قعدہ کرے اور تشہد پڑھے، اور اگر نہ کیا تو سجدہ سہو کرنا چاہئے، ورنہ کراہۃ تحریمی ہوگی اور تشہد بینہما کے تحت میں علامہ شامی نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ قال فی شرح المنیۃ ولولم یقعد جاز استحسانا لا قیاسا ولم یلزمہ سجود السہو لکون الرکعۃ اولیٰ من وجہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قعدہ اور تشہد مذکورہ واجب وضروری نہیں، ورنہ سجدۂ سہو یا اعادہ واجب ہوتا، اگر ترک کی صورت میں نماز مکروہ تحریمی اور واجب الاعادہ ہوتی ہے یا سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے، تو حضور تکلیف فرما کر اثباتِ مدعیٰ کے لئے کوئی عبارۃ علاوہ ان عبارات کے تحریر فرماویں تاکہ اطمینان ہو ورنہ متن وشرح کی عبارت کی توجیہ فرمادیں کہ بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں،

الجواب: قال فی الدر فی احکام المسبوق ویقضی اول صلوٰتہ فی حق قرأۃ واٰخرہا فی حق تشہد اھ وفی رد المحتار ہذا قول محمدؒ کما فی مبسوط السرخسی وعلیہ اقتصر فی الخلاصۃ وشرح الطحاوی والاسبیجابی والفتح والدر والبحر وغیرہم وذکر الخلاف کذلک فی السراج لکن فی صلاۃ الجلابی ان ہذا قولہما وتمامہ فی شرح الشیخ اسمٰعیل وفی الفیض عن المستصفی لوادرکہ فی رکعۃ الرباعی یقضی رکعتین بفاتحۃ وسورۃ ثم یتشہد ثم یاتی بالثالثۃ بفاتحۃ خاصۃ عند ابی حنیفۃؒ وقالا رکعۃ بفاتحۃ وسورۃ وتشہد ثم رکعتین اولاہما بفاتحۃ وسورۃ وثانیتہما بفاتحۃ خاصۃ وظاہر کلامہم اعتماد قول محمدؒ اھ ص ۴۲۳ و ۴۲۴ ج ۱،

وفی کتاب الاٰثار لمحمد قال اخبرنا ابو حنیفۃ رح عن حماد عن ابراہیم ان مسروقا وجندبا دخلا فی صلوٰۃ الامام فی المغرب فادرکا معہ رکعۃ وسبقہما برکعتین فصلیا معہ رکعۃ ثم قاما یقضیان فاما مسروق فجلس فی الرکعۃ الاولیٰ التی قضی واما جندب فقام فی الاولیٰ وجلس فی الثانیۃ فلما انصرفا اقبل کل واحد علی صاحبہ ثم انہما تساوقا الی عبد اللہ بن مسعود فقصا علیہ القصۃ فقال کلا کما قد احسن وان اصلی کما صلی مسروق احب الی قال محمدؒ وبقول ابن مسعودؓ ناخذ یجلس فی الرکعتین جمیعا اللتین فاتاہ وہو قول ابی حنیفۃ رح اھ ص ۲۷،

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ درمختار میں جو قول نقل کیا ہے وہ افضل ہے، اور اگر ثلاثی درباعی نماز کی ایک رکعت پانے والا مسبوق تسلیم امام کے بعد ایک رکعت پڑھ کر قعدہ نہ کرے بلکہ دو رکعت کے بعد قعدہ کرے تو یہ بھی جائز ہے، اور سجدۂ سہو لازم نہیں آئیگا واللہ اعلم، ۲۳ رشوال ۱۳۴۱ھ،

امام اگر چار رکعت کے بعد سہواً کھڑا ہوجائے تو کیا مسبوق اس کی اقتدار کرے،

سوال (۵) چار رکعت والی نماز میں اگر امام قعدہ اخیرہ کرکے سہواً کھڑا ہوجائے، اور دو رکعت اور منضم کرلے تو ان دو رکعت میں مسبوق اس امام کی اقتدار کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور در صورت جواز یہ دو رکعت مسبوق کے...... حق میں کیا ہوگی؟

الجواب: قعدۂ اخیرہ کے بعد اگر امام سہواً کھڑا ہوجائے تو مسبوق کو اس زائد نماز میں اقتدار جائز نہیں، اگر اقتدار کرے گا تو مسبوق کی نماز فاسد ہوجائے گی، قال فی الدر ولو قام امامہ لخامسۃ فتابعہ ان بعد القعود تفسد والا لا اھ قال الشامی قولہ تفسد ای صلوٰۃ المسبوق لانہ اقتداء فی موضع الانفراد اھ (ص ۶۲۶ ج ۱) واللہ اعلم، ۴ رذی الحجہ ۱۳۴۱ھ

مسبوق کی نماز کا حکم جبکہ امام کے ساتھ سجدۂ سہو کرے، حالانکہ امام پر سجدۂ سہو واجب تھا

سوال (۶) فرض نماز میں اگر امام نے سجدہ سہو کیا، اور پھر معلوم ہوا کہ جس صورت میں سجدۂ سہو کیا ہے، اس میں سجدۂ سہو واجب نہیں تھا، یعنی کوئی واجب ترک نہیں ہوا تھا، تو اس صورت میں جو ایسے مقتدی ہیں جن کی کوئی رکعت جماعت سے جاتی رہی ہے، مثلاً ایک یا دو رکعت ہونے کے بعد شریکِ جماعت ہوئے ہیں، اور امام کے ساتھ انھوں نے بھی سجدۂ سہو کیا ہے، تو ان کی نماز میں کچھ نقص تو نہ ہوگا؟

الجواب: اس میں دو روایتیں ہیں، ایک روایت میں مسبوق کی نماز فاسد ہے، اور دوسری میں فاسد نہیں، کما فی الخلاصۃ (ص ۱۶۳ ج ۱) اور عموم بلویٰ کی وجہ سے میں دوسری صورت میں فتویٰ دیتا ہوں، ۲ رجمادی الثانیہ ۱۳۴۴ھ

نمازِ مغرب میں امام نے سہواً چوتھی رکعت ملا کر سلام پھیر دیا اور دوبارہ نماز پڑھائی تو جو لوگ پہلی جماعت کی دوسری یا بعد کی رکعتوں میں شریک ہوئے تھے کیا وہ دوسری جماعت میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

سوال (۷) امام نے مغرب کی نماز قاعدہ کے موافق تین رکعت پوری کرکے چوتھی رکعت سہواً اور پڑھادی

بعد سلام کے مقتدیوں نے یاد دلایا کہ چار رکعت ہوئی ہیں، امام نے یہ سن کر دوبارہ پھر نماز پڑھادی، سو یہ نماز یقیناً ادا ہوگئی ہوگی، اب اس میں دو بات اور قابلِ تحقیق ہیں،

(۱) پہلی نماز میں جو لوگ دوسری یا تیسری یا چوتھی رکعت میں آکر شریک ہوئے تھے وہ بھی اس اعادہ میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں (۲) جو لوگ اس اعادہ میں والی نماز میں از سر نو شریک ہوئے ہیں ان کی نماز بھی ہوجاوے گی یا نہیں؟

الجواب: اس کے متعلق جزئیہ تو نہیں ملا، لیکن قواعد سے اختلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز سے ادون ہونے کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں، اور صورتِ مذکورہ فی السوال میں اعادہ کیا جاوے تو اس میں یہ اختلاف ہے کہ دوسری نماز یا فرض واقع ہوگی یا نماز اوّل کے لئے جابر ہوتی ہے، اس لئے اعادۂ مذکورہ کے وقت کسی نئے آدمی کی اقتداء میں اختلاف ہوگا، اور چونکہ مختار قول ثانی ہے، کما صرح فی الدر مع شرحہ ص ۴۷۶ ج ۱، اس لئے اقتداء نہ کرنا مختار ہوگا، اور جس شخص نے چوتھی رکعت میں اقتداء کی ہے چونکہ اس کی اقتداء صحیح نہیں ہوئی، (کما فی الشامی ص ۴۸۲ ج ۱) تتمہ، لو اقتدی بہ مفترض فی قیام الخامسۃ بعد القعود قدر التشہد لم یصح ولو اعاد الی القعدۃ[ف] اس لئے وہ اس شخص کے مانند ہی جو پہلی نماز میں بالکل شامل نہیں ہوا، اور دوسری تیسری رکعت میں شامل ہونے والوں نے اگر اپنی وہ رکعت جس میں یہ مسبوق ہیں ادا کرلی ہے تب تو جماعت ثانیہ میں شریک ہوجادیں، اور اگر دوسری جماعت کی تیاری سن کر انھوں نے نماز توڑدی ہے تو وہ بھی نئے اشخاص کے حکم میں ہوں گے، کما لا یخفی، واللہ اعلم،

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ،

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ

حکم اقتداء مسبوق بوقت سلام امام

سوال (۸) اگر مسبوق نمازی جماعت میں ایسے وقت آکے ملے کہ وہ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے صرف نیت ہی باندھنے پایا یا قعدہ میں ملنے کے لئے کچھ تھوڑی ہی جھکا تھا، مگر قعدہ نہ مل سکا، اور امام نے سلام پھیر دیا، تو یہ فرمائیے کہ وہ مسبوق نمازی جماعت میں شامل ہوا یا نہیں، اگر جماعت میں شامل ہوا نہیں تو اسی نیت سے اپنی نماز فرداً پوری کرے، یا پھر سے علیحدہ نماز کی نیت کرے؟

الجواب، قال فی الدر لو کبر قائما فرکع ولم یقف صح لان ماأتی بہ الی ان یبلغ الرکوع یکفیہ، قنیہ ص ۴۶۳ ج ۱ و فی الشرنبلالیۃ والثانی من شرط

ف یعنی جب کوئی واجب ترک ہوا ہو، ۱۲

صحۃ التحریمۃ الاتیان بالتحریمۃ قائما اومنحنیا قلیلا قبل وجود انحناء بما ھو اقرب للرکوع قال فی البرھان لو ادرک الامام راکعا فحنی ظھرہ ثم کبر ان کان الی القیام اقرب صح الشروع ولو اراد بہ تکبیر الرکوع وتلغو نیتہ لان مدرک الامام فی الرکوع لایحتاج الی تکبیر مرتین خلافا لبعضھم وان کان الی الرکوع اقرب لایصح التحریمۃ اھ ص ۱۲۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے لئے بقدر اللہ اکبر قیام کافی ہے، زیادہ کی ضرورت اس وقت ہے جبکہ مصلے پر تحریمہ کے بعد قیام بھی فرض ہو، صرف صحتِ تحریمہ کے لئے اور ادراکِ رکوع وغیرہ میں قیام زائد علی قدر اللہ اکبر لازم نہیں، پس اگر سلام امام سے پہلے نیتِ صلوٰۃ کے بعد اللہ اکبر کہہ لے تو اقتداء صحیح ہوگئی، گو جھکنے بھی نہ پایا ہو، بیٹھنے بھی نہ پایا ہو، اور اللہ اکبر کے بعد وقفہ بھی نہ ہوا ہو، واللہ اعلم، ۲۲ صفر ۱۳۴۶ھ

مسبوق امام کے قعدۂ اخیرہ میں تشہد درود دونوں پڑھے یا فقط تشہد پر اکتفاء کرے،

سوال (۹) مسبوق قعدۂ اخیرہ میں تشہد اور درود شریف دونوں پڑھے یا فقط تشہد یا ساکت رہے، اور دعاء ماثورہ پڑھے یا نہیں؟

الجواب: غالباً قعدۂ اخیرہ سے مراد وہ قعدہ ہے جو امام کا قعدۂ اخیرہ ہے، سو اس میں مسبوق کو صرف تشہد پڑھنا چاہیئے، خواہ تشہد کو آہستہ آہستہ ٹھہرا کر اس طرح پڑھے کہ سلام امام تک ممتد ہوجائے یا تشہد کو مکرر پڑھتا رہے، اس پر درود و دعاء کا اضافہ نہ کرے، ۱۴ رجب ۱۳۴۷ھ

امام قعدۂ اخیرہ کے بعد سہواً پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوجائے اور مسبوق امام سے علیحدہ اپنی نماز پوری کردے تو سجدۂ سہو میں امام کیساتھ شریک ہو یا نہیں، اور شریک ہوجائے تو اس کی نماز ہوجائے گی یا فاسد ہوگی؟

سوال (۱۰) مسبوق کا امام قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھ کر سہو سے پانچویں رکعت کو کھڑا ہوگیا مسبوق بعد کھڑے ہوجانے کے امام کے اپنی بقیہ نماز امام سے علیحدہ ہوکر پڑھنی شروع کردے۔ اور امام نے ابھی تک پانچویں رکعت کا سجدہ بھی نہ کیا تھا مگر امام پانچویں رکعت کا رکوع کرچکا تھا اور اس مسبوق نے اپنی بقیہ نماز کی امام سے علیحدہ ہوکر مع رکوع سجدہ کے ایک رکعت پوری کرلی اور امام کو پانچویں رکعت کا رکوع کرنے کے بعد پانچویں رکعت میں ہونا یاد آیا اور امام سجدۂ سہو کی طرف لوٹا تو یہ مسبوق ایک رکعت

علیحدہ پڑھنے کے بعد سجدۂ سہو میں امام کا شریک ہووے یا نہیں، اور اگر شریک ہو گیا ہو تو اس مسبوق کی نماز فاسد ہو گی یا نہیں، اور اگر شریک نہ ہوا تو یہ مسبوق اپنی بقیہ نماز پوری کرکے قعدۂ اخیرہ میں سجدۂ سہو کرے یا نہیں، اور اگر شریک نہ ہوا اور سجدۂ سہو بھی نہ کیا تو مسبوق کی نماز فاسد ہو جاوے گی یا نہیں؟ مفصل تحریر فرما دیجئے گا،

الجواب: قال فی الخلاصۃ الامام اذا قام الی الخامسۃ وتابعہ المسبوق ان کان قعد الامام علی الرابعۃ تفسد صلوٰۃ المسبوق وان لم یکن قعد لا تفسد حتی یقید الخامسۃ بالسجدۃ فان قید فسدت صلوٰۃ الکل اھ (ص ۱۶۴ ج ۱)

وفی الدر ولو اتم امامہ لخامسۃ فتابعہ ان بعد القعود تفسد والا لا اھ

قال الشامی تفسد ای صلوٰۃ المسبوق لانہ اقتداء فی موضع الانفراد ولان اقتداء المسبوق بغیرہ مفسد کما مر وقولہ والا لا، لان ما قام الیہ الامام علی شرف الرفض ولعدم تمام الصلوٰۃ اھ (ص ۶۲۶ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اگر قعدہ اخیرہ میں تشہد پڑھ کر پانچویں رکعت کی طرف کھڑا ہو جاوے تو اب مسبوق کو اس کا اتباع نہ کرنا چاہیئے، بلکہ اس سے علیحدہ ہو کر اپنی نماز پوری کر لینا چاہیئے، اور اگر اس نے پانچویں رکعت میں امام کی موافقت کی تو اس کی نماز فاسد ہو جاوے گی، اور عدم موافقت کی صورت میں مسبوق پر سجدۂ سہو لازم نہ آوے گا، کیونکہ امام پر یہ سہو ایسی حالت میں لازم آیا ہے، جبکہ مسبوق منفرد ہو چکا ہے، اور اگر امام خامسہ کے سجدہ سے پہلے سجدۂ سہو کی طرف لوٹ آوے جب بھی مسبوق اس کی موافقت نہ کرے بلکہ اگر موافقت کریگا نماز فاسد ہو جاوے گی، ۵ر شوال ۴۷ھ

سوال (۱۱) مسبوق کے اقتدا کر کے بیٹھتے ہی امام نے سلام پھیر دیا، اب وہ مسبوق تشہد پڑھ کے کھڑا ہو گا یا کیا کرے گا؟

مسبوق کے شامل جماعت ہوتے ہی امام سلام پھیر دے تو وہ تشہد پڑھے یا نہیں؟

الجواب: مسبوق کے شامل ہوتے ہی اگر امام سلام پھیر دے تب بھی مسبوق کو تشہد پوری کرکے کھڑا ہونا چاہیئے، کما فی الدر (بخلاف سلامہ) او قیامہ الی الثالثۃ (قبل اتمام التشہد) فانہ لا یتابعہ بل یتمہ لوجوبہ ولو لم یتم جاز وقال الشامی ای ولو خاف ان تفوتہ الرکعۃ الثالثۃ مع الامام کما

صرح بہ فی الظہیریۃ وشمل باطلاقہ ما لو اقتدی بہ فی اثناء التشہد الاول او الاخیر فحین قعد قام امامہ او سلم ومقتضاہ انہ یتم التشہد ثم یقوم ولم ارہ صریحا ثم رأیتہ فی الذخیرۃ ناقلا عن ابی اللیث المختار عندی انہ یتم التشہد وان لم یفعل اجزأہ اھ وللہ الحمد (وقولہ جاز) ای صح مع کراھۃ التحریم کما افادہ ح ونازعہ ط والرحمتی الخ (ص ۵۱۱) قلت وکذا قولہ اجزأہ یحمل علی الاجزاء مع الکراھۃ کما لا یخفی، واللہ اعلم،

الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ ۲۷ ج ۱ ۱۳۴۵ھ، کتبہ الاحقر عبد الکریم ۲۷ ج ۱ ۱۳۴۵ھ

فصل فی الحدث فی الصلوٰۃ

خون غیر سائل ناک سے نکلنے کے بعد اگر ہاتھ سے پونچھا اور آخر نماز تک ہاتھ پر رہا تو نماز ہو جائے گی

سوال (۱) ایک شخص نے وضو کیا، بعد میں وہ نماز کے لئے کھڑا ہوا اور اس کو نماز کے اندر ناک کے اوپر سے خون نکلا اور جاری نہیں ہوا، اور اس نے نماز کے اندر ہاتھ سے پونچھا، اور ہاتھ پھر اخیر تک رہنے دیا، پھر نماز ختم کی، تو آیا اس صورت میں نماز ہوگئی یا نہیں؟ اس کو مع کتاب کے حوالے کے جواب دیدیں،

الجواب: قال فی الدر الکنز وغیرہما لیس بحدث فلیس بنجس، صورت مسئولہ میں نماز درست ہوگئی، کیونکہ جب خون بہا نہیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹا، اور جس چیز کے نکلنے سے وضو نہ ٹوٹے وہ پاک ہے، تو یہ خون پاک تھا، اس کے ہاتھ میں لگے رہنے سے نماز میں خرابی نہ آئے گی، ۳۰ محرم ۴۵ھ

فصل فیما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا،

نماز میں چیخنے، چلانے اور اچھلنے کودنے کا حکم،

سوال (۱) .... ضلع بریسال میں ایک فرقہ درویش چشتیہ طریقہ کا ہے، ان لوگوں میں ایک عجیب حال یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ گاہ بگاہ چیخیں مارتے ہیں اور یہ حال نماز میں زیادہ ہوتا ہے، کبھی ہا ہا کبھی ہو ہو کر کے چیخ مارتے ہیں، مطلب یہ کہ رنگ برنگ کی چیخیں مارتے ہیں، اگر کوئی اجنبی آدمی ان لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہو تو وہ ڈر کے مارے نماز کی اقتدا بھی چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ عجیب آواز ہوتی ہے، لوگ اس سے خوفزدہ

ہوجاتے ہیں، اور کوئی کبھی نماز میں سامنے کی طرف بڑھ جاتا ہے، اور کبھی پیچھے کی طرف ہٹ جاتا ہے، اور کبھی کود کر اوپر کی طرف اُٹھ جاتا ہے، جس میں دونوں پاؤں زمین سے علیحدہ ہوجاتے ہیں، اور کبھی نماز میں تالیاں بجاتا ہے، اور کبھی التحیات یا قراءت میں سے چند لفظوں کو بلند آواز سے اور باقی خفی، ان لوگوں سے اگر دریافت کیا جائے تو جواب دیتے ہیں کہ یہ افعال ہم سے بلا اختیار ہوتے ہیں، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ افعال مذکورہ شریعت میں درست ہیں یا نہیں، اور ان لوگوں سے مرید ہونا اور ان لوگوں کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں، اور افعال مذکورہ میں سے کون کون مفسدِ صلوٰۃ ہیں، تحریر فرماویں؟

الجواب: اگر واقعی ان لوگوں سے یہ حرکات بے اختیار بحالتِ اضطرار صادر ہوتی ہیں جس کو اصطلاح صوفیہ میں غلبۂ حال کہتے ہیں تو اس کا حکم حسبِ ذیل ہے:-
(۱) چیخنے اور چلّانے اور قہقہہ مارنے سے نماز فاسد نہ ہوگی (۲) نماز میں آگے پیچھے ہٹنے سے بھی نماز فاسد نہ ہوگی، بشرطیکہ سینہ قبلہ ہی کی طرف رہے، قبلہ سے نہ پھرے اور بشرطیکہ ایک دفعہ میں مقدار صف سے زیادہ مشی نہ ہوتی ہو، گو متفرقاً زیادہ ہو جاتی ہو، (۳) زیادہ کودنے سے نماز باطل ہوجاوے گی، لانہ کالاستدبار فی کونہ منافیاً (۴) تالیاں بجانے سے نماز فاسد نہ ہوگی، لانہ کالتصفیح وہو مشروع للنساء (۵) التحیات یا قرأت میں سے اگر کسی قدر حصہ کو جہر سے پڑھ دیں تو نماز فاسد نہ ہوگی، لانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یجہر بالآیۃ احیاناً فی الظہر وفی الحدیث من السنۃ اخفاء التشہد قلت وہو لیس بواجب فاذا جہر بہ عمداً لاتفسد فکیف اذا جہر بہ لعذرٍ قال فی مراقی الفلاح ولا تفسد بحصولہا ای بحروف مسموعۃ (من ذکر جنۃ او نار اتفاقاً لدلالتہا علی الخشوع اھ، قال فی الحاشیۃ لو اعجبتہ قراءۃ الامام فبکی وقال نعم او بلیٰ لا تفسد ولو وسوسہ الشیطان فحوقل ان لامور الآخرۃ لاتفسد وان لامور الدنیا فسدت اھ (ص ۱۹۰) قال ویفسدہا التنحنح بلا عذر لما فیہ من الحروف وان کان لعذر کمنعہ البلغم من القراءۃ لایفسد وفی الحاشیۃ للطحطاوی ومحل الفساد بہ عند حصول الحروف اذا امکنہ الامتناع عنہ اما اذا لم یمکنہ الامتناع عنہ فلا تفسد بہ عند الکل کالمریض اذا لم یمکنہ منع نفسہ عن الانین والتاوہ لانہ حینئذ

کالعطاس والجشاء اذا حصل بهما حروف اھ (ص ۱۸۹) ای ولم یمکنه دفعه،
وفیه ایضا وذکر المحقق ابن امیر حاج ما حاصله ان المشی لا یخلو اما ان
یکون بلا عذر او یکون بعذر فان کان بلا عذر فان کان کثیرا متوالیا یفسد
صلوته سواء استدبر القبلة مع ذلک اولا لانه حینئذ عمل کثیر لیس
من اعمال الصلوٰۃ ولم تقع الرخصة فیه وان کان کثیرا غیر متوال بل تفرق
فی رکعات او تخلله مهلات فان استدبر معه القبلة فسدت لوجود المنافی
قطعا من غیر ضرورة وان لم یستدبر معه القبلة لم تفسد ولکن یکره لما
عرف ان ما افسد کثیره کره قلیله عند عدم الضرورة وان کان بعذر کان
لاجل الوضوء من الحدث فی الصلوٰۃ اولا نصرافه الی وجه العدو او رجوعه
من صلوٰۃ الخوف لا یفسد ولا یکره مطلقا سواء کان قلیلا او کثیرا استدبر
القبلة او لم یستدبر اھ (ص ۱۸۹) واللہ اعلم، اور یہ جواب اس وقت ہے جبکہ
یہ حرکات بالاضطرار صادر ہوتے ہوئے ان لوگوں کو ہوش باقی رہتا ہو، اور اگر ہوش بھی
نہیں رہتا اور اس درجہ بے خبری ہو جاتی ہے کہ اگر ریح صادر ہو جائے تب بھی اُن کو خبر
نہ ہو تو اس حالت میں نماز بھی فاسد ہو جائے گی اور وضو بھی، لانہ کالغشی والنوم
الثقیلین وبہما تفسد الصلوٰۃ لمظنة خروج الناقض، لیکن جب ان لوگوں کی ان حرکات سے
نمازیوں کو توحش اور خوف لاحق ہوتا ہے تو ایسے غلبۂ حال کی حالت میں ان لوگوں کو جماعت
سے نماز نہ پڑھنا چاہئے، اپنے گھر میں پڑھنا چاہئے، لما قد ورد فی الحدیث من اکل الثوم
فلا یقربن مصلانا وعلة النہی ایذاء المسلمین فیدخل تحته کل ما حصل به الایذاء،

رہا ان سے مرید ہونا تو اگر یہ لوگ متبعِ شریعت ہوں، اور کسی شیخ محقق نے ان میں
سے کسی کو مجاز و خلیفہ کر دیا ہو تو اس سے بیعت ہونا جائز ہے ورنہ نہیں، واللہ اعلم،
۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۱ھ،

بغیر ضرورت کے صرف بنیان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے،

سوال (۲): گنجی (بنیان) جو آجکل نہایت کثرت سے لوگ پہنتے ہیں مثل نیمہ کے کہنی کے اوپر ہوتا ہے اس کو پہن کر نماز بلا کراہت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جس شخص کے پاس کُرتہ نہ ہو اس کی نماز گنجی (بنیان) پہن کر بلا کراہت

درست ہی، اور جس کے پاس آستین والا کرتہ ہو اس کی نماز گنجی پہن کر بکراہت درست ہی، کیونکہ نماز میں کہنیوں کا بلا عذر کھولنا مکروہ ہے، نیز عادۃ صرف بنیان پہن کر مجالس عامہ میں جانا معیوب سمجھا جاتا ہے تو صاحبِ استطاعت کو ایسے لباس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، جس کو پہن کر مجالسِ عامہ میں وہ نہ جاسکے، واللہ اعلم، ۲۲ ذی الحجہ ۴۲ھ

نابینا کو نماز میں قبلہ رُخ کر دینا درست ہی یا نہیں؟

سوال (۳) . . . . ایک نابینا آدمی نے نماز کی نیت باندھی اور اس کا رُخ ٹھیک قبلہ کی طرف نہیں ہے تو اس صورت میں دوسرے آدمی کو زبان سے بتلانا یا ہاتھوں سے پکڑ کر اس کو قبلہ رُو کر دینا جائز ہے یا نہیں، بینوا توجروا،

الجواب: جائز ہے بشرطیکہ نماز شروع کرنے کے وقت کوئی بتلانے والا میسّر نہ ہو، اور اگر میسّر تھا اور پھر بدون پوچھے اندھے نے نماز شروع کر دی، تو وہ نماز اوّل ہی سے باطل ہے، بعد کا بتلانا اور قبلہ رُو کرنا مفید نہ ہوگا، قال فی العالمگیریۃ ولو اشتبہت القبلۃ فی المفازۃ فوقع اجتہادہ الی جہۃ فاخبرہ عدلان اذا کان من اہل ذلک الموضع لا یجوز لہ الا ان یاخذ بقولہما کذا فی الخلاصۃ اھ (ص ۳۹ ج ۱) وفیہا الاعمیٰ اذا صلی رکعۃ الی غیر القبلۃ فجاء رجل وحولہ الی القبلۃ واقتدی بہ ان لم یجد الاعمی (حین افتتح الصلوٰۃ) من یسئلہ جازت صلوٰۃ الامام (ای الاعمیٰ) وفسدت صلوٰۃ المقتدی اھ (ص ۴۰ ج ۱) مختصراً قلت ولکن دل الجزئیتان علی جواز نفس الاخبار والتحویل، واللہ اعلم، ۱۲ رجب ۴۳ھ

منبر کی سیڑھی پر سجدہ کرنے کا حکم

سوال (۴) ایک مسجد میں امام کے خطبہ پڑھنے کا جو منبر ہے اس کی ایک سیڑھی کچھ زیادہ آگے کو ہے، جس کی وجہ سے جو صف اوّل نمازیوں کی ہوتی ہے اس میں دو نمازیوں کو سجدہ اسی سیڑھی کے اوپر کرنا پڑتا ہے، اور یہ سیڑھی فرشِ مسجد سے پانچ گرہ اونچی ہے، اگر مجبوری ہے تو صرف اسی قدر ہو کہ ایسی صورت میں اندر کے درمیں بجائے تین صف کے دو صف ہوتی ہیں، اور اگر منبر کے سامنے جو سیڑھی ہے اسی قدر جگہ کو چھوڑ دی جائے تو صفیں تو ضرور تین ہوجاویں گی، لیکن درمیان میں دو نمازیوں کی جگہ خالی رہتی ہے، اور سلسلۂ صف شکستہ ہوتا ہے، اور یہ بات نہیں ہے کہ مسجد میں گنجائش نہیں ہے، بلکہ ضرورت سے زیادہ گنجائش ہے، لہٰذا اندریں صورت اُن دو نمازیوں

کی نماز صحیح ہوتی ہے اور جائز ہے یا کیا صورت ہے؟

الجواب: ایک بالشت اونچی سیڑھی پر سجدہ جائز ہے، اور وہ سیڑھی پانچ گرہ ہے، اس لئے نماز جائز نہیں ہوتی، فی العالمگیریۃ (ص۴۴ ج۱) اذا کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین بقدر لبنۃ او لبنتین منصوبتین جاز وان زاد لم یجز کذا فی الزاهدی واحد اللبنة ربع ذراع کذا فی السراج الوهاج، اور بلاضرورت صف میں جگہ چھوڑنا بھی مکروہ ہے، اس لئے اندر دو صف باندھی جائیں،

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۸ ربیع الثانی ۴۲ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ

قعدہ آخری میں تشہد پڑھنے کے بعد امام سہواً کھڑا ہوا مقتدی کے لقمہ دینے پر بیٹھ گیا اور تشہد پڑھ کر سجدۂ سہو کیا، اور پھر تشہد پڑھ کر سلام پھیرا، تو نماز ہوگئی یا نہیں؟

سوال (۴۲) ایک شخص قعدۂ اخیرہ میں بیٹھا اور تشہد پڑھنے لگا، اور تشہد پڑھنے کے بعد یہ سمجھ کر کھڑا ہوا کہ شاید دوسری رکعت یعنی قعدۂ اولیٰ ہے، مگر مقتدی کے آواز دینے سے بیٹھا اور پھر التحیات پڑھ کر سجدۂ سہو کیا، اور سجدۂ سہو کرنے کے بعد پھر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرا، ایسی حالت میں اس کی نماز کیسی ہوئی؟

الجواب: قال فی الدر وان قعد فی الرابعة مثلا قدر التشهد ثم قام عاد وسلم ولو سلم قائما صح اھ قال الشامی ای عاد للجلوس لما مر ان مادون الرکعة محل للرفض وفیه اشارة الی انه لا یعید التشهد وبه صرح فی البحر قال فی الامداد والعود للتسلیم جالسا سنة لان السنة التسلیم جالسا والتسلیم حال القیام غیر مشروع فی الصلوٰة المطلقة بلا عذر فیاتی به علی الوجه المشروع فلو سلم قائما لم تفسد صلاته وکان تارکا للسنة اھ (ص ۸۲ ج۱) قلت ومثال العذر ما اذا انتقض وضوءه وهو قائم فیسلم قائما ولا ینتظر القعود فان المضی فی الصلوٰة بعد انتقاض الوضوء لا یجوز واللہ اعلم وذکرت هذه المسئلة استطرادا للحاجة الیها واللہ تعالیٰ اعلم

اس صورت میں دوبارہ تشہد پڑھنے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ بیٹھتے ہی سلام پھیر کر سجدۂ سہو کر لینا چاہئے تھا، لیکن اگر بیٹھنے کے بعد دوبارہ تشہد پڑھ لیا، پھر سلام پھیر کر سجدۂ سہو کیا، جب بھی نماز صحیح ہوگئی، اور سجدۂ سہو اس تاخیر کا بھی جابر ہوگیا،

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم، یکم محرم الحرام ۱۳۴۶ھ

عورتوں کیلئے نماز میں عقص شعر مکروہ ہے یا نہیں؟

سوال (۵) زید دعویٰ می کند کہ درحالت عقص شعر نماز گذاردن مرمرداں را مکروہ است نہ زناں را زیرا کہ برین کراہت بحدیثے کہ صاحب ہدایہ وغیرہا استدلال کردہ اند، موردش مرداست نہ زن ونیز موئے سر زن حکم عضوے میدارد وبرین تقدیر اگر برائے سجدہ موئے زن موئے خود را بگذارد تا بوجہ برون شدن از پارچہ سر نمازش فاسد گردد، اما عمرو می گوید کہ در کراہت آں عقص شعر حکم مرد وزن یکسان است چرا کہ اگرچہ مورد حدیث مذکور خاص است لیکن حکمش عام لہٰذا فقہاء در جائے کہ حکم آں کراہت بمرداں تخصیص نہ کردہ اند،

الجواب؛ قال فی الدر فی باب المکروھات وعقص شعرہ اھ قال الشامی ای ضفرہ وفتلہ والمراد بہ ان یجعلہ علی ھامتہ ویشدہ بصمغ او یلف ذوائبہ حول رأسہ کما یفعلہ النساء فی بعض الاوقات او یجمع الشعر کلہ من قبل القفا ویشدہ بخیط او خرقۃ وجمیع ذلک مکروہ لما روی الطبرانی انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نھی ان یصلی الرجل ورأسہ معقوص اھ (ص ۶۷۱ ج ۱) وفی نیل الاوطار عن العراقی وھو مختص بالرجال دون النساء لان شعرھن عورۃ یجب سترہ فی الصلوٰۃ فاذا نقضتہ ربما استرسل وتعذر سترہ فتبطل صلاتہا اھ (ص ۲۳۵ ج ۲) قلت وقول العراقی لا تأباہ قواعدنا بل ھی تؤیدہ فان شعر النساء عورۃ عندنا ایضاً، پس دریں مسئلہ ہم قولِ زید نزد ما صحیح است، نہ قولِ واللہ اعلم،

(تنبیہ) دریک بار زاید از سہ سوال را جواب دادن اینجا قاعدہ نیست پس از بقیہ سوالات دوبارہ استفسار کنند اگر خواہند، ۸ محرم ۴۶ھ

نماز میں رونے کے متعلق بہشتی زیور کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال (۶) در مطلب ایں عبارت بہشتی زیور کہ اگر جنت ودوزخ کو یاد کرنے سے دل بھر آیا، اور زور سے آواز نکل پڑی تو نماز نہیں ٹوٹی، بحث شدہ است، کسے گوید کہ ایں آواز خاص است وکسی گوید عام، پس اگر خاص باشد حداوچہ وآں آواز اختیاری است، یا نہ ومراد از "دل بھر آنا" چیست؟ وامامت آں کس اگر متبع شریعت باشد درست است یا نہ،

للہٰ فرمودہ اجرش عند اللہ امانت دارند وبس،

الجواب: مراد ازیں عبارت گریۂ بے اختیاری است کہ بر ضبط آں قدرت نباشد الا بالحرج، پس ایں چنیں گریہ اگر از ذکر جنت و دوزخ یا از غلبۂ محبت خداوندی در حالت نماز طاری شود نماز فاسد نگردد اگرچہ بآواز بلند و صیاح مزید باشد قال المحقق فی الفتح تحت قول الھدایۃ فان ان فیھا او تاوہ او بکی فارتفع بکاءہ فان کان من ذکر الجنۃ او النار لم یقطعھا لانہ یدل علی زیادۃ الخشوع اھ، مانصہ وان حصل بہ الحروف اھ (ص ۳۴۷ ج ۱) وفی موضع آخر والصیاح ملحق بالکلام الذی بساطہ ذلک الصیاح وسیاتی انہ اذا ارتفع بکاءہ من ذکر الجنۃ والنار لا تفسد وان کان یقال ان المراد اذا حصل بہ الحروف ولو صرح بہ رای بالجنۃ والنار بسوالھا والعیاذ منھا) لاتفسد اھ ملخصا (ص ۳۲۲ ج ۱) پس گریہ راکہ بذکر آخرت باشد حدے نیست بجز آنکہ از قصد واختیار نباشد،[۱] واللہ اعلم، غرہ جمادی الثانی ۴۶ھ

مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟

سوال (۷) مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا کیسا ہے، مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر رمضان شریف میں ایک امام نیچے مسجد میں تراویح پڑھاتے اور دوسرا امام مسجد کی چھت پر پڑھاتے تو بلاکراہت جائز ہے یا نہیں، اگر مسجد میں دو درجہ یعنی دو منزلیں ہوں تو دوسرے درجہ کا چھت میں شمار ہوگا یا نہیں، فتاوی قاضیخان مطبوعہ نولکشور جلد اول صفحہ ۷۱ میں یہ عبارت ہے وکذا لوصلی علی السطح فی شدۃ الحر لقولہ تعالیٰ قل نار جہنم اشد حرا لوکانوا یفقھون، کیا اس عبارت سے چھت پر نماز پڑھنے کو مکروہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں،

الجواب: قال فی الدر وکرہ تحریما الوطأ فوقہ والبول والتغوط لانہ مسجد الی عنان السماء اھ قال الشامی ولھذا یصح اقتداء من علی سطح المسجد بمن فیہ اذا لم یتقدم علی الامام ولا یبطل الاعتکاف بالصعود الیہ ولا یحل للجنب والحائض والنفساء الوقوف علیہ ولو حلف لا یدخل ھذہ الدار فوقف علی سطحہ یحنث اھ (ص ۶۸۶ ج ۱) وایضا فان الفقہاء لم یذکروا فی مکروھات الصلوٰۃ سوی ظھر بیت اللہ اھ، مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ

[۱] دل علیہ قولہ فارتفع بکاءہ لم یقل رفع بکاءہ والقواعد تدل ایضاً،

نہیں کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، البتہ یہ جائز نہیں کہ جماعت سقف ہی پر ہونیچے کے درجہ میں نماز ہی نہ ہو، کیونکہ اصل مسجدیت میں داخلی حصہ ہی ہے، سقف کی مسجدیت تبعاً للتحت ہے پس داخلی حصہ میں نماز نہ ہونا صرف سقف پر ہونا مکروہ ہوگا، الا للحاجۃ الشدیدۃ بان کان المسجد ذا منزلین وتعذر الصلوٰۃ فی الداخل للحر ونحوہ فہو عذر، ولان المنزلۃ الثانیۃ لیس فی حکم السقف بالکلیۃ بل لہ حکم المسجد والسقف ماکان فوق المنزلۃ الثانیۃ، اور یہ صورت بلاکراہت جائز ہے کہ امام تحت میں داخل مسجد ہو اور کچھ جماعت اس کے ساتھ ہو، اور کثرتِ جماعت کے وقت کچھ آدمی اوپر چھت پر اقتداء کرلیں بشرط التخلف عن الامام وفی شرح المنیۃ للحلبی و کذا یکرہ لوصلی علی سطح المسجد من شدۃ الحر لقولہ تعالیٰ قل نار جہنم اشد حرا لو کانوا یفقہون اھ وفی القنیۃ امام یصلی التراویح علی سطح المسجد اختلف فی کراہتہ والاولی ان لایصلی فیہ عند العذر فکیف بغیرہ اھ (ص ۳۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تحت مسجد کو چھوڑ کر سقف پر نماز پڑھنا مکروہ ہے، یہ تو سقف کا حکم ہے، اور دو منزلہ کے بارے میں یہ کہنا کہ بالائی منزل سقف کے حکم میں ہے، صحیح نہیں بلکہ سقف وہ ہے جو بالائی منزل کے اوپر ہے، پس دو منزلہ میں یہ جائز ہے کہ کسی وقت تحتانی منزل میں نماز نہ پڑھی جائے، صرف بالائی میں پڑھی جائے وہ اس کی نظیر ہے کہ کسی وقت مسجد کے داخلی حصہ میں نماز نہ ہو، بلکہ صحن میں پڑھی جاوے کہ یہ بلاکراہت جائز ہے، رہی یہ صورت کہ دو منزلہ مسجد میں ایک امام تحتانی منزل میں ہو اور ایک امام بالائی منزل میں ہو، اور دونوں الگ الگ تراویح پڑھاویں، سو یہ صورت مکروہ ہے، کیونکہ فقہاء نے ایک مسجد میں تراویح کی دو جماعتوں سے منع کیا ہے، ولو صلوا التراویح ثم ارادوا ان یصلی ثانیا یصلی فرادیٰ کذا فی الخلاصۃ (ص ۶۴ ج ۱) وفی شرح المنیۃ (ص ۳۸۹) ولو ام فی التراویح مرتین فی مسجد واحد کرہ وکذا لو صلاہا مرتین ماموما فی مسجد واحد وان صلی فی المسجدین اختلف المشائخ فیہ اھ نیز تکرار جماعت ایک مسجد میں ایک وقت میں سلف سے ثابت نہیں، والخیر کلہ فی اتباع السلف ولایغتر احد بما یفعلہ اہل الحرم من تعدد الجماعات فی التراویح فان الحرم یجوز فیہ تکرار الجماعۃ فانہ لا یصدق علیہ انہ مسجد محلۃ بل ہو کمسجد شارع وقد تقرر انہ لاکراہۃ فی تکرار الجماعۃ فیہ اجماعا (شامی ص ۸، ۵) وبالجملۃ فکل مسجد یجوز تکرار الجماعۃ فیہ لاباس بتکرار التراویح فیہ اذا کان الامام والمومون فی کل علیحدۃ تہم والا فلا، ۲۷ رشعبان ۴۶ھ

حکم نماز بلا عمامہ و بلا قلنسوۃ

سوال (۸) لوگ آجکل مختلف ہیں، ....

....

(۱) سر پر کلاہ اور کلاہ کے اوپر عمامہ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں، (۲) صرف ٹوپی سے فریضہ ادا کرتے ہیں بمشکل ۵، ۷، فی صدی ہوں گے، (۳) سر پر صرف لنگی یا ململ وغیرہ کی...... پگڑی باندھے ہوئے نماز پڑھتے ہیں، پگڑی وغیرہ کے نیچے ٹوپی نہیں ہوتی، ایسے ۴۰، ۵۰ فی صدی ہوں گے،

دیگر یہ کہ ایسا بھی دیکھا کہ نمبر ۲ سے اگر ضرورتاً امام بھی بن جائیں تو وہ ٹوپی اُتار کر صرف گز دو گز یا کم و بیش رومال وغیرہ باندھ کر جماعت کرا دیتے ہیں، پورے طور پر تمام سر بھی نہیں ڈھکا جاتا، نمبر ۳ کے سر تو بالعموم درمیان سے کھلے رہتے ہیں، لہٰذا باآدب التماس ہے کہ ہر سہ اقسام مذکورہ کے درجات نماز، نیز از روئے شریعت دیگر حالات پر نظر ڈالتے ہوئے نماز امام اور دوسرے اشخاص نمبر ۳ میں تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟ اگر ہو تو آگاہ فرما دیجئے،

الجواب: قال فی شرح الشمائل ولا بأس بلبس القلنسوۃ اللاصقۃ بالرأس والمرتفعۃ المضربۃ وغیرھا تحت العمامۃ وبلا عمامۃ لان کل ذلک جاء عن المصطفیٰ و بذلک ایدل بعضھم ما اعتید فی بعض الاقطار من ترک العمامۃ من اصلھا لکن الافضل العمامۃ اھ ولابی داؤد والترمذی فرق ما بیننا وبین المشرکین العمائم علی القلانس قال الترمذی غریب واسنادہ لیس بالقائم اھ (ص ۱۶۶ ج ۱) وفیہ (ص ۱۶۸) وقال میرک وروی عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یلبس القلانس تحت العمائم ویلبس العمائم بغیر القلانس اھ وقد ورد انہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الاعتجار فی الصلوٰۃ وفسرہ الفقہاء کما فی مراقی الفلاح بانہ شد الرأس بالمندیل او تکویر عمامتہ علی راسہ وترک وسطھا مکشوفا اھ (ص ۲۰۴)

اس سے معلوم ہوا کہ صورت نمبر ۱ و نمبر ۲ و نمبر ۳ تینوں جائز ہیں، مگر افضل صورت نمبر ۱ ہے اور نمبر ۳ ایسی شرط سے جائز ہے کہ سر کا درمیانی حصہ بھی عمامہ سے مستور ہو مکشوف نہ ہو ورنہ نماز مکروہ ہوگی، واللہ اعلم،

۱۵ ربیع الثانی ۴۷ھ

مجنونہ کی محاذات مفسدِ نماز نہیں	**سوال** (۹) مجنونہ عورت کی محاذات باعثِ فسادِ نماز

ہوگی یا نہیں؟

الجواب: نہیں، کیونکہ فسادِ صلوٰۃ بالمحاذات کے لئے اشتراک فی الصلوٰۃ والتحریمہ شرط ہے اور مجنونہ کی نماز ہی صحیح نہیں، صرح فی کتب الفقہ کلھا باشتراط اشتراکھما تحریمۃ واداء وھو فرع صحۃ الصلوٰۃ والمجنون لاتجب علیہ الفرائض ولا تصح منہ وھذا ظاھر، واللہ اعلم، وفی الشامیۃ عن القھستانی قال وفیہ اشارۃ الی ان محاذاۃ المجنونۃ لا تفسد لان صلاتھا لیست بصلوٰۃ فی الحقیقۃ اھ (ص ۵۹۹ ج ۱) ۱۸ جمادی الثانیۃ ۳۷ھ

بلاضرورت بنیان یا میل خوری میں جن کی آستینیں مرفقین تک ہوں نماز پڑھنا مکروہ ہے	**سوال** (۱۰) بنیان یا میل خوری جن کی آستینیں مرفقین تک ہو یا اس سے کچھ اوپر فقط اس کو پہن کر

نماز ادا کرنا مکروہ ہے یا نہیں؟

الجواب: مکروہ ہے، جبکہ اس کے پاس اور کپڑے بھی ہوں، کیونکہ اس کو پہن کر آدمی محافل وسوق میں نہیں جاسکتا، عادۃً، نیز مرفقین کا کھولنا خود مکروہ ہے، ۱۰ رجب ۴۷ھ

بخوفِ طوالت رکعت ثانی امام کو رکوع میں لیجانے کیلئے سامع کا اللہ اکبر کہنا مفسدِ نماز ہے یا نہیں؟	**سوال** (۱۱) ....

.... ایک شخص تراویح میں قرآن عظیم سنا رہا ہے، دوسرا سماعت کرتا ہے، جبکہ سماعت کرنے والا یہ خیال کرے کہ پہلی رکعت سے دوسری بڑھی جاتی ہے، یا ایسا بھول گیا ہے کہ دونوں سے نہیں نکلتا، یا اس سامع کا منشاء آگے پڑھوانیکا نہیں ہے، ان صورتوں میں امام کو رکوع میں لانے کے واسطے سماعت کرنیوالا اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں لے آئے تو نماز ہوجاوے گی یا نہیں؟ اور سامع پر کوئی مواخذہ تو نہیں ہوگا

الجواب: اگر سامع کا اللہ اکبر کہتے ہی امام نے رکوع کردیا، یعنی محض اس کے حکم کی تعمیل کی تو نماز فاسد ہوگئی، اور اگر امام نے اس کے اللہ اکبر سے متنبہ ہوکر اپنے اختیار سے اور اپنی رائے سے رکوع کیا، تو نماز صحیح ہوگئی، بہرحال سامع کا امام کو اللہ اکبر کہکر رکوع کی طرف لانا سخت خطرناک بات ہے، ایسا کبھی نہ کرنا چاہئے، واللہ اعلم، قال فی الدر حتی لو امتثل امر غیرہ فقیل لہ تقدم فتقدم اودخل فرجۃ الصف فوسع لہ

فسدت بل یمکث ساعۃ ثم یتشہد ثم یسلم ثم برایہ قہستانی اھ قال الشامی ہذا امتثال بالفعل ومثلہ مالو امتثل بالقول کما اذا امر رجل المؤذن ان یجہر بالتکبیر فجہر المؤذن ان قصد جوابہ فسدت صلوٰتہ اھ (ص ۶۵۰ ج ۱) ۱۹ر رمضان ۴۷ھ

جس پر سجدۂ سہو لازم نہیں اور وہ لازم سمجھ کر سہو کرے تو نماز ادا ہوجائیگی یا ایسی نماز واجب الاعادہ ہے؟

سوال (۱۲) نمازی نے مغرب کی نماز فرض میں تیسری رکعت میں الحمد کے بعد سہو سے قل ہو اللہ کی سورۃ تمام یا اور کوئی سورۃ پڑھ لی اور لاعلمی سے یہ سمجھا کہ تیسری رکعت فرض میں سورت ملانے سے سجدۂ سہو لازم ہوگیا، اور قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھ کر سجدۂ سہو کرکے پھر تشہد اور درود و دعاء ماثورہ پڑھ کر نماز کو ختم کردیا، چونکہ فرض نماز کی تیسری رکعت میں سورت ملانے سے سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، اور اس نے بغیر سجدۂ سہو لازم ہونے کے نماز میں سجدۂ سہو کیا تو اس کی نماز درست ہوئی یا نہیں، اور اگر درست ہوئی تو کیسی ہوئی، مکروہ تحریمی ہوئی یا تنزیہی ہوئی اور اس نماز کا اعادہ لازم ہے یا نہیں، یا اعادہ بہتر ہے؟ تحریر فرمائیے گا،

الجواب: قال فی الخلاصۃ اذا ظن الامام ان علیہ السہو فسجد للسہو وتابعہ المسبوق فی ذلک ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سہو فیہ روایتان اشہرھما ان صلوٰۃ المسبوق تفسد وقال الامام ابو حفص الکبیر لاتفسد والصدر الشہید اخذ بہ فی واقعاتہ وان لم یعلم الامام ان لیس علیہ سہو لم یفسد صلوٰۃ المسبوق عندھم جمیعاً اھ (ص ۱۶۴ ج ۱) وفی رد المحتار عن الفیض قیل لاتفسد وبہ یفتی وعن البحر قال الفقیہ ابو اللیث فی زماننا لاتفسد لان الجہل فی القراء غالب واللہ اعلم (ص ۶۲۶ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اگر یہ سمجھ کر سجدہ کرے کہ میرے اوپر سجدہ سہو ہے، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ سجدۂ سہو نہ تھا تو امام کی اور مدرکین کی نماز تو صحیح ہوجائے گی، البتہ مسبوق کی نماز میں اختلاف ہے کہ مسبوق کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں، مشہور روایت یہ ہے کہ فاسد ہوجائے گی، اور ایک روایت یہ ہے کہ اس کی بھی صحیح ہے، پس مسبوق کے لئے احوط اعادہ ہے، اور گنجائش اس کی بھی ہے، کہ اعادہ نہ کرے، کیونکہ فتویٰ اس پر ہے کہ مسبوق کی نماز بھی صحیح ہے، ۵ر شوال ۴۷ھ

چارپائی پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال (۱۳) چارپائی پر نماز کا جواز بکراہت ہے یا بلا کراہت، اور کراہت تنزیہی ہے یا تحریمی؟ اس کے متعلق جو تفصیل ہو اس سے مطلع فرمائیں،

الجواب: چارپائی پر نماز پڑھنا خلافِ اولیٰ ہے فان الافضل ان یصلی علی مایشابہ الارض یہ اس وقت ہی جبکہ پلنگ خوب کسا ہوا ہو، ورنہ نماز کی صحت میں ہی شبہ رہیگا، واللہ تعالیٰ اعلم

۲۰ ذی الحجہ ۴۷؁ھ

کراہتِ عقص شعر نماز میں مرد وعورت کے لئے عام ہی یاصرف مردوں کے لئے خاص ہے؟

سوال (۱۴) کراہتِ عقصِ شعر نماز پڑھنے کے وقت مرد وعورت کے لئے عام ہے، یا فقط مردوں کے لئے خاص ہے، اور عورتوں کو بعقصِ شعر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہ؟ ہمارے ہاں عقص عورتوں کے لئے نہایت ہی پردہ ہے،

الجواب: قال العراقی وهوای الکراهة مختص بالرجال دون النساء لان شعرهن عورة یجب ستره فی الصلوٰة فاذا نقضنه ربما استرسل و تعذر ستره فتبطل صلوٰتها وایضا فیه مشقة علیها فی نقضه للصلاة و قد رخص لهن النبی صلی الله علیه وسلم فی ان لاینقضن ضفائرهن فی الغسل مع الحاجة الی بل جمیع الشعراھ (ص ۲۳۵ ج ۲ نیل الاوطار) اس سے معلوم ہوا کہ کراہتِ عقصِ شعر عورتوں کے لئے نہیں بلکہ مردوں سے مخصوص ہے فان قواعدنا تؤید ماقاله العراقی دلالة باه، ۲۴ محرم ۴۸؁ھ

نیم آستین واسکٹ میں نماز پڑھنا

سوال (۱۵) آدھی باہنوں کی واسکٹ سے بھی نماز ہوسکتی ہے یا مکروہ ہے،

الجواب: فقط نیم آستین پہن کر یعنی جب اس کے ساتھ کرتہ وغیرہ نہ ہو تو نماز مکروہ ہے، البتہ اگر کسی عذر سے ایسا کیا ہو تو پھر کچھ مضائقہ نہیں ہے، واللہ اعلم،

احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۴ ر ج ۲ ۴۵؁ھ ، الجواب صحیح ظفراحمد عفاعنہ ۲ ج ۲ ۴۵؁ھ

واجب الاعادہ نماز کی جماعت ثانیہ میں شرکت کا حکم

سوال (۱۶) امام نے بجائے دو کے تین سجدے کئے، اتفاقاً سجدۂ سہو بھی ترک کر دیا، بعد میں نماز کا اعادہ کیا، اب کچھ مقتدی ایسے شریک ہوئے جو پہلے نہ تھے، ایسی صورت میں نووارد مقتدیوں کا فرض ادا ہوگا یا نہیں جناب نے تتمہ امداد الفتاویٰ صفحہ ۲۱ میں تحریر فرمایا ہے کہ "نووارد کا فرض شریک ہونے میں ادا ہو جائے گا"، لیکن غایۃ الاوطار جلد اوّل ص ۲۱۱ میں مترجم نے وکذا کل صلوٰۃ ادیت مع کراهة التحریم تجب اعادتها والمختار انه جابر للاوّل لان الفرض لایتکرر

کے تحت میں لکھا ہے کہ اس کلیہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی نیا مقتدی دوسری بار میں شریک ہوگا تو اس کی نماز نہ ہوگی کیونکہ جب امام کی نماز فرض نہیں تو اقتدائے فرض والے کا اس کے پیچھے درست نہ ہوگا، بظاہر دونوں متعارض معلوم ہوتے ہیں، دفع تعارض کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب: اس مسئلہ میں اختلاف ہے، راجح یہی ہے کہ نو وارد جماعت میں شریک نہ ہو، حضرت مولانا صاحب مدفیوضہم العالی نے بھی اب اسی کو راجح فرمایا ہے، واللہ اعلم بالصواب، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۲ رج ۱۳۴۸ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

مسئلہ تخفیف صلوٰۃ | **سوال** (۱۷) .... زید عمر کا مزاج شناس ہے، اس کا ملازم ہے، اس کے حکم سے نماز پڑھتا ہے، اپنے اندر اہلیت امامت نہیں پاتا، محض امتثال امر کرتا ہے، عمر کے ضعف کی بنا پر نماز میں تخفیف کرتا ہے، بلکہ صلوٰۃ فجر میں قرأت مسنونہ بھی نہیں پڑھتا ہے، باوجود اس اختصار اور رعایت کے عمر چاہتا ہے کہ اور تخفیف کی جائے، اوّل تو زید کی نمازوں میں اخلاص نہیں ہوتا، اگر قدرے قلیل برائے نام ہوا بھی تو اندیشہ ہے کہ عمر کی اس قدر رعایت اور خاطر داری سے نماز بھی عمر کی نذر نہ ہو جائے کہ قیام وقعود ارکان میں اس کی گرانی کا خیال رہے، اب بحال ادب زید عرض کرتا ہے کہ تخفیف نماز کا انتہائی درجہ جس کی رعایت بروئے حدیث شریف امام کو ضروری ہے، کیا ہے، اطلاع فرمانے پر اس کی پابندی کرے گا۔

الجواب: فی الدر المختار ویکرہ تحریما تطویل الصلوٰۃ علی القوم زائداً علی قدر السنۃ الخ، اس سے معلوم ہوا کہ تخفیف مامور بہ تو یہی ہے کہ مقدار مسنونہ سے زیادتی نہ کرے، البتہ ضرورت شدیدہ کے وقت تخفیف کے جواز کی حد یہ ہے کہ مقدار واجب ادا ہو جائے، کما ذکر فی البحر معزیاً الی المجتبیٰ ان الحسن روی عن الامام انہ اذا قرأ فی المکتوبۃ بعد الفاتحۃ ثلث آیات فقد احسن ولم یسئ اھ (شامی ص ۵۹۰ ج ۱)

پس نمازیوں کی رعایت سے اگر قدر مسنون سے بھی کمی کرنا پڑے تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ امام کو اضعف قوم کی رعایت کا امر ہے، پس یہ رعایت خلوص کے منافی نہ ہوگی، جبکہ نیت اتباع سنت کی ہو، فقط واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۲ رج ۱۳۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ

لنگوٹھ پر تہبند یا پائجامہ پہنکر نماز پڑھنا | **سوال** (۱۸) لنگوٹھ نیچے بندھا ہوا ہو اوپر پاک

پائجامہ پہن کر یا تہبند باندھ کر نماز پڑھیں ادا ہو جائے گی یا نہ، بصورت عذر یا بلاعذر کے۔

الجواب: نماز ہو جاوے گی، لعدم ما یدل علی الحرمۃ و فساد الصلوٰۃ، اور لوگوں میں جو اسکی ممانعت مشہور ہے وہ بے سند بات ہے، واللہ اعلم، عبدالکریم عفا عنہ ۳۰ ر ج ۲ ۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد، یکم رجب ۴۸ھ

معذور کی نماز کی ایک صورت

سوال (۱۹) .... ایک شخص کے ہاتھ پر چوٹ لگی، سال بھر اس نے سخت تکلیف پائی، علاج معالجہ بہت کچھ کیا، اب اس کا ہاتھ کلائی کے جوڑ سے خشک ہو گیا ہے، دایاں ہاتھ ہے، یہ بھی تکلیف سے خالی نہیں، کسی نے بتایا ہے کہ گدھے کی لید پانی میں پکا کر اس جگہ باندھی جائے اور دس دن تک کھولی نہ جائے، بندھی ہی رہے، کیا اس صورت میں نماز پنجگانہ صحیح ہو جائے گی؟ اگر نہیں ہو تو بعد ازاں قضا کرے گا، لیکن اگر اس اثناء میں مرگیا تو وارثوں پر اس کی فوت شدہ نمازوں کا فدیہ واجب ہوگا؟ کتنا واجب ہوگا؟

الجواب: صورت مسئولہ میں باوجود اس ناپاک چیز باندھنے کے بھی بضرورت نماز صحیح ہو جاوے گی، ونظیرہ ما فی الدر مریض تحتہ ثیاب نجسۃ وکلما بسط شیئا تنجس من ساعتہ صلی علی حالہ وکذا لو لم یتنجس الا انہ یلحقہ مشقۃ بتحریکہ اھ (شامی ص ۷۹۹ ج ۱) واللہ اعلم بالصواب، ۳ ر ذی الحجہ ۵۱ھ، کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

نماز میں پاجامہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا

سوال (۲۰) ....
.... زید امامت کراتا ہے، اور اُس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا رہتا ہے، عمرو نے کہا ٹخنوں سے نیچا پاجامہ رکھنا غیر مشروع ہے اور سخت گناہ ہے، اس سے نماز مکروہ ہوتی ہے، تو زید نے یہ کہا کہ غیر مشروع اور سخت گناہ بھی ہے، مگر نماز مکروہ نہیں ہوتی ہے اب سوال یہ ہے کہ نماز مکروہ نہیں ہوتی ہے، یہ صحیح ہے یا غلط ہے، بینوا و توجروا؟

الجواب: زید کا قول غلط ہے، عمرو کا صحیح ہے، یہ صورت سدل میں تو داخل نہیں مگر جس طرح سدل نماز میں مکروہ ہے اسی طرح غیر مشروع لباس میں بھی نماز مکروہ ہے صرح بہ الفقہاء ومنہ کراھۃ الصلوٰۃ فی ثوب الحریر، قال العینی قال تاج الشریعۃ الاصح التفصیل لو صلی فی ثوب حریر او ثوب مغصوب لم تصح صلوٰتہ فی احدی الروایتین عن احمد بن حنبل وفی اخری تصح مع التحریم وعندنا

تصح ویکرہ کذا فی مطالب المؤمنین اھ من تتمہ المفتی والسائل (ص ۳۸) قلت وکذا کل لباس غیر مشروع فھو فی حکم ثوب الحریر والثوب المغصوب لان الکراھۃ بھما لیس للنجاسۃ ولا لقلۃ الستر بل لتعلق النھی بلبسھما فکذا کل لباس تعلق بہ النھی، واللہ اعلم، ثم رأیت البیھقی قد عقد باب کراھیۃ اسبال الازار فی الصلوٰۃ واخرج فیہ حدیث ابی ھریرۃ مرفوعا ان اللہ عزوجل لایقبل صلوٰۃ رجل مسبل ازارہ اھ (ص ۲۴۱ ج ۲) وھذا یدل علی نقصان الصلوٰۃ بھذا الفعل صراحۃ وای نقصان اعظم من عدم القبول، ۶ ذیقعدہ ۴۵ھ

ساڑی میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال (۲۱) اس ملک میں عورتیں جو ایک کپڑا تمام بدن میں دے کر نماز پڑھتی ہیں، جس کو ہمارے ملک میں ساڑھی بولتے ہیں، تھوڑی پہنتی ہیں، اور تھوڑی بدن میں ڈالتی ہیں، یا دھوتی بولتے ہیں،

الجواب: ساڑی میں نماز جائز تو ہے بشرطیکہ عورت کا تمام جسم مخفی رہے، مگر بدون کرتے کے نماز مکروہ ہے، جس کے پاس کرتہ ہو، پس عورتوں کو ساڑی کے نیچے کرتہ ضرور پہننا چاہئے، کہ بغیر اس کے ستر کھلنے کا بھی اندیشہ ہے، ۲۸ ذی الحجہ ۴۷ھ

فصل فی القرأۃ ومسائل زلۃ القاری

فاتحہ خلف الامام

سوال (۱) حافظ صاحب نے یہ ایجاد کیا ہے کہ بلا سورۂ فاتحہ کے نماز نہ ہوگی نماز سری ہو یا جہری، کل مصلی سخت پریشان ہیں، اس کے بارہ میں جو ثبوت ہو مدلل ارقام فرمائیں اور جو کتاب در بارۂ مسئلہ ہذا میں ہو اطلاع فرمادیں؟

الجوابؒ: حنفیہ کے مذہب میں بدون سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مقتدی کی نماز درست ہے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے، خواہ نماز سری ہو یا جہری، اس شخص نے جو مسئلہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مقلد ہے، مسلمانوں کو اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہئے، ۴ رجب ۱۳۴۱ھ

ضاد صحیح ادا کرنے والے کی ضاد غلط پڑھنے والے کے پیچھے اقتدار کا حکم

سوال (۲) پیشتر جو کارڈ بندہ نے راولپنڈی سے خدمت عالیہ میں روانہ کیا تھا جس میں ضاد معجمہ کے متعلق استفتاء تھا اس کا جواب ملا تسلی ہوگئی ہے، اب بندہ بغرض تعلیم وارد امرتسر ہے، اسی کے متعلق

تھوڑی سی بات دریافت طلب ہے، لہٰذا جوابی کارڈ تحریر ہے اگرچہ یہاں بھی مفتی صاحب و دیگر علماء موجود ہیں، لیکن وہ ایسی باتوں کو چنداں اہم نہیں سمجھتے، اور اُن کے عمل درآمد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضاد معجمہ کو مشابہ دال مہملہ پڑھنے کو اصح قرار دیتے ہیں، اس لئے ذیل کا سوال ان سے نہیں کیا گیا ہے، سوال صرف یہ ہے کہ جو شخص ضاد معجمہ کو اپنے مخرج سے کماحقہ بلحاظ صفات ادا کرسکتا ہو یا کماحقہ نہ ادا کرسکتا ہو، لیکن متوسط درجہ کا یا ضعیف جیسا اس کے اپنے مخرج ہی سے ادا کرتا ہو، تو اس کی نماز ایسے شخص کے پیچھے جو ضاد معجمہ کو خالص دال مہملہ یا اطباق دے کر پڑھتا ہو صحیح ہے یا نہ؟ مثلاً امام ماہر تجوید نہ ہو عامی ہو یا ماہر تجوید سند یافتہ ہو لیکن غیر پانی پتی ہو یعنی مشابہ دال پڑھنے والا ہو، پیچھے مقتدی جو ہو وہ پانی پتی ہو سند یافتہ ہو، یا صرف مخارج کا جاننے والا ہو بے سند ہو، لیکن ضاد معجمہ کو اپنے مخرج سے متوسط یا ضعیف جیسا پڑھ سکتا ہو، ان جملہ صور کا کیا حکم ہے، ضاد معجمہ کو اپنے مخرج سے ادا کرنے والا اگر معذور کے پیچھے اقتدار کرے تو اس کو نماز کا اعادہ واجب ہے یا نہ، اگر اعادہ ضروری ہے تو نماز جمعہ کا بھی اعادہ ہو سکتا ہے یا نہ، چونکہ اس کا اعادہ تو کرنا ہی ہوتا ہے تو جماعت سے قبل پڑھ کر پھر شامل جماعت ہو جایا کرے یا نہ، اگر باین خیال اکثر جماعت چھوڑ دیا کرے کہ میری اقتدار کسی کے پیچھے صحیح نہیں، تو کس حد تک گناہگار ہوتا ہے، درآنحالیکہ وہ امام نہ بن سکتا ہو، جواب مختصر ہو، دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف قلم مبارک سے لکھ دینا ہی دلیل ہے، والسلام،

الجواب: قال فی مراقی الفلاح والتمتمۃ بالثاء المثلثۃ والتحریک وھو واللثغۃ بضم اللام وسکون الثاء تحرک اللسان من السین الی الثاء ومن الراء الی الغین ونحوہ لایکون اماما لغیرہ واذا لم یجد فی القرآن شیئا خالیا عن لثغۃ وعجز عن اصلاح لسانہ آناء اللیل واطراف النہار فصلوٰتہ جائزۃ لنفسہ واذا ترک التصحیح والجھد فصلاتہ فاسدۃ اھ قال الطحطاوی قولہ لایکون اماما لغیرہ الا لمثلہ وفی الخانیۃ ذکر الشیخ ابوبکر محمد بن الفضل انھا تصح امامتہ لغیرہ لان ما یقول صار لغۃ لہ واختارہ ابن امیر حاج وحمل قولھم لا یؤم اعلیٰ منہ علی الاولویۃ خروجا من الخلاف وقواہ اھ قال فی الخلاصۃ اذا کان یجتھد آناء اللیل والنہار فی تصحیحہ ولا یقدر علیٰ ذلک فصلوٰتہ جائزۃ

وان ترك جهده فصلاته فاسدة الا ان يجعل العمر فی تصحيحه ولا آن يترك جهده فی باقی عمره اھ قال صاحب الذخيرة وهذا الشق الثانی مشكل لان ما كان خلقة لا يقدر العبد علی تغيره اھ وكذا اذا كان لعارض ليس مما يزول عادة واذا كان كذلك فلا يعول فی الفتوی علی مقتضی هذا الشرط ومن ثمه ذكر فی خزانة الاكمل عن فتاوی ابی الليث لو قال الحمد لله بالهاء بدل الحاء او قل هو الله احد بالكاف بدل القاف جاز اذا لم يقدر علی غير ذلك علی لسانه لا تفسد اھ فلم يذكر هذا الشرط او بلسانه علة قال الفقيه وان لم يكن بلسانه علة ولكن جری ذلك علی لسانه لا تفسد اھ فلم يذكر هذا الشرط الی ان قال قلت كلامه يفيد ان هذا الشرط فيه خلاف والاكثر لم يذكروه لان فيه حرجا عظيما اھ (رد ۱) اگر امام نے تصحیح حروف میں سعی کامل کی ہو پھر ضاد صحیح نہ نکال سکتا ہو یا اس کی زبان میں علت ہو جس کی وجہ سے وہ صحیح مخرج سے ادا کرنے سے بالکل عاجز ہو، اس کے پیچھے صحیح پڑھنے والے کی نماز درست ہو جائے گی، اور اگر باوجود قدرت کے بھی تصحیح حروف کی امام نے سعی نہ کی ہو تو اس کے پیچھے ماہر ضاد کی نماز درست نہ ہو گی، واللہ اعلم،

(۲) جمعہ کی قضا ظہر ہے، (۳) جماعت میں شرکت کرکے بعد میں اعادہ کر لیا جاوے، اور یہ بات جواب اوّل سے معلوم ہو جائے گی کہ اعادہ کب ضروری ہے، کب نہیں واللہ اعلم

فرض نمازوں میں دو سورتیں کامل یا اُن کے کچھ کچھ حصے پڑھنے کا حکم

سوال (۳) فرض نمازوں میں دو سورتیں کامل یا دو سورتوں کے کچھ کچھ حصے پڑھ سکتے ہیں؟

الجواب، یہ سوال سمجھ میں نہیں آیا، کیا یہ مطلب ہے کہ ایک رکعت میں دو سورتیں کامل یا دو سورتیں کے کچھ کچھ حصے پڑھے، یا دو رکعتوں میں ایسا کرے کہ پہلی صورت میں فرض نمازوں میں مکروہ ہے، اور دو رکعتوں میں دو سورتیں کامل پڑھنے میں شبہ ہی کیا ہے، ایسا ہی کرنا چاہئے کہ ہر رکعت میں ایک سورۃ کامل پڑھے، اور اگر ایک رکعت میں ایک سورۃ کا کچھ حصہ اور دوسری میں دوسری سورۃ کا کچھ حصہ پڑھ دیا تو یہ بھی جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے، اس لئے گاہے گاہے تو مضائقہ نہیں مگر عادی نہ ہونا چاہئے، ۲۴ر شعبان ۴۲ھ

نوافل میں جہر کا حکم جبکہ انھیں سرّاً شروع کیا ہو،

سوال (۴) جس شخص نے نماز نفل آہستہ پڑھنی شروع کی پھر زور سے پڑھنے کو جی چاہتا ہے تو درمیان نماز سے زور سے

پڑھنا درست ہوگا یا نہیں ؟ والسلام

الجواب: اگر نفلیں دن میں پڑھ رہا ہے تو جہر نہ کرے، اور اگر رات میں پڑھ رہا ہے تو جہر جائز ہے، خواہ ابتداء سے جہر کر رہا ہو یا وسط میں شروع کر دے، ہر طرح اجازت ہے، قال فی مراقی الفلاح والمنفرد بفرض مخیر فیما یجهر الامام فیہ کمتنفل باللیل فانه مخیر ویکتفی بادنی الجهر والجهر افضل مالم یؤذ نائما ونحوہ کمریض ومن ینظر فی العلم ۔ اور اس کا قیاس اس صورت پر صحیح نہیں کہ نفل کو قیام کے ساتھ شروع کرنے سے پھر قعود جائز نہیں رہتا، کیونکہ وہاں قیام رکن صلوٰۃ ہے اور قعود سے اقوی ہے، اور قعود قائم مقام قیام کے رخصۃً ہے نوافل میں، اور یہاں نوافل لیل میں سر یا جہر کوئی واجب نہیں، بلکہ دونوں مخیر فیہ اور مساوی ہیں، اور نہ سر اقوی ہے جہر سے بلکہ بعض دلائل سے نوافل لیل میں جہر کی افضلیت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا انتقال من الاقوی الی الادنی نہ ہوگا، بلکہ انتقال مساوی سے مساوی کی طرف یا غیر افضل سے افضل کی طرف ہوگا، پس صحت میں کیا شبہ ہے، اور ہدایہ وغیرہ میں جو یہ جزئیہ ہے تو ترک سورۃ اولی العشاء قرأہا وجوبًا مع الفاتحۃ جہرًا فی الاخریین لان الجمع بین جہر ومخافتۃ فی رکعۃ شنیع، یہ جزئیہ جماعت و امام کیساتھ مخصوص ہے، کیونکہ جہر اسی پر واجب ہے نہ منفرد پر، خصوصًا منفرد فی النوافل پر تو جہر واجب ہے ہی نہیں، وصرح فی الہدایۃ فی باب سجود السہو بان الجہر والمخافتۃ من خصائص الجماعۃ پس جماعت میں جمع بین الجہر والسر فی رکعۃ مکروہ ہے نہ انفراد میں، واللہ اعلم ۱۸ ذیقعدہ ۴۲ھ

ضاد کو دواد پڑھنا یا ظاء پڑھنا اور صحیح خواں کا غلط خواں کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال (۵) .... اس امر میں تو شک ہی نہیں معلوم ہوتا کہ حرف ضاد کو جو آجکل عوام دواد پڑھتے ہیں وہ بالکل غلط ہے، البتہ دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس حرف کو جبکہ اس کے مخرج اور جمیع صفات کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے تو اشتباہ بالظاء ہوتا ہے اور اس پر عوام شور مچاتے ہیں، پس ایسی حالت میں اس کو کسی کے کہنے سے ..... دواد پڑھنا درست ہے یا نہیں، اگر درست نہیں تو جو اشخاص اس کو دواد پڑھتے ہیں ان کی اقتداء کرنا درست ہے یا نہیں، بندہ کے جو دو چار رسائل اور فتاویٰ اس کے بارے میں نظر سے گذرے ہیں یہ فہم ناقص میں آیا کہ نماز نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہیں، مجموعۃ الفتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنوی یوسفی استفتاء نمبر ۱۵ جلد اول اور استفتاء نمبر ۱۴ جلد دوم میں

نہایت قوی سے دلائل سے ثابت کیا ہے اور قریب ۳۶ کتابوں کے حوالہ دیا ہے۔ اور رسالہ مرصاد فی قرءۃ الضاد میں تراسی کتابوں اور چھیاسی فتاوی سے ثابت کیا ہے کہ نماز نہیں ہوتی، جو مؤلفہ ہی مولوی محمد حسین تمنا مرادآبادی کی مطبوعہ نیر اعظم پریس مرادآباد اور تفسیر اکسیر اعظم جلد اوّل میں بعد ختم ہونے تفسیر سورۂ فاتحہ کے دلائلِ قویہ سے ثابت کیا ہے، اور ان سب کا خلاصہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جن دو حرفوں میں فرق بآسانی ممکن ہو وہاں تبدیل حرف بحرف سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، اور جن میں فرق بمشقت ہو تو وہاں فاسد نہیں ہوتی، اور اسی قاعدہ کو مختار لکھا ہے، پس یہ تو جملہ کتب فقہ و تجوید و صرف و تفسیر سے ثابت ہے کہ ضؔ اور ظؔ میں فرق بمشقت ہے، اور دوآد کا کہیں ذکر نہیں کیا، اور یہ ذکر نہ کرنا قرینہ ہے اس کا کہ ان دونوں میں تباین ہے پس جب تبائن ہوا تو بقاعدۂ مذکورہ بالا فاسد ہونا چاہئے، اور اگر ضاد کی جگہ ظؔ نکل گیا، تو وہاں فاسد نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ وہاں تشابہ ہے، اور اس کا بھی بندہ کو تجربہ ہوگیا ہے کہ جو علماء اس کو دوآد پڑھتے ہیں اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں اور محض ضد ہے، بیں چند علماء کے پاس استفتاء لیکر گیا، لیکن جواب دیا تو یہ دیا کہ اس کو قاری جانیں (یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہ حضرات نہیں جانتے تو پھر مداخلت کیوں کرتے ہیں) جب زیادہ کہا گیا تو فرمانے لگے کہ ہم نے تو ایسا ہی پڑھا ہے، اور اپنے باپ بھائی سے ایسا ہی سُنا ہے (کتابی دلیل کوئی نہ دے سکے) نوبت بایجا رسید کہ فرمانے لگے کہ تم تمام جہان سے فتوی منگالو، اگر میری طبیعت کے موافق ہوگا تو دستخط کردوں گا ورنہ پھینک دونگا (گویا دین کے خود تابع نہیں بلکہ دین کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں، تو اب دو وجہ ہوگئیں ایک غلط خوانی، دوسری ضد خلاف وجہ شرعیہ،

اب جبکہ غور کرتا ہوں کہ رسائلِ مذکورہ کی طرف تو فسادِ صلوٰۃ لازم آتا ہے، پھر دل میں خیال آتا ہے کہ ترکِ جماعت ہوتی ہے تو پھر اس کا بھی جواب فوراً دل میں یہ گذرتا ہے کہ جب اول سے نماز ہی نہیں ہوتی تو جماعت کس کام کی، اور اگر کہا جاوے کہ عمومِ بلوی کی وجہ سے نماز فاسد نہ ہوگی تو حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری نے رسالہ الاقتصاد فی الضاد میں لکھا ہے کہ یہاں پر عموم بلوی معتبر نہیں، اور تمام شکوک جو اس حرف کے متعلق ہیں ان کا بھی جواب دیا ہے، (جو دراصل قائلینِ دوآد کے نزدیک دلائلِ قویہ ہیں)،

امید کرتا ہوں کہ جملہ امور مذکورہ بالا کا جواب شافی مرحمت فرمائیں گے،

الجواب: آپ نے جو کچھ سمجھا ہے سب صحیح ہے، مگر ظ سے فاسد نہ ہونا علی الاطلاق صحیح نہیں اور دواد سے فاسد ہونا بھی محل تامل ہے۔

ضاد کو دال یا مشابہ دال یا مشابہ ظاء پڑھنے والے کی اقتداء

سوال (۶)

آیا کوئی شخص سب حروف صحیح پڑھتا ہو یا تریب صحیح کے پڑھتا ہو، مگر صرف اس حرف ضاد کو دال یا مشابہ دال کے پڑھتا ہے تو اس کے پیچھے بھی ایسے شخص کو جو اس حرف ضاد کو مشابہ بالظاء پڑھتا ہو اقتداء کر لینے سے اعادہ صلوٰۃ تو واجب نہیں، اور اگر نہ لوٹاؤں تو کوئی حرج تو نہیں متاخرین کے قول پر، اور اگر ایسا شخص نماز پڑھائے جو اور حروف میں بھی تبدیلیاں کرتا ہے مثلاً قاف کو چھوٹا کاف بڑے شین کو سین جیم کو زے اور حروف بھی گھٹا بڑھا دیتا ہو جس سے بالکل معنی بدل جاتے ہوں، ایسے ائمہ کے پیچھے اگر اعادہ صلوٰۃ کی دقت سے بچنے کی غرض سے تنہا خفیہ نماز پڑھ لیا کروں تو ترک جماعت کی معصیت تو میرے اوپر نہ ہوگی، اس میں شرعی حکم حضور والا سے معلوم کرنا چاہتا ہوں؟

الجواب واللہ الموفق للصواب: قال فی الدر ولا غیر الالثغ بہ ای بالالثغ علی الاصح کما فی البحر عن المجتبی وحررہ الحلبی وابن الشحنۃ انہ بعد بذل جھدہ دائما حتما کالامی فلا یؤم الا مثلہ الی ان قال ھذا ھو الصحیح المختار فی حکم الالثغ وکذا من لا یقدر علی التلفظ بحرف من الحروف اھ (ص۶۰۱ و ص۶۰۸ ج ۱ مع الشامی) وفی رد المحتار تحت قولہ علی الاصح ای خلافا لما فی الخلاصۃ عن الفضلی من انھا جائزۃ لان ما یقول صار لغۃ لہ ومثلہ فی التتارخانیہ وفی الظہیریۃ وامامۃ الالثغ لغیرہ تجوز وقیل لا ونحوہ فی الخانیۃ عن الفضلی وظاھرہ اعتمادھم الصحۃ وکذا اعتمدھا صاحب الحلیۃ قال لما اطلق غیر واحد من المشایخ من انہ ینبغی لہ ان لا یؤم غیرہ ولما فی خزانۃ الاکمل وتکرہ امامۃ الفافاء ولکن الاحوط عدم الصحۃ اھ (ص۶۰۸ ج ۱)

ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوئے:۔ (۱) الثغ کی امامت کے جواز میں اختلاف ہے،

(۲) الثغ صرف وہی نہیں جس میں صحیح پڑھنے کی قابلیت ہی نہ ہو، کیونکہ حلبی وابن شحنہ نے اس پر بذلِ جہد واجب کیا ہے، اور وجوبِ جہد فرع ہے قدرت کی، پس الثغ سے مراد وہ الثغ ہے جو اس حالتِ موجودہ میں صحیح پڑھنے پر قادر نہیں (۳) جو شخص الثغ نہ ہو لیکن اس وقت .... کسی حرف کے صحیح تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بھی بحکم الثغ ہے، پس ہر چند کہ صحیح مختار قول یہ ہے کہ الثغ کی امامت غیر الثغ کی لئے درست نہیں، اور اس کا مقتضاء یہ ہے کہ صحیح خواں کی اقتداء ایسے شخص کے پیچھے جائز نہ ہو جو حروف کو صحیح ادا نہیں کرتا، مگر اس وقت ضرورت کی وجہ سے امام فضلی کے قول پر فتویٰ دینے کو جی چاہتا ہے، خصوصاً حرفِ ضاد کے مسئلہ میں، کیونکہ عام طور پر قرّاء تک اس کو غلط پڑھتے ہیں، لہذا قاری کی اقتداء کرنا غیر قاری کے پیچھے صحیح ہے، البتہ ایسے شخص کے پیچھے صحیح نہیں، جو بحالتِ موجودہ تصحیح حروف پر قادر ہے، مگر غفلت یا بے توجہی یا رعایتِ عوام کی وجہ سے کسی حرف کو مثلاً ضاد کو اصلی مخرج سے نہیں نکالتا، کیونکہ وہ بحکم الثغ نہیں بلکہ عمداً غلط پڑھنے والا ہے، واللہ اعلم، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۹ ارج ۱۳۴۳ھ، صح الجواب، اشرف علی ۱۹ ارج ۱۳۴۳ھ

ولا الضالین میں ضاد کے بجائے ذال پڑھ لیا تو نماز ہو جائے گی،

سوال (۷) اگر نماز کے اندر ختمِ الحمد شریف میں بجائے ولا الضالین کے اگر ذال کے ساتھ تلفظ ادا کیا جائے تو درست ہے یا نہیں اور نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب: نماز درست ہوگئی، لکونہ من الزلۃ فلم یفسد المعنی، باقی جو شخص صحیح تلفظ پر قادر ہو اس کو ذال پڑھنا عمداً جائز نہیں، ۱۸ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

تحقیق حرف ضاد

سوال (۸) یہ جو حرفِ ضاد مشابہ ظاء کے پڑھتے ہیں صحیح نہیں ہے بلکہ ضاد کو مشابہ دال کے پڑھنا چاہیئے، کیونکہ دال بہ نسبت ظاء کے ضاد کے ساتھ قریب تر ہے، جیسا کہ حضرت تھانوی سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی امداد الفتاویٰ جلد اوّل صفحہ ۱۴۳ سطر ۳ میں فرمایا ہے کہ "اسی طرح ضاد و دال میں تقارب بلیغ ہے"، اور سطر نمبر ۶ میں فرماتے ہیں "بلکہ باعتبار مخرج کے ضاد کو دال کے ساتھ زیادہ قرب ہے بہ نسبت ظاء کے"،

الجواب: حضرت مرشدنا سلمہ نے جو فرمایا ہے حق وصواب ہی، لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ضاد کو دال کے مشابہ پڑھنا چاہیئے نہ ظاء کے، دیکھو اس صفحہ کے حاشیہ پر مرقوم ہے ۵ یعنی باعتبار قربیت مخرج کے نہ کہ صفات وصوت کے، للعہ بہت مشابہ

مع تبدیل مخرج ہے ورنہ مخرج سے ادا ہونے سے مشابہت صورت لازم ہے ۱۲ منہ

دیکھو حضرت سلمہ صوت کا تشابہ تو ظاء کے ساتھ ثابت فرمایا باقی باعتبار قربت مخرج کے دال کو ضاد کے ساتھ زیادہ قریب لکھا بہ نسبت ظاء کے، کیونکہ جب سائل نے حضرت سلمہ کی خدمت میں یہ سوال کیا کہ ضاد کو اس کے مخرج سے ادا کرنے پر قدرت نہ ہو تو وہ شخص حرف مذکور کو بصوت ظاء منقوطہ کہ دونوں حرف مفخم اور متشابہ الصوت ہیں پڑھے یا بصوتِ دال مہملہ جو کہ مرقق وغیر متشابہ الصوت ہے پڑھے، تو حضرت سلمہ نے سائل کو جواب میں فرمایا، کہ ضاد کو ظاء یا دال پڑھنا ایسا ہے جیسے باء کو تاء، ثاء کو جیم، حاء کو خاء وہذا باطل بالاجماع، پس اگر ضاد کی جگہ ظاء کو پڑھنا بسبب اتحادِ صفات اور تشابہ صوت کے جائز ہے، تو ضاد کی جگہ دال پڑھنا بھی جائز ہو، کیونکہ بہ نسبت ظاء کے دال قریب ہی باعتبار مخرج کے، اس لئے حضرت سلمہ نے قربت مخرج ثابت فرمائی اور باعتبار ادا تعمد کے دونوں یعنی ظاء اور دال کو ضاد کی جگہ جواز وعدمِ جواز میں متساوی الاقدام فرمایا ہے، مطلب یہ ہوا کہ حضرت سلمہ کی اس تحریر سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ضاد متشابہ الصوت بدال ہے، بلکہ حضرت سلمہ نے الزاماً فرمایا کہ اگر عمداً ظاء کو ضاد کی جگہ پڑھنا بسببت تشابہ صوت واتحاد صفت استعلاء کے جائز ہو تو ضاد کی جگہ دال پڑھنا بھی بسبب اتحادِ صفت جہر وقربتِ مخرج کے جائز ہونا چاہیئے، حالانکہ دونوں ناجائز ہیں، باقی یہ الگ بات ہے کہ ضاد کو اگر اپنے مخرج اور صفات سے صحیح طور سے ادا کیا جاوے تو اس کا صوت دال سے مشابہ ہوگا یا ظاء کے، اس کے متعلق حضرت سلمہ کی اور تحریریں اسی جلد میں موجود ہیں، اور اسی تحریر کے حاشیہ پر بھی موجود ہے، کہ ضاد کا صوت ظاء سے متشابہ ہے نہ دال سے، اور یہ شبہ کرنا کہ جب ضاد اور ظاء میں تشابہ صوت پایا جاتا ہے اور ضاد کی اداء پر قدرت نہیں ہے، تو پھر اس کی جگہ وہی حرف پڑھنا چاہیئے، کہ جو اس کی صوت جیسی سنائی دے یا جو باعتبار مخرج کے قریب ہو مثل دال کے، تو میں پوچھتا ہوں کہ ایسا تو ع اور ء، اور ح اور ہ اور س اور ص اور ث، اور ت اور ط، اور کاف اور قاف میں بھی تشابہ صوت پایا جاتا ہے، اگرچہ ہر متشابہ الصوت حرف میں ممیز موجود ہے، پھر بھی اتنا امتیاز نہیں ہے کہ عوام فرق سمجھ سکیں تو چاہیئے کہ بسبب عدم قدرت کے یہ ہر متشابہ الصوت حروف بھی ایک دوسرے کی جگہ پڑھے جاویں، یعنی عین کی جگہ ء اور ح کی جگہ ہ اور ث کی جگہ س وامثالہا، یا بسبب

قربِ مخرج کے آپس میں ایک دوسرے کی جگہ پڑھے جاویں جیسے ء کی جگہ ہ اور ع کی جگہ خ اور ش کی جگہ ذ اور ت کی جگہ د ہرگز جائز نہیں،

صاحبا! سچی بات یہ ہے کہ غیر ماہرینِ فنِ تجوید کو ذال ظاء، زاء اور س، ص، ث اور ت طا کے تشابہ سے تو کیا بلکہ عمداً ایک کو دوسرے کی جگہ پڑھ دینے سے بھی اتنے قدر وحشت و نفرت نہیں ہوتی ہے کہ جس قدر ظاء وضاد کے خفیف تشابہ سے ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ضاد چونکہ بمشکل ادا ہوتا ہے، اس لئے عرصۂ بعیدہ سے بہ سبب عدم توجہی علمِ تجوید کے اگلے دانتوں کے مسوڑھوں سے دال کے مخرج کے پاس سے ادا کرتے ہیں، اس لئے دال کی طرح صوتِ شدیدہ مسموع ہوتا ہے، اس لئے اس سے مانوس ہو گئے ہیں، اور اگر صحیح طور نکالا جاتا ہے تو وہ ظاء کی صوت سے متشابہ ہو کر رخوہ ادا ہوتا ہے، اس لئے اس سے متوحش ہوتے ہیں، اب ایک بات اور ضروری عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ قرب واتحاد مخارج کی وجہ سے تشابہ فی الصوت پیدا نہیں ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو دال وتاء میں اور ثاء وذال میں اور زاء وسین اور ع وہ میں ہوتا، باقی یہ بات مسلّم ہے کہ قرب واتحاد مخارج کی وجہ سے وہ حروف آپس میں متقاربین ومتجانسین کہلاتے ہیں، اگرچہ صوت میں بین امتیاز ہوتا ہے پس قرب واتحاد مخرج ہی کی وجہ سے وہ آپس میں ادغام ہوتے ہیں، نہ تشابہِ صوت کی وجہ سے، اور بُعدِ مخرج کی وجہ سے وہ متقارب نہ رہیں گے، اگرچہ صوت میں متشابہ ہوں، پس جب متقارب نہ رہے تو ادغام بھی نہ کئے جاویں گے، اس سے معلوم ہوا کہ متجانسین ومتقاربین بھی ایک دوسرے کی جگہ جب کہ قاعدۂ ادغام پایا جاوے تو ہر دو کو متماثل بنا کر آپس میں ادغام کر دیئے جاویں گے، تو یہ بھی گویا ایک دوسرے کی جگہ پڑھنے کا جواز ثابت ہوا، باقی باوجود بُعدِ مخرج کے اور نہ پائے جانے قواعدِ ادغام کے محض تشابہِ صوت کی وجہ سے وہ آپس میں ایک دوسرے کی جگہ کبھی نہ پڑھے جاویں گے، باقی یہ شبہ کرنا کہ جب تشابہِ صوت موجبِ اتحاد وقربت نہیں ہے تو پھر یہ تشابہِ صوتی کیونکر پیدا ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ تشابہِ صوتی کا اصلی سبب یہ ہے کہ خاص کسی مخرج سے خاص کسی صفت ایک یا چند کے ادا ہونے سے پیدا ہوتا ہے، پس بتیس دانتوں کا مخرج عام ہے، یعنی بتیس دانتوں میں جتنے مخرج ہیں ان میں سے جو حروف صفتِ ہمس اور رخوۃ سے موصوف ہو کر ادا ہونگے تو ان کا صوت متشابہ ہوگا مثل س، ص، ث کے، پس اس تشابہ کو یہ لازم نہیں ہے کہ یہ

تینوں ایک ہیں، یا یہ اعتراض کرنا کہ س، ص، ث آپس میں متشابہ کیوں ہیں، ایسا ہی مخرجِ حلق کو دیکھئے کہ جتنے مخرج حلق ہیں ان میں سے جو حروف صفتِ جہر و شدّت سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے، تو وہ آپس میں متشابہ الصوت ہوں گے، جیسا کہ ءَ اور عینؔ اگرچہ بینیہ ہیں لیکن بینیت، شدۃ اور رخوۃ کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے، اور عین میں حصہ شدۃ نے بالحاق صفتِ جہر کے حلق میں یہ اثر پیدا کیا، یعنی یہ سمجھو کہ جہر و شدۃ اگر ایک جگہ جمع ہو کر حلق سے ادا ہوں گی تو ایسی صوت پیدا ہو گی، حالانکہ ہمزہ کے قریب، تو ہؔ تھی، لیکن چونکہ وہ صفت ہمس سے متصف ہے اس لئے متشابہ بہمزہ نہ ہوئی، اور جو حروف صفتِ ہمس اور رخوۃ سے متصف ہو کر حلق سے ادا ہوں گے تو وہ بھی آپس میں متشابہ صوت ہوں گے جیسا ہؔ اور حؔ اور اسی طرح جو حروف صفت رخوۃ اور جہر سے موصوف ہو کر حلق سے ادا ہوں گے تو وہ بھی آپس میں متشابہ ہوں گے، جیسا عؔ اور غؔ، عین میں جب کہ صفتِ رخوۃ کے حصہ کو کچھ زور دے کر ادا کیا جاوے گا تو عینؔ مشابہ غینؔ کے ہو جاوے گی، اور ازاں سوا غین چونکہ مفخم بھی ہے، اس لئے بیّن فرق ہے، اور ایسا ہی حؔ اور خؔ میں تفخیم ممیّز ہے، پس عینؔ اور حاؔ میں گلا نہ گھونٹنا چاہیے، ورنہ عؔ اور غؔ اور ح اور خ متشابہ الصوت ہو جاویں گے، یہاں فقط یہ بتلانا منظور تھا کہ حلق میں سے جب صفت رخوۃ اور جہر مل کر ادا ہوں گی تو تشابہ پیدا ہو گا اگرچہ ادنیٰ ہی سہی، اسی طرح مخرج لہات میں سے جو حروف صفتِ شدّت سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے تو وہ بھی متشابہ الصّوت ہوں گے، جیسا کؔ اور قؔ اگر کؔ کو رخوۃ پڑھا جاوے گا، جیسا کہ بعض کی رائے ہے تو پھر یہ تشابہ نہ رہے گا، کؔ نبطی اسی کو کہتے ہیں جو کہ کہہ سے متشابہ ہوتا ہے، اسی طرح پڑھنا صحیح نہیں ہے بلکہ کؔ کو شدیدہ اور پست کر کے مہموسہ پڑھنا چاہیے تاکہ مجہورہ نہ ہو جاوے، جیسا کہ اکثر پڑھتی ہے، اب دانتوں کے مخرج میں سے اگر صفت جہر و استعلاء اور اطباق کے ساتھ جب صفتِ شدۃ ملحق ہو کر ادا ہونے سے جو صوت پیدا ہو گی اس کے ساتھ وہ صوت بھی متشابہ ہو گی جو کہ صفتِ ہمس اور شدۃ کے الحاق سے پیدا ہو گی، جیسا کہ طاؔ، اور تاؔ، اور جو حروف صفتِ جہر اور شدّۃ سے بغیر استعلاء و اطباق کے یا بغیر ہمس و شدت کے ادا ہو گا تو وہ طاؔ، و تاؔ سے متشابہ نہ ہو گا، جیسا کہ دالؔ، اب دیکھنا چاہیے کہ طاؔ، سے دالؔ صفتِ جہر اور شدت اور اصمات اور قلقلہ میں متفق ہے، اور طاؔ، سے تاؔ، فقط شدت

اور اصمات اور ان دونوں صفتوں میں متفق ہے، اور تآء دآل سے صفت شدت اور استفال اور انفتاح اور اصمات میں متفق ہے، چاہئے تھا کہ تآء دآل سے متشابہ ہوتی، لیکن چونکہ اوپر بتایا گیا ہے کہ خاص دانتوں میں سے جس حرف میں صفت جہر وشدۃ واستعلاء واطباق کے اجتماع سے جو صوت پیدا ہوگی اس کے ساتھ اس حرف کی صوت بھی متشابہ ہوگی، جو کہ صفت ہمس اور شدت سے متصف ہو کر دانتوں سے ادا ہوگی، اب دیکھو کہ اگر صوت کو قربت میں دخل ہوتا تو طآء اور تآء قریب تر ہوتیں، بہ نسبت تآء اور دآل کے اگرچہ یہ تینوں آپس میں متجانس ہیں، لیکن قربتِ صفاتی کی وجہ سے دآل تآء میں ادغام ہوتی ہے، نہ طآء میں، اس سے معلوم ہوا کہ دآل اور تآء آپس میں زیادہ تر متقارب ہیں بہ نسبت تآء اور طآء کے، پھر بھی سابق کلیہ کی وجہ سے طآء اور تآء میں تشابہ صوت پایا گیا، اور باوجود قرابتِ صفاتی کے دآل اور تآء میں بہ سبب نہ پائے جانے کلیہ سابقہ کے تشابہ نہ رہا، دوسرے یہ کہ اگر مخرج دانتوں میں سے جو حروف صفت ہمس اور رخوۃ سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے وہ سب آپس میں متشابہ الصوت ہوں گے، مثل ث، س، ص کے جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، حالانکہ ث اور ذ متجانس ہیں، پھر بھی بہ سبب نہ پائے جانے کلیہ مذکورہ کے ان میں تشابہ صوتی نہ رہا،

ایسے ہی اگر صفت جہر سے اور رخوۃ سے جو حروف موصوف ہو کر دانتوں سے ادا ہوں گے وہ سب آپس میں متشابہ الصوت ہوں گے جیسے زآء، ذآل، ظآء، ضاد، حالانکہ زآء بہ نسبت ذآل کے سین سے قریب تر ہے، لیکن چونکہ سین میں جہر نہیں ہے اس لئے تشابہ نہ رہا، اسی طرح ضاد باعتبار مخرج کے دآل کیساتھ قریب ہے، بہ نسبت ظآء کے، اسی وجہ سے بعض قراء نے ہر دو کو متقاربین قرار دے کر قَدْ ضَلُّوا میں ادغام کیا ہے، پھر بھی بسبب سابق کلیہ کے ضاد اور ظآء اور ذآل اور زآء میں تشابہ ہے، نہ ضاد اور دآل میں، پس اگر محض تشابہ سے وحشت ہوتی ہے تو پھر طآء اور تآء سے بھی متوحش ہوں، اور اگر ضاد اور دآل کے تشابہ کو پسند کرتے ہو بسبب قربت کے تو پھر تآء اور دآل کو بھی متشابہ پڑھو، بسبب قربت بلیغ کے،

میرے اس سارے معروض کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ خاص مخارج میں اثر رکھا گیا ہے، کہ اگر فلاں صفت مفردہ یا بالحاق فلاں صفت کے خاص فلاں مخرج سے ادا ہوگی تو

اس قسم کی صوت پیدا ہوگی، یہی وجہ ہے تشابہ صوتی کی، پس جب دانتوں سے صفتِ رخوۃ وجہر سے جو حروف ادا ہوں گے تو وہ آپس میں متشابہ ہوں گے، اگرچہ سب میں تمیز بیّن موجود ہوتی ہے، گویا یہ سمجھو کہ ہر حرف پست کلام ہوگا بسبب صفت ہمس کے یا بلند کلام ہوگا بسبب صفت جہر کے، پھر اس کی پست کلامی اور بلند کلامی جاری ہوگی بسبب صفت رخوۃ کے یا بند ہوگی بسبب صفتِ شدت کے پس خاص دانتوں کے مخرج میں یہ خاصیت رکھی گئی ہے کہ اگر اس سے جو حرف پست کلام بسبب ہمس کے اور اس کی ہمس جاری ہوکر نکلے گی بسبب رخوۃ کے تو اُن کی صوت سا، سا، سا، کی طرح مسموع ہوگی، یہی وجہ ہے ث، س، ص کے متشابہ الصوت ہونے کی، اور اگر دانتوں کے مخرج سے جو حروف بلند کلام بسبب صفت جہر کے اور اس کی جہر جاری ہوکر نکلے گی بسبب رخوۃ کے تو اس کی صوت زا، زا، زا کی طرح سنائی دے گی، یہی وجہ ہے کہ جو حروف صفتِ جہر اور رخوۃ سے موصوف ہوکر دانتوں کے مخرج سے ادا ہوتے ہیں تو وہ آپس میں متشابہ الصوت ہوتے ہیں، جیسے زا، ذال، ظا، ضاد، پس جس طرح اور حروف متشابہ الصوت کا امتیاز مانتے ہو جیسے س، ص، ث کا ایسا ہی ضاد، اور ظا، ذال اور زا کا تصوّر فرمائیے، واللہ اعلم،

کتبہٗ شیر محمد

حضرت مرشدی سلمہٗ کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے بھیجا گیا تو یہ الفاظ ارقام فرمائے "خوب تحقیق اور نہایت مفید ہے"۔ اشرف علی

اور استادی قاری صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تو یہ ارقام فرمایا: "مضمون متعلق تشابہ ضاد و ظا۔ دیکھ کر محظوظ ہوا ماشاء اللہ خوب لکھا ہے"، محمد یاٰمین

نفل کی سب رکعتوں اور فرضوں کی دو رکعتوں میں قرآت فرض ہے، اس کا کیا سبب ہے؟	**سوال** (۹) نفل نماز میں سب رکعتوں میں سورت پڑھنا فرض ہے، اور فرض نماز میں فقط دو رکعت میں سورت پڑھنا فرض ہے، اس کا کیا سبب ہے؟

الجواب: فرضیتِ قرآت آیۃ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ سے ثابت ہے اور فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں فرض نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ سے روایاتِ عدم وجوب قرینہ ہیں کہ یہ امر رکعت ثالثہ رابعہ کی بابت وجوب کے لئے نہیں، کما فی بحر الرائق (ص ۵۶ ج ۲) وانما لم تکن القرأۃ فی الاخریین واجبۃ فی الفرض کما هو

الصحیح من المذهب مع وجود الامر المذکور المقتضی للوجوب موجود صارف له عنه وهو قول الصحابة علی خلافه کما رواه ابن ابی شیبة عن علی وابن مسعود قال اقرأ فی الاولیین وسبح فی الاخریین لکن ذکر المحقق فی فتح القدیر انه لا یصلح صارفا الا اذا لم یرد عن غیرهما من الصحابة خلاف والا فالاختلاف فی الوجوب لا یصرف دلیل الوجوب عنه فالاحوط روایة الحسن رحمه الله بالوجوب فی الاخریین انتهی وقد یقال ان مقتضاه لزوم قرأة ما تیسر فی الاخریین وجوبا لا تعیین الفاتحة کما هو روایة الحسن فلیس موافقا لکل من الروایتین اهـ قلت مقتضی الامر الوارد فی الاٰیة وجوب قرأة ما تیسر فی الصلوٰة مطلقا ولا تعرض له بالرکعة ولا الرکعتین ولا الاولیین و لا الاخریین وانما قلنا بفرضیة القرأة فی الرکعتین من الفرض لقیام الاجماع علیه ولا اجماع فی الاخریین واما تعیین الاولیین للقرأة فواجب لا فرض بدلیل قضاءها فی الاخریین اذا ترکها فی الاولیین و دلیل الوجوب فی ذلك مواظبة النبی صلی الله علیه وسلم علی ذلك من غیر ترك، والله تعالیٰ اعلم، ۲۶ ر ذیقعده ۴۳ھ

حکم جہر منفرد در تکبیرات صلوٰۃ

سوال (۱۰) مسئلہ بہشتی گوہر (جدید) ص ۳۶، فجر، مغرب، عشاء کے وقت پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دوسری سورۃ اور سمع اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں امام بلند آواز سے کہے، اور منفرد کو قرأت میں تو اختیار رہے، مگر سمع اللہ لمن حمدہ اور تکبیریں آہستہ کہے، اور ظہر کے وقت امام صرف سمع اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں بلند آواز سے کہے اور منفرد آہستہ اور مقتدی ہر وقت تکبیریں وغیرہ آہستہ کہے (ص ۴۹۵ ج شامی) اس مسئلہ میں منفرد کو قرأت میں سر اور جہر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، تین وقتوں میں (یعنی فجر، مغرب، عشاء) مگر سمع اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں آہستہ کہنے کو لکھا ہے، شبہ یہ ہے کہ پرانے بہشتی گوہر میں تکبیر وغیرہ کا اختیار مطلقاً لکھا ہے خواہ آہستہ کہے یا جہراً کہے، اور چونکہ اس مسئلہ کے الفاظ تغیر و تبدل کیا گیا، مگر حاشیہ میں کچھ نہیں لکھا کہ فلاں عبارت بڑھائی گئی ہے جیسا کہ شروع میں ہدایت کی گئی ہے کہ جو عبارت جدید بڑھائی جاوے گی اس کو حاشیہ میں تحریر کر کے

بتلادیا جاوے گا کہ فلاں عبارت بڑھائی ہے، اس لئے تحقیق طلب ہے، فقط

الجواب: ہاں اس مسئلہ میں بہشتی گوہر سابق سے کچھ عبارت بدلی ہوئی ہے، اور اس کی اطلاع حاشیہ میں اس لئے نہیں دی گئی کہ اس اطلاع کا التزام صرف بہشتی زیور میں کیا گیا ہے، بہشتی گوہر میں اس کا التزام نہیں کیا گیا، ملاحظہ ہو دیباچہ جدید بہشتی گوہر صفحہ ۴۳، بہشتی گوہر قدیم میں صرف اتنی عبارت تھی کہ منفرد کو اختیار ہے جس سے جہر تکبیر و تسمیع و تحمید میں بھی اختیار کا ایہام ہوتا تھا، حالانکہ منفرد کو صرف جہر قرأت کا اختیار ہے، تکبیرات و تسمیع وغیرہ کا جہر اس کے لئے مشروع نہیں، اس لئے اس مرتبہ عبارت میں ترمیم کردی گئی، اور دلیل اس ترمیم کی درمختار مع الشامی بیان سنن الصلوٰۃ صفحہ ۴۹۵ ج ا مطبوعہ ۱۲۹۴ھ میں مذکور ہے ونصہ و جہر الامام بالتکبیر بقدر حاجتہ للاعلام بالدخول والانتقال وکذا بالتسمیع والسلام واما المؤتم والمنفرد فیسمع نفسہ اھ، اس میں صراحۃً جہر و تکبیرات و تسمیع و سلام کو امام کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، اور منفرد کو اس بارے میں مقتدی کی طرح اخفاء کا حکم کیا گیا ہے، اور فصل قرأۃ جو کہا گیا ہے ویخیر المنفرد فی الجہر وھو افضل ان ادی الخ وہاں صرف جہر بالقرأت میں تخییر مراد ہے جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے فافہم، یکم محرم الحرام ۱۳۴۶ھ

قرأۃ خفی کی حالت میں سانس لیتے ہوئے قرأۃ جاری رکھنا

سوال (۱۱) اثناء نماز قرأت خفی کی حالت میں سانس لیتے ہوئے قرأت کا جاری رکھنا جبکہ کوئی فتور قرأت میں نہ پڑے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر قرأت میں فتور نہ آئے تو جائز ہے ورنہ مکروہ ہے، ۲۶ شعبان ۱۳۴۶ھ

قرأت فاتحہ کے بعد نماز میں بجائے کسی اور سورۃ کے خود سورۃ فاتحہ کا قصداً یا سہواً ضم کرنے کا حکم

سوال (۱۲) نماز میں سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کے بعد بجائے کسی اور سورۃ کے ضم کرنے کے خود سورۂ فاتحہ ہی ضم کرنا عمداً یا سہواً کیسا ہے،

الجواب: قال فی شرح المنیۃ ولو کرر الفاتحۃ فی رکعۃ من الاولیین متوالیا او قرأ القرآن فی رکوعہ او فی سجودہ او فی موضع التشہد یجب علیہ سجود السھو للزوم تاخیر الواجب وھو السورۃ فی الصورۃ الاولی

والقرأۃ فیما لم یشرع فیہ فیما بعدہ والتحرز عن کل ذلک واجب ولو قرأ الفاتحۃ ثم السورۃ ثم الفاتحۃ لا یلزمہ السھو وقیل یلزمہ اھ (ص ۴۳۳) وفی الدر فی واجبات الصلوٰۃ ویجب تقدیم الفاتحۃ علی کل السورۃ وکذا ترک تکریرھا قبل سورۃ (الرکعتین) الاولیین اھ (ص ۴۷۹، ج ۱) وفیہ ایضا وحفظ فاتحۃ الکتاب وسورۃ واجب علی کل مسلم اھ قال الشامی ای اقصر سورۃ او ما یقوم مقامھا من ثلاث آیات قصار اھ (ص ۵۶۴، ج ۱) قلت فلو کان اعادۃ الفاتحۃ بنیۃ الضم تنوب عن وجوب السورۃ لم یکن حفظ سورۃ ما عدا الفاتحۃ واجبا و قال الطحطاوی فی حاشیۃ علی مراقی الفلاح ولو قرأ الفاتحۃ علی قصد الدعاء تنوب عن القراءۃ کما فی الفتاوی الصغری (ص ۱۴۴) وفیہ اشعار بان النیۃ لا اثر لھا، پس جس شخص کو فاتحہ کے علاوہ سورۃ یا آیات یاد ہوں اس کو فاتحہ کا بنیت ضم پڑھنا مکروہ ہے، اس سے واجب ادا نہ ہوگا، کیونکہ ضم سورۃ علاوہ فاتحہ کے واجب ہے، اور جس کو یاد نہ ہو وہ بعد فاتحہ کے تسبیح پڑھے تکرارِ فاتحہ سے سجدۂ سہو لازم ہوگا، واللہ اعلم، ۱۳ / شوال ۴۶ھ

سوال (۱۳) تراویح میں ختم قرآن میں تین بار قل ہو اللہ کا پڑھنا کیسا ہے، پورے قرآن کو ایک مرتبہ اور قل ہو اللہ	تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر تکرار قل ہو اللہ کیسا ہے،

کو تین بار پڑھنا اس امر کی بین دلیل ہے کہ قاری اس سورۃ کو دوسرے قرآن پر فضیلت دیتا ہے،

الجواب: قال فی شرح المنیۃ وقراءۃ قل ھو اللہ احد ثلث مرات عند ختم القرآن لم یستحسنھا بعض المشایخ وقال الفقیہ ابو اللیث ھذا شیئ استحسنہ اھل القرآن وائمۃ الامصار فلا بأس بہ الا ان یکون الختم فی المکتوبۃ فلا یزید علی مرۃ اھ (ص ۴۶۴) لیکن اگر تکرار کا التزام ایسا ہوگیا ہے کہ اس کے ترک پر ملامت ہوتی ہے تو اس کا ترک کرنا ضروری ہے، کما ہو مقتضی التزام المباح والمستحب، ۱۳ / شوال ۴۶ھ

سوال (۱۴) پہلی رکعت میں ایک سورۃ پڑھی، جیسے لم یکن الذین اور دوسری رکعت میں درمیان میں سے ایک	دو سورتوں کے درمیان ترکِ سورۃ مکروہ ہے

سورۃ جیسے اذا زلزلت الارض چھوڑ کر اور ایک سورۃ جیسے والعادیات پڑھی تو اس صورت میں نماز مکروہ ہوگی یا نہیں اور بیچ میں کتنی چھوٹی سورۃ چھوڑنے سے نماز مکروہ ہوتی ہے، اور اس کی مقدار کیا ہوتی ہے؟ تحریر فرمادیں۔

الجواب: یہ صورت اگر قصداً کی جائے تو مکروہ ہے، سہواً ہوجائے تو کراہت نہیں، درمیان میں ایک سورۃ کا چھوڑنا اس وقت جائز ہے جبکہ وہ اتنی بڑی سورۃ ہو کہ اس کے پڑھنے سے رکعتِ ثانیہ رکعتِ اولیٰ سے بہت لمبی ہوجائے، اور قدرے طول کا مضائقہ نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُولیٰ میں سبح اسم ربک اور ثانیہ میں سورۃ الغاشیہ پڑھی ہے، اور وہ سبح اسم ربک سے طویل ہے مگر اطول نہیں، پس ایسی صورت میں ترک مکروہ ہے، پس سورۃ القدر پڑھ کر سورۃ الزلزال پڑھنا جائز ہے، کیونکہ کلمات وحروف میں سورۃ لم یکن الذین کفروا ان دونوں کے برابر ہے، اس کے عدم ترک سے رکعتِ ثانیہ بہت طویل ہوجائے گی، پس اس کا ترک مکروہ نہیں، اور سورۃ لم یکن پڑھ کر والعٰدیٰت پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ سورۃ الزلزال اتنی لمبی نہیں کہ رکعتِ ثانیہ طویل ہوجائے، پس اس کا ترک مکروہ ہے، قال فی مراقی الفلاح مع الطحطاوی ویکرہ فصل بسورۃ بین سورتین قرأھما فی رکعتین لما فیہ من شبھۃ التفضیل والھجر وقال بعضھم لا یکرہ اذا کانت السورۃ طویلۃ (لانھا بمنزلۃ سورتین قصیرتین[عہ]) کما لو کان بینھما سورتان قصیرتان اھ، وفی الشامیۃ (ص ۱۷۰ ج ۱) ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ اما بسورۃ طویلۃ بحیث یلزم منہ اطالۃ الرکعۃ الثانیۃ اطالۃ کثیرۃ فلا یکرہ شرح المنیۃ اھ قلت وھذا ھو الذی قالہ سیدی حکیم الامۃ بن وقتہ وحاصلہ ان القاری معذور فی ترک مثل ھذہ السورۃ الطویلۃ شرعاً ولیس بمعذور فی ترک القصیر فافھم، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۴ رجب ۴۷ھ

سورۃ بنی اسرائیل کی آیت "سنۃ من قد ارسلنا" سے قرأت کی ابتداء کرنا خلاف اولیٰ ہے!

سوال (۱۵) ایک شخص نے سورۃ بنی اسرائیل سے قرأت اس طرح کی کہ سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا سے ابتداء کی، اور اس کے بعد ختم رکوع تک پڑھتا چلا گیا، نماز کے بعد زید نے کہا کہ نماز فاسد ہوگئی، کیونکہ معنی متغیر ہوگئے، اگر وان کادوا لیستفزونک سے ابتداء کی جاتی تو نماز درست ہوجاتی، عمرو نے کہا کہ نماز اب بھی درست ہوگئی ہے،

[عہ] اولانہ معذور فی الترک ۱۲

اعادہ واجب نہیں پس فیصلہ فرمایا جائے کہ ان دونوں میں صحیح قول کس کا ہے ؟

الجواب : اس طرح قرات کرنا خلاف اولیٰ ضرور تھا (لکون الوصل بین الحال و ذی الحال احسن) مگر نماز صحیح ہوگئی، اعادہ کی ضرورت نہیں، (لان نوصل الای فی انفسہا مقاطع فاذا جاز الوقف علیٰ قولہ الا قلیلا جاز الابتداء بقولہ سنۃ من قد ارسلنا ایضا لجواز الفصل بین الحال وذی الحال کقولہ تعالیٰ صبغۃ اللہ وھو حال من قولہ بل ملۃ ابراھیم حنیفا (علیٰ قول وھو کما تری منفصول) واللہ تعالیٰ اعلم۔

۱۸ رجب ۱۳۴۷ھ

قرأۃ میں قصار و وساط اور طوال کی رعایت مسنون ہے یا مستحب اور ان کی تفصیل کیا ہے!

سوال (۱۶) فجر و ظہر میں طوال عصر و عشاء میں وساط اور مغرب میں قصار کی قرأت مستحب یا مسنون ہے، مگر کہاں سے کہاں تک طوال اور کہاں سے کہاں تک وساط اور کہاں سے کہاں تک قصار ہے ؟

الجواب : یہ رعایت مسنون ہے، کیونکہ حضرت عمر رضؓ نے اپنے عمال کو بذریعہ خطوط کے اس کی تاکید فرمائی ہے، اور احادیث مرفوعہ سے بھی اس کی تائید ملتی ہے :

والطوال من قٓ الی البروج والاوساط منھا الی لم یکن والقصار منھا الی اٰخر القراٰن ھذا ھو المشھور بین الحنفیۃ وفیہ اقوال اُخر ایضا ، ۲۰ شعبان ۱۳۴۷ھ

نماز میں سورۃ انشقاق پڑھنے کا حکم

سوال (۱۷) فرضوں میں اقرأ سورۃ انشقاق، یعنی سجدہ والی سورۃ ارادۃً پڑھنی کیسی ہیں، اور ان کے پڑھنے سے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں ؟

الجواب : اگر مقتدی زیادہ نہ ہوں تو سورۃ انشقاق پڑھنے میں کچھ کراہت نہیں اور اگر زیادہ ہوں (جن کے اشتباہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو) تو سورۃ انشقاق (اور اسی طرح وہ سورتیں جن میں آیۃ سجدہ کے بعد تین آیتیں ہوں ان کا) پڑھنا مکروہ ہے،

حکم قرأۃ بسملہ بین الفاتحۃ والسورۃ

سوال (۱۸) قرأۃ بسم اللہ بین الفاتحہ والسورۃ کو علامہ شامیؒ نے حسن کہا ہے، (دقولہ ولا تکرہ اتفاقا) ولھذا اسرح فی الذخیرۃ والمجتبیٰ بانہ ان سمی بین الفاتحۃ والسورۃ المقروءۃ سرًا وجھرًا کان حسنا عند ابی حنیفۃ ورجحہ المحقق ابن الھمام وتلمیذہ الحلبی لشبھۃ الاختلاف فی کونھا اٰیۃ من کل سورۃ، بحر (شامی ص ۳۶۲ ج ۱، مصری)

لیکن اسی کے اوپر جو عبارت ہے وہ یہ ہے کہ (قولہ لاتسن) مقتضی کلام المتن ان یقال
لا یسمی لکنہ عدل عنہ لایھامہ الکراھۃ بخلاف نفی السنیۃ ثم ان ھذا قولھما
وصححہ فی البدائع قال محمد تسن ان خافت لا ان جھر بحر ونسب ابن الضیاء
فی شرح الغزنویۃ الاول الی ابی یوسف فقط فقال وھذا قول ابی یوسف وذکر
فی المصفی ان الفتوی علی قول ابی یوسف انہ یسمی فی اول کل رکعۃ ویخفیھا وذکر
فی المحیط المختار قول محمد وھو ان یسمی قبل الفاتحۃ وقبل کل سورۃ فی کل رکعۃ
وفی روایۃ الحسن ابن زیاد انہ یسمی فی الرکعۃ الاولی لا غیر وانما اختیر
قول ابی یوسف لان لفظۃ الفتوی آکد وابلغ من لفظۃ المختار ولان قول ابی یوسف
وسط وخیر الامور اوسطھا کذا فی شرح عمدۃ المصلی اھ، شامی جلد ۱ ص ۳۶۲ مصری
اور عالمگیریہ کتاب الصلوٰۃ باب چہارم صفت نماز کی، فصل نماز کی سنتوں اور اس کے آداب
کے بیان میں ہے "تعوذ کے بعد آہستہ بسم اللہ پڑھے اور بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے،
سورتوں میں فصل کے واسطے اتری ہے، یہ ظہیریہ میں مکروہاتِ صلوٰۃ کے بیان میں لکھا ہے؛
صرف بسم اللہ سے فرض قرأت ادا نہیں ہوتا، یہ جوہرۃ النیرہ میں لکھا ہے، بسم اللہ ہر رکعت
کے اول میں پڑھے، یہ امام ابو یوسفؒ کا قول ہے، یہ محیط میں ہے، اور حجۃ میں ہے کہ اسی پر
فتویٰ ہے، یہ تاتارخانیہ میں ہے، فاتحہ اور سورۃ کے درمیان میں بسم اللہ نہ پڑھے، یہ وقایہ
میں اور نقایہ میں لکھا ہے، یہی صحیح ہے، یہ بدائع اور جوہرہ نیرہ میں لکھا ہے، فتاویٰ ہندیہ
ترجمہ فتاویٰ عالمگیریہ صفحہ ۹۹ جلد ۱ مطبوعہ نولکشور ۱۳۲۵ھ،

افسوس ہے کہ فتاویٰ عالمگیریہ اصل عربی میں یہاں موجود نہیں ہے، میں نے حوالہ میں
کتاب الصلوٰۃ اور باب اور فصل درج کردی، حضور اصل عربی میں ملاحظہ فرمالیں،
عبارت عالمگیریہ سے صاف واضح ہے کہ بین الفاتحۃ والسورۃ بسم اللہ نہ پڑھے، اور لفظ
فتویٰ اور لفظ صحیح کافی ووافی طور پر اس کے دلائل ہیں، اور عبارت شامی میں وانما اختیر
سے خط کشیدہ عبارت بین الفاتحۃ والسورۃ بسم اللہ نہ پڑھنے کے اوپر دلالت صریحہ
کررہی ہے،

اس کے باوجود کہ لفظ لفظۃ الفتوی آکد وابلغ کے مقابلہ میں قول مختار امام محمدؒ کا
بھی چھوڑ دیا گیا، اور امام ابو یوسفؒ کا قول اختیار کیا گیا، بہشتی زیور میں بسم اللہ پڑھنا لکھا گیا ہے

"پھر بسم اللہ پڑھ کر الحمد پڑھے اور ولا الضالین کے بعد آمین کہے، پھر بسم اللہ پڑھ کے کوئی سورۃ پڑھے"، بہشتی زیور مدلل ومکمل حصہ دوم ص ۲۴) تو کیا فتویٰ کے مقابلہ پر حسن پر عمل کیا جائیگا حالانکہ نہ پڑھنے کو صحیح کہا گیا ہے "عالمگیری"، تو سوال یہ ہے کہ اوّل تو بہشتی زیور سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بسم اللہ کا پڑھنا بطور مباح کے ہے یا بطور سنت کے پڑھنے کو لکھا ہے لیکن پھر بھی فتویٰ آکد وابلغ کے مقابلہ پر حسن کا اختیار کرنا سمجھ میں نہ آیا، حضور والا تسلّی وتشفی فرماکر احسانِ عظیم فرماویں، ابتک میرا عمل نہ پڑھنے پر رہے، اور یوں ہی دوسروں کو مسئلہ بتاتا ہوں، ہاں البتہ جب میں تراویح میں ختم کرتا ہوں تو بسم اللہ بین السورتین کرلیتا ہوں بسبب تصادم روایت عاصمؒ کے کہ بروایت اُن کے ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ سنت ہے، و بسمل بین السورتین لسنتہ ودرایۃ دخملاً، تاکہ قرآن کے نقص کا احتمال نہ رہے، اور ایسا ہی آپ نے فتاویٰ امدادیہ میں جواب دیا ہے اسی قسم کے ایک سوال کا، لیکن یہ بات عام نمازوں میں تو نہیں، پھر بھی فتویٰ کو چھوڑ دینا کیسا، بینوا بالدلائل توجروا بالفضائل

الجواب: قول ابی یوسفؒ پر فتویٰ ہے، نے کا یہ مطلب ہے کہ تسمیہ قبل سورۃ کو مسنون نہ کہا جاوے گا، لیکن بنا برمزید احتیاط اس کو حسن سمجھ کر پڑھ لیا جاوے تو اس فتوے کے خلاف نہیں ہے، کما لا یخفی،

اور بہشتی زیور میں جو ترکیب نماز کی بیان کی ہے، اس میں دوسرے افعال کے مسنون وغیرہ ہونے سے بھی تعرض نہیں جو ان میں تصریح کی حاجت ہوتی، وفی الطحطاوی علی المراقی الفلاح (ص ۱۵۱) عن الکمال وتلمیذہ ابن امیر حاج ان الخلاف فی السنیۃ فلاخلاف انہ لوسمی لکان حسنا لشبہۃ الخلاف فی کون آیۃ من کل سورۃ الخ، باقی رہا سوال تراویح میں ہر سورۃ کے شروع پر بسم اللہ پڑھنے کا، سو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ مولانا مدفیوضہم ونیز دیگر اکابر کا یہی معمول ہے کہ ہر سورۃ پر بسم اللہ نہیں پڑھتے، بلکہ تمام قرآن میں فقط ایک سورۃ کے شروع میں پڑھتے ہیں، کیونکہ تسمیہ آیۃ من القرآن ہے، نہ کہ آیۃ من کل السورۃ، اور احکام نماز میں ائمۃ الفقہ کے قول پر عمل کرنا چاہئے، اور امام عاصمؒ کا قول خارج صلوٰۃ قابلِ عمل ہے، ونیز امام عاصمؒ کی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بسم اللہ کو بحیثیت جزء القرآن ہونے پڑھتے تھے، لہذا ختم قرآن میں شبہ نہ کیا جائے، بیش بریں نیست کہ ان کے نزدیک جو چیز مسنون تھی وہ ترک ہوگئی،

ے اور امداد الفتاویٰ میں،

سوا اس کا مضائقہ نہیں، کیونکہ ہم فقہ میں اُن کے مقلد نہیں ہیں، اور نماز جہریہ میں امام محمدؒ بھی تسمیہ کے قائل نہیں، اس لئے تسمیہ بین السورتین کو جو حسن کہتے ہیں اُن کے نزدیک بھی تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب،

احقر عبد الکریم عفی عنہ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۲۰ رمضان ۱۳۴۸ھ

ضاد کو دال پڑھنے والے کی اقتدار کا حکم،

سوال (۱۹) اکثر لوگ ضاد کی جگہ دال پڑھتے ہیں، اور صاد کی جگہ اور ثاء کی جگہ سین اور ظاء کی جگہ ذال اور زاء پڑھ لیتے ہیں، اور فقہاء کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حرف مشتبہ الصوت ہیں اور ان میں فرق بلا مشقت کے حاصل نہیں ہوتا ہے تو متاخرین کے نزدیک نماز ہو جاتی ہے، تو کیا ضاد اور دال میں بھی فرق مشکل ہے، بلا مشقت اس میں امتیاز نہیں ہو سکتا ہے، جو اکثر لوگ ایسا ہی پڑھتے ہیں، اس میں فرق نہ کرنے سے نماز ہو جائے گی، احقر اس میں بہت متردد رہتا ہے، کہ غیر المغدوب اور ولا الدالین پڑھتے ہیں، یعنی ض کو دال کے مخرج سے ادا کرتے ہیں تو اس صورت میں قاضی خاں فرماتے ہیں ولو قرأ الدالین بالدال تفسد صلوٰتہ، اور کبیری میں ہے لا تفسد صلوٰتہ، اور یہی تردد کا باعث ہے، تو کس کا قول معتبر مانا جائے البتہ شامی میں اس کی تصریح کر دی ہے، کہ متاخرین کا مذہب اوسع ہے اور متقدمین کا قول احوط ہے، اور اسی بناء پر جب مجھ کو تحقیق تمام ہو جاتی ہے کہ دال ہی پڑھا گیا ہے تو نماز کو لوٹا لیا کرتا ہوں، پس امید ہے کہ اس تردد سے احقر کی رہائی فرما دیں گے،

الجواب: اس مسئلہ میں احوط متقدمین کا قول ہے، مگر ابتلاء عام کی وجہ سے فتویٰ اس پر دیا جاتا ہے کہ ضاد کو دال پڑھنے والے کے پیچھے نماز صحیح ہو جاتی ہے، بشرطیکہ وہ اس وقت صحیح مخرج سے ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اور اگر قادر ہو اور محض سستی کی وجہ سے غلط پڑھتا ہے تو نماز فاسد ہے، یہ تو نماز کا حکم ہے، اور خود اس شخص کے لئے یہ حکم ہے کہ اس پر تصحیح مخرج واجب ہے، اگر اس کی کوشش نہ کریگا گنہگار ہوگا، واللہ اعلم، شوال ۴۸ھ

قرأت کی بعض غلطیوں کا حکم

سوال (۲۰) امام سے قرأت میں حسب ذیل غلطیاں ہوں تو فاسد ہوگی یا نہیں؟ بصورت اُولیٰ نماز دُہرانا ضروری ہے یا نہیں؟

(۱) اگر مَا وَدَّعَکَ کو مَاوَدُّعَاکَ پڑھے تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

(۲) منْ تمنّٰی یمّنی میں من زن تانی بمنی پڑھنا موجب فساد ہے کہ نہیں؟

(۳) انّما یخشی اللہ من عبادہ العلماء، میں لفظ "اللہ" کو پیش سے پڑھنے سے فساد ہوگا کہ نہیں

(۴) عصٰی فرعونُ الرسولَ میں فرعون کو زبر اور الرّسول کو پیش سے پڑھے تو نماز ہوگی کہ نہیں

(۵) وَلاالضَّالین کو ولاالضُّالّین، ض کے پیش اور ض کے بعد ء (ہمزہ) اور مد کیساتھ پڑھنا مفسدِ نماز ہے کہ نہیں،

یہ آخری غلطی عام ہے، کیا اس صورت میں نماز دُہرانا پڑے گی؟

الجواب: (۱) دال پر ضمہ پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، کما فی رد المحتار تحت قول الدر (فلو فی اعراب الی قولہ لم تفسد) ککسر قوّاما مکان فتحہا او فتح باء نعبد اھ، لیکن مِن کے بعد الف کے اضافہ میں تغیر فاحش پیدا کرتا ہے، یعنی مفرد کو تثنیہ بنا دیتا ہے، اور تثنیہ کا استعمال حق تعالیٰ شانہٗ کے حق میں کسی طرح جائز نہیں، اور اشباع کا یہ موقع نہیں اور فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ کسی حرف کے بڑھا دینے سے اگر معنی میں تغیر ہو جاوے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ غلطی فسادِ صلوٰۃ کا موجب ہے، البتہ اگر بکثرت اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہو تو عمومِ بلوٰی کے سبب فساد کا حکم نہ دیا جاوے گا، اور صلوٰۃ فاسدہ کا اعادہ ضروری ہونا محتاجِ بیان نہیں،

(۲) یہ غلطی بھی فی نفسہٖ موجبِ فساد ہے، لتغیر المعنی، ولیکن عمومِ بلوٰی کے سبب، عدمِ فساد کا فتوٰی دیا جاوے گا،

(۳) اس غلطی کو شامی نے متقدمین کے نزدیک مفسدِ صلوٰۃ فرمایا ہے، جبکہ ہمزۂ علماء کو مفتوح بھی پڑھا ہو (اور اگر مفتوح نہ پڑھا ہو بلکہ مضموم یا موقوف پڑھا ہو تو مفسد نہیں، کیونکہ اس کا مفعول ہونا مشتبہ ہوگیا) ولیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تغیر کو فاحش کہنا (یعنی الذی یکون اعتقادہ کفراً) صحیح نہیں، کیونکہ خشیت صرف خوف کے معنی میں منحصر نہیں، بلکہ دوسرے معانی میں بھی مستعمل ہے، چنانچہ قولِ خداوندی فخشینا ان یرہقہما میں اصل معنی مراد نہیں، بعض نے علمنا سے اس کی تفسیر اور بعض نے کرہنا سے، اسی طرح "یخشی اللہ" میں زمخشری وغیرہ نے رفع کی قرأت (شاذہ) نقل کی ہے، اور صاحب روح المعانی نے خشیۃ کو تعظیم پر محمول کیا ہے، و نیز ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ خشیت کے معنی اختیار (یعنی اجتباء) کے بھی آتے ہیں، پس جب اس غلطی کے

ہوتے ہوئے ایک صحیح معنی ہو سکتے ہیں تو متقدمین کے قول پر بھی نماز فاسد نہ ہوگی، واللہ اعلم اور متاخرین کے قول میں تو بہت گنجائش ہے، کہ باوجود تغیر فاحش کے بھی فساد صلوٰۃ کا حکم نہیں کرتے، حاصل یہ کہ اس غلطی سے نہ متقدمین کے قول پر نماز فاسد ہوگی نہ متاخرین کے قول پر، واللہ اعلم بالصواب،

(۴) یہ غلطی متقدمین کے قول پر موجب فساد ہے، ولیکن متاخرین کے نزدیک موجب فساد نہیں، اور قول متاخرین پر فتویٰ ہونا خلاصہ میں نوازل سے منقول ہے، لہٰذا عوام کے واسطے اسی میں سہولت ہے، ولیکن اگر اس قسم کی غلطی بکثرت واقع نہ ہوتی ہو تو اعادہ نماز کا کر لیا جاوے، لیکن قول متقدمین احوط واوفق بالقیاس ہے،

(۵) اس سے بھی نماز فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے معنی متغیر نہیں ہوتے،

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۱ر محرم ۵۲ھ

حکم جہر بسم اللہ در سورۂ اقرأ **سوال** (۲۱) ....

.... زید نے رمضان شریف میں نماز تراویح میں بروز ختم قرآن شریف سورۃ اقرأ شروع کرتے وقت زور سے بسم اللہ الرحمٰن پڑھی تو عمرو نے اس پر اعتراض کیا کہ نہ پڑھنا چاہئے، اور کہتا ہے کہ قرآن شریف تسلسل کے ساتھ پڑھا جا رہا تھا، بسم اللہ کو درمیان میں کیوں حائل کیا، زید کہتا ہے کہ بسم اللہ جزو قرآن ہے، اگر میں بسم اللہ جہر کے ساتھ نہ پڑھتا تو ایک جزو قرآن شریف کا رہ جاتا، لیکن عمرو زید کی اس گفتگو پر یقین نہیں کرتا اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا یہ فعل کس حد تک صحیح ہے اور کس کی بات تسلیم کیجائے اگر دونوں راہ حق پر نہیں ہیں تو براہ شرع شریف جو حکم ہو اس سے آگاہی فرما کر طمانیت بخشی جاوے،

الجواب: زید کا قول صحیح ہے، تمام قرآن میں ایک جگہ کسی سورۃ پر بسم اللہ کا جہر لازم ہے تاکہ ختم پورا ہو جاوے، اور سورۂ اقرأ پر جہر کرنا ہمارے اکابر کا مختار ہے، کیونکہ یہ سورۃ نزول میں مقدم ہے، اور عمرو کا یہ کہنا کہ اس سے تسلسل قرآن جاتا رہا بالکل غلط ہے، کیونکہ بسم اللہ بھی تو قرآن ہی ہے، پس قرآن کی آیت سے تسلسل قرآن میں کیوں کمی آجاوے گی، ۲ر ذیقعدہ ۴۵ھ

دو رکعتوں میں ایک چھوٹی سورۃ پڑھنا **سوال** (۲۲) زید نے نماز تراویح میں اَرَاَیْتَ الَّذِی

ہیں دو رکعت اس طور پر کی کہ پہلی رکعت میں لفظ "مسکین" تک اور دوسری رکعت میں ختم تک، آیا یہ دو رکعتیں ہوئیں یا نہیں، اگر نہیں ہوئیں تو اب اس کی مکافات کیا ہو سکتی ہے؟

الجواب: یہ دونوں رکعتیں صحیح ہو گئیں، مگر ایسا کرنا مناسب نہ تھا، ایسی چھوٹی سورتوں میں دو رکعتیں ایک سورۃ کے اندر نہ کرنا چاہیئے، کہ اس صورت سے ہر رکعت میں تین آیات نہیں ہوتیں۔

حکم تکرار قل ہو اللہ احد

سوال (۲۳) قل ہو اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ تین مرتبہ پڑھنا مسنون ہے، اگر کوئی شخص صرف ایک مرتبہ تلاوت کرتا ہے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے، اس بارہ میں جو شرع شریف کا حکم ہو اس سے آگاہی بخشی جاوے۔

الجواب: تکرار قل ہو اللہ فی نفسہ مباح ہے، مگر جہاں ترک تکرار سے اعتراض ہوتا ہو وہاں ترک لازم ہے، تاکہ لوگ اس کو واجب نہ سمجھ لیں، واللہ اعلم، ۲ ذیقعدہ ۴۵ھ

مسئلہ قرأۃ

سوال (۲۴)................................ زید نے مغرب کی نماز میں امام بن کر دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد سورۃ مزمل کی اخیر کی آیتوں میں سے واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللہ قرضاً حسناً وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ہو خیرا واعظم اجراط واستغفروا اللہ، ان اللہ غفور الرحیم ۵ تک جہاں تین جگہ ط اور اخیر میں ۵ علامت آیت موجود ہے، پڑھی، اور باقی رکعت کو حسب دستور ادا کیا، فاتحہ کے بعد اسی قدر آیت قرآنی پڑھنے سے اس کی نماز صحیح ہوئی یا نہیں، بینوا توجروا،

ھو المصوب: صورت مسئول عنہا میں زید کی نماز مع الکراہتہ صحیح ہوئی، کیونکہ اس کو پہلی دو رکعت میں فاتحہ کے بعد ایک سورۃ یا چھوٹی تین آیتیں یا بڑی ایک آیت پڑھنا واجب تھا، لیکن اس نے قصداً ایک آیت سے بھی کم پڑھ کر واجب کو ترک کیا، اس لئے اس پر نماز پھیر پڑھنی واجب ہے، اور نماز کو اعادہ نہ کرنے سے وہ فاسق اور گنہگار ہوا، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری وغیرہ کی عبارت اس پر شاہد ہے، عالمگیری میں ہے ویجب قراءۃ الفاتحۃ وضم السورۃ او ما یقوم مقامہا من ثلث آیات قصار او آیۃ طویلۃ فی الاولیین بعد الفاتحۃ کذا فی النہر الفائق انتہی، اور درمختار میں ہے، ولہا واجبات لا تفسد بترکہا وتعاد وجوبا فی العمد والسہو ان لم یسجد لہ وان لم یعدہا یکون فاسقا آثما انتہی، اور شامی میں ہے تحت

قولہ وتعاد وجوبا ای بترك هذه الواجبات او واحد منها انتهٰی، اور ہدایہ کے مکروہات الصلوٰۃ میں ہے والصلوٰۃ جائزۃ فی جمیع ذلك لاستجماع شرائطها وتعاد علی وجہ غیر مکروہ وهو الحکم فی کل صلوٰۃ ادیت مع الکراهة کما اذا ترك واجبا من واجبات الصلوٰۃ انتهٰی، اور جامع الرموز میں ہے وواجبها قرأۃ خصوص الفاتحة وضم مقدار سورۃ من اٰیة طویلة او ثلث قصار، وفی الکلام اشارۃ الی انه یجب تاخیر السورۃ عن الفاتحة والی انه یجب ان یقرأ مرۃ کما فی المحیط، والی انها واجبة ولذا کان تارکها یؤمر بالاعادۃ کما فی القنیة والی ان نفس السورۃ واجبة ایضا کما قال القاضی فی الجامع (اس کے بعد مجیب نے اوقاف قرآن کی بحث طرداً لکھی ہے ہم نے اختصاراً حذف کر دیا) اس لئے صورتِ مسئول عنہا میں امام مذکور کی قراءت میں بعد فاتحہ کے ایک آیت بھی نہیں پائی گئی، کیونکہ وہاں تین جگہ ط اور اخیر میں ہ علامت آیۃ موجود ہے، اسی سبب سے وہ تارکِ واجب ہوا، اور پھر نماز کو اعادہ نہ کرنے کی وجہ سے شرعاً فاسق اور گنہگار بھی ہوا، ہکذا حکم الکتاب واللہ اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب، حررہ الراجی رحمة ربه الولی محمد رمضان علی لکوشا کالوی

اقول وباللہ التوفیق وبیدہ ازمة التحقیق، الجواب جواب لایماثل جوابَ المنکر علی خلاف الصواب، لان البعض قد استشکل بعبارۃ الهندیه والشامی حیث حررت فی مقامهما انه لو قرأ بعض اٰیة الکرسی فی رکعة والبعض فی رکعة اخریٰ لا یجوز عند الامام وعند العامة یجوز ویکتفی فلا تثبت من قول الجواز والکفایة الصحة الکاملة لترك الواجب وهو قراءۃ الاٰیة التامة فی رکعة واحدۃ فعلیه ان یعید وجوبا فی العمد والسهو ان لم یسجد له و ان لم یعدها یکون فاسقاً اثما کما فی الوقایه فرض القرأۃ اٰیة ...... و المکتفی بها مسیئ لترك الواجب وفی القدوری یقرأ فاتحة الکتاب وسورۃ او ثلاث اٰیات من ای سورۃ شاء، وفی الذخیرۃ قرأۃ ثلاث اٰیات قصاراً او اٰیة طویلة من واجبات الصلوٰۃ بالاجماع فلو قرأ مع الفاتحة اٰیة قصیرۃ سهوا فعلیه السهو وفی الهندیة لو قرأ اقل من اٰیة وان کان حرفا یکرہ وفی الدر المختار کل صلوٰۃ ادیت مع کراهة التحریم تجب اعادتها واللہ اعلم، محمد تبارک علی واشگنج

الجواب: حقیقت یہ ہے کہ جو مقدار قرآت کی فرض ہے وہی مقدار سورۂ فاتحہ کے بعد واجب ہے، کیونکہ فقہائے کرام جو الفاظ یعنی سورۃ او ما یقوم مقامہا وغیرہ فرض قرآت میں ذکر کرتے ہیں وہی الفاظ واجبات میں ذکر کرتے ہیں، کما لا یخفی، بس اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیت طویلہ کا حصہ جو تین چھوٹی آیتوں کے برابر ہو وہ تین آیتوں کے قائم مقام ہے یا نہیں، سو عالمگیری شامی وغیرہ کتب فقہ میں مصرح ہے اذا قرأ آیۃ طویلۃ فی الرکعتین نحو آیۃ الکرسی و آیۃ المداینۃ البعض فی رکعۃ والبعض فی اخری عامتھم علی انہ یجوز کذا فی المحیط، اس سے ثابت ہوا کہ آیت طویلہ کا جزء مطلقاً کافی ہے، یعنی بدون فاتحہ کافی عن الفرض ہے، اور مع الفاتحہ کافی عن الواجب ہے، پس جواب مرسل کی تصدیق میں جو لکھا ہے فی الوقایۃ فرض القرأۃ آیۃ والمکتفی بہا مسیئ لترک الواجب، اس میں اکتفاء علی الآیۃ بدون الفاتحۃ کا ذکر ہے، اور ہندیہ سے جو لو قرأ اقل من آیۃ وان کان حرفا یکرہ نقل کیا ہے وہ عبارت اس وقت ملی نہیں، اگر اس میں ہو تو مراد کراہتِ تنزیہیہ لی جاوے گی، للجمع بین الروایات، اور عبارات فقہیہ جو واجبات صلوٰۃ میں ہیں کہ وضم السورۃ او ما یقوم مقامہا من ثلاث آیات قصار او آیۃ طویلۃ یہ بر سبیل تمثیل ہے آیۃ طویلہ کے حصہ کا اس میں ذکر نہیں نفیاً نہ اثباتاً، اور دوسری جگہ آیت کے جزء کا کافی ہونا مصرح ہے، تو اس محکم کو مقدم رکھنا ضروری ہے، اس تمثیل کی بناء پر اس محکم جزئیہ میں کلام نہیں ہوسکتا، لہٰذا صورتِ سوال میں نماز بالکل درست ہوگئی، ترکِ واجب نہیں ہوا، البتہ عالمگیریہ کی روایت جس کے متعلق گذر چکا ہے کہ ہمیں نہیں ملی اس کی بناء پر خلاف اولیٰ کا حکم ضرور کیا جاویگا لترک السنۃ۔ کتبہ عبدالکریم
۲۳ رجب ۵۳ھ

فصل فی الوتر و دعاء القنوت

نماز فجر میں دعاء قنوت پڑھنے کا حکم | **سوال** (۱) موجودہ زمانہ میں نماز فجر میں دعاء قنوت پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب: جائز ہے، واللہ اعلم، بلکہ ایک قول پر مستحب ہے، فافہم، ۳ رمضان ۴۰ھ

نماز وتر کے لئے مطلق وتر کی نیت چاہیے یا وتر واجب کہنا ضروری ہے؟ | **سوال** (۲) .... صلوٰۃ وتر میں مطلق وتر کی نیت کرنا

چاہئے یا واجب وتر کی، عالمگیریہ فتاویٰ ہندیہ میں باب نیت میں مطلق وتر کی نیت کو لکھا ہے ... وجوب کی بنا پر اختلاف روایت کے اور علامہ شامیؒ نے خلاف اس کے در باب وتر والنوافل میں لکھا ہے قولہ لا الوتر الواجب الذی ینبغی ان یفہم من قولہم انہ لاینوی انہ واجب لایلزم تعیین الواجب .... لا منعہ من ذلک لانہ ان کان حنفیاً ینبغی ان ینویہ لیطابق اعتقادہ وان کان غیرہ فلا تضرہ تلک النیۃ (بحر) لکھا ہے کہ اب قول فیصل در باب نیت اور علامہ شامیؒ کی اس عبارت کا مطلب بیان فرما کر ہدایت فرمادیں، کیونکہ یہاں کے علماء میں بہت اختلاف ہو رہا ہے،

الجواب: علامہ شامی کی یہ عبارت اقتداء وتر خلف الشافعی کے متعلق ہے، کیونکہ درمختار کی عبارت بھی اس کے متعلق ہے کہ اقتداء بالشافعی کے وقت وتر واجب کی نیت نہ کرے، بلکہ صرف وتر کی نیت کرے، تاکہ دونوں کی نیت یعنی امام اور مقتدی کی متحد رہے، اختلاف نہ ہو، علامہ شامیؒ کہتے ہیں کہ اگر اس وقت بھی وتر واجب کی نیت کرے تو مضر نہیں، جائز ہے، باقی منفرد کے لئے اداء وتر کے واسطے مطلق نیت وتر بھی کافی ہے، اور نیت وتر واجب بھی کافی ہے، اس میں یہی قول فیصل ہے کہ ہر دو طرح نیت وتر درست ہے، اس میں اختلاف کرنا محض ایک لایعنی ولاطائل امر ہے، واللہ اعلم ۲۲ ربیع ۲ ۴۳ھ

وتر کا قعدۂ اولیٰ فرض ہے یا واجب اور اس کے ترک سے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

سوال (۳) وتر کا قعدۂ اولیٰ فرض ہے یا واجب، اس کے ترک سے نماز ہو سکتی ہے؟

الجواب: قعدۂ اولیٰ واجب ہے، اگر سہواً ترک ہو جاوے تو سجدۂ سہو سے نماز وتر درست ہو جاوے گی، قال فی الدر وھو ثلث رکعات بتسلیمۃ کالمغرب حتی لو نسی لقعود لایعود ولو عاد ینبغی الفساد کما سیجیئ اھ والراجح عدم الفساد ونقل عن البحر انہ الحق ۱۲ (شامی) فقط، ۲۷ ربیع الاول ۴۵ھ

حکم اقتداء حنفی باشافعی در وتر وشرائط آں،

سوال (۴) ماہ رمضان میں بعد تراویح کے وتر کی نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، اس وتر میں دو جماعت ہوتی ہیں، ایک امام حنفی، دوسرے شافعی .... الگ الگ اپنے اپنے امام سے پڑھتے ہیں، دوسری صف میں ایک ہی ساتھ ہوتے ہیں، اور اسی وتر میں الگ پڑھنا میرے خیال میں نہیں آتا، غرضکہ ہمارے مرشد نے بھی تاکید کی کہ ایک ہی جماعت سے پڑھ لیا کریں، ہمارے پیر بھائی تو پڑھتے ہیں

آئندہ بھی پڑھیں گے، کتاب شہابیہ مذہب شافعی کی اور شرائط المذہب میں بھی پڑھنے کا طریقہ لکھا ہوا ہے، ان کتابوں کو دکھانے سے بھی نہ حنفی نہ شافعی کوئی نہیں مانتا اس لئے اس وتر کی نماز کو ایک ہی جماعت سے پڑھیں یا نہ پڑھیں، حکم شرعی صادر فرماویں،

الجواب: حنفی کو وتر میں شافعی المذہب کی اقتدار قول اصح کی بناء پر جائز ہے بشرطیکہ وہ تین رکعت بدون فصل بالسلام کے پڑھے، اور بشرطیکہ امام نیت مطلق وتر کی کرے، وتر تطوع یا وتر مسنون کی نیت نہ کرے قال فی الدر وصح الاقتداء فیہ بشافعی لم یفصلہ بسلام لاان فصلہ علی الاصح فیھما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد اھ قال الشامی خلافا لما فی الارشاد من انہ لایجوز اصلا باجماع اصحابنا لانہ اقتداء المفترض بالمتنفل اھ ثم قال تحت قولہ للاتحاد و واستشکلہ فی الفتح بانہ اقتداء المفترض بالمتنفل وان لم یخطر بخاطرہ عند النیۃ صفۃ السنیۃ اوغیرھا بل مجرد الوتر لتقرر النفلیۃ فی اعتقادہ وردہ فی البحر بما صرح فی التجنیس ایضا من ان الامام ان نوی الوتر وھو یراہ سنۃ جاز الاقتداء کمن صلی الظھر خلف من یری ان الرکوع سنۃ وان نواہ بنیۃ التطوع لا یصح الا قتداء لانہ یصیر اقتداء المفترض بالمتنفل اھ (ص ۶۹۹ ج ۱) ہرچند کہ حنفی کی اقتدار شافعی کے ساتھ وتر میں قول اصح پر جائز ہے، مگر مشائخ کا اسمیں اختلاف ہے بعض مشائخ نے اجازت نہیں دی اور جو جائز کرتے ہیں وہ بھی اس شرط سے جائز کرتے ہیں کہ کہ شافعی امام وتر مطلق کی نیت کرے، وتر تطوع یا مسنون کی نیت نہ کرے، اور اس کی رعایت کا علم قدرے دشوار ہے، اس لئے جو حنفی جماعت وتر حنفی امام کے ساتھ شافعیہ سے الگ کرتے ہیں اُن پر ملامت نہیں کی جاسکتی، ۱۰ شعبان ۴۳ھ

حکم قنوتِ نازلہ بزبانِ عربی | **سوال** (۵) ماقولکم یرحمکم اللہ فی القنوت النوازل کیف ھوھل قبل الرکوع ام بعدہ وھل یرفع یدیہ ویکبر لہ ام لا، وھل یضع فیہ یدیہ ام یرسلھما وھل یخافت بہ ام یجھر؟

الجواب: قال ... الطحطاوی فی حاشیتہ علی مراقی الفلاح (ص ۱۵۰) تحت قول الماتن ولیسن وضع الرجل یدہ الیمنی علی الیسریٰ ما نصہ ولابد فی ذلک القیام ان یکون فیہ ذکر مسنون ومالافلا مالایطل فحینئذ

یضع کما فی السراج وغیرہ وقال محمد لا یضع حتی یشرع فی القراءۃ فهو عندهما
رای الشیخین ۱۲ منہ) سنۃ قیام فیه ذکر مشروع وعندہ سنۃ للقراءۃ فیرسل
عندہ حالۃ الثناء والقنوت وفی صلوٰۃ الجنازۃ وعندهما یعتمد فی الکل و
اجمعوا علی انه یرسل فی القومۃ بین الرکوع والسجود وبین تکبیرات العیدین
بعدم الذکر والقراءۃ فی هذه المواضع فان قیل فی القومۃ من الرکوع ذکر مشروع
وهو التسبیح والتحمید فینبغی ان یضع فیها علی قولهما اجیب بان المراد قیام
له قرار وهذا لا قرار له اھ وهل یضع فیها فی صلوٰۃ التسبیح لکون القیام
له قرار فیه ذکر مشروع براجع اھ وقال الشامی ومقتضاہ ان یعتمد بیدیه
(فی القومۃ) فی النافلۃ ولم ار من صرح به تامل لکنه مقتضی اطلاق الاصلین
المارین ومقتضاہ ان یعتمد فی صلوٰۃ التسبیح ایضا اھ (ص ۵۰۹ ج ۱) قلت وقد
مر تصریح الطحطاوی بالاعتماد فی القنوت عند الشیخین فینبغی ان
یعتمد بیدیه فی قنوت النازلہ سواء کان قبل الرکوع او بعدہ واما انه قبل الرکوع او بعدہ فقال الطحطاوی
فی حاشیۃ مراقی الفلاح واما القنوت فی الصلوات کلها عند النوازل فلم
یقل به الا الشافعی ولیس منا هبنا قال الحموی وینبغی ان یکون القنوت
قبل الرکوع فی الرکعۃ الاخیرۃ ویکبر له اھ (ص ۲۲۰) قلت اراد الحموی
قنوت النازلۃ لذکرہ ذلک تحت قول الاشباہ اذا نزل بالمسلمین نازلۃ
قنت الامام فی صلوٰۃ الفجر اھ (ص ۳۹۹) وقال الشامی وهل القنوت هنا قبل
الرکوع ام بعدہ لم ارہ والذی یظهر لی ان المقتدی یتابع امامه الا اذا جهر
فیؤمن وانه یقنت بعد الرکوع لا قبله بدلیل ان مایستدل به الشافعی علی
قنوت الفجر وفیه التصریح بالقنوت بعد الرکوع حمله علمائنا علی القنوت
للنازلۃ ثم رأیت الشرنبلالی فی مراقی الفلاح صرح بانه بعدہ واستظهر
الحموی انه قبله والاظهر ما قلناہ واللہ اعلم اھ (ص ۶۰۲ ج ۱) قلت ولکن
الآثار تشهد لما قاله الحموی ایضا فعن طارق بن شهاب قال صلیت
خلف عمر صلوٰۃ الصبح فلما فرغ من القرأۃ فی الرکعۃ الثانیۃ کبر ثم
قنت ثم کبر فرکع رواہ الطحاوی واسنادہ صحیح وعن ابی عبد الرحمن

عن علی انہ کان یقنت فی صلوٰۃ الصبح قبل الرکوع رواہ الطحاوی ایضا وسندہ حسن وعن ابی رجاء عن ابن عباس قال صلیت معہ الفجر فقنت قبل الرکعۃ رواہ الطحاوی ایضا واسنادہ صحیح کذا فی آثار السنن (ص ۱۹ ج ۲) فلا وجہ لورود قول الحموی فکان الشافعی لم یر قبل الرکوع محلا للقنوت فلم یقل بہ فی الفجر ولا فی الوتر ورأہ الحنفیۃ محلا لہ فقالوا بہ فی الوتر فکذا فی قنوت النازلۃ ولکن الافضل ھنا بعد الرکوع لانہ ھو الثابت مرفوعًا، واما انہ یرفع لہ ام لا فالدلیل الذی استدل بہ الحنفیۃ للرفع فی قنوت الوتر لا یعم غیرہ بل یختص بہ وھو اثر ابراھیم النخعی عند الطحاوی بسند صحیح قال ترفع الایدی فی سبع مواطن فی افتتاح الصلوٰۃ وفی التکبیر للقنوت فی الوتر وعن الاسود عن عبد اللہ کان یقرأ فی آخر رکعۃ من الوتر قل ھو اللہ ثم یرفع یدیہ فیقنت قبل الرکعۃ رواہ البخاری فی جزء رفع الیدین واسنادہ صحیح اھ آثار السنن (ص ۱۷، ۱۸ ج ۲) ولم ار من صرح بالرفع فی قنوت النوازل وفی رحمۃ الامۃ والسنۃ ان یقنت فی الصبح رواہ الشافعی عن الخلفاء الراشدین الاربعۃ وھو قول مالک وقال ابوحنیفۃ لا یسن فی الصبح قنوت وکان مالک لا یرفع یدیہ فی القنوت واستحبہ الشافعی ومحلہ عند الشافعی بعد الرکوع وقال مالک قبل الرکوع اھ (ص ۱۹) قلت وفی المدونۃ قال مالک فی القنوت فی الصبح کل ذلک واسع قبل الرکوع وبعد الرکوع قال مالک والذی اخذ فی خاصۃ نفسی قبل الرکوع اھ (ص ۱۰۰ ج ۱) قلت وقد صرح علماءنا بان یؤخذ بقول مالک فیما لا نص فیہ فی المذھب لکون مذھبہ اقرب المذاھب الینا کما فی رد المحتار ولم نظفر بموضعہ الآن، فینبغی ان لا ترفع الایدی فی قنوت النوازل نعم اذا قنت قبل الرکوع فلا یدع التکبیر لہ، لقول الحموی ویکبر لہ ولثبوتہ فی الآثار واذا قنت بعد الرکوع فلم نر التصریح بالتکبیر لہ فی قول فقیہ فاما ان یقاس علی القنوت قبل الرکوع واما ان یترک علی الاصل ولکن الترک،

هو الذی ینبغی لکون القیاس فیهما مع الفارق فان التکبیر للقنوت قبل الرکوع لعله للفصل عن القراءة والانتقال من حال الی حال ولا کذلک بعد الرکوع فان التسمیع هناک کاف للفصل والله تعالی اعلم، واما الجهر والاخفاء فلم یتعرض فقهاءنا بالبحث عنهما فی قنوت النوازل ایضا واختلفوا فی قنوت الوتر فقال فی الدر وقنت فیه مخافتا علی الاصح ولو اماما لحدیث خیر الدعاء الخفی اھ قال الشامی وفصل بعضهم بین ان یعلمه القوم فالافضل للامام الاخفاء والا فالجهر اھ وفی المنیة من اختار الجهر اختاره دون جهر القراءة اھ (ص ۶۹۸ ج ۱) وقد تقدم قول الشامی فی قنوت النوازل و الذی یظهر لی ان المقتدی یتابع امامه (ای یقرء القنوت اذا قنت) الا اذا جهر فیؤمن اھ وفی المدونة لمالک قلت لابن القاسم فهل یجهر بالدعاء فی القنوت اماما کان او غیر امام قال لا یجهر قلت وهو قول مالک قال هو رأیی اھ (ص ۱۰۰ ج ۱) وفی الوجیز للغزالی الشافعی رح ثم الجهر بالقنوت مشروع علی الظاهر والمأموم یؤمن فان لم یسمع صوته قنت علی احسن الوجهین اھ (ص ۲۶ ج ۱) قلت ولکن العوام لا یعلمون قنوت النوازل فالافضل الجهر به کما هو مقتضی تفصیل بعضهم وهو تفصیل حسن و والله تعالی اعلم، ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ

وتر میں شافعیہ کی اقتداء درست ہے یا نہیں؟

سوال (۶)

یہاں زمانہ دراز سے حنفی شافعی رہتے ہیں، تقریباً پچیس تیس سال کے آگے حنفی امام مقرر تھے، کُل حنفی شافعی اس امام کے اتباع میں نماز پنجگانہ و وتر وتراویح وجمعہ وعیدین وغیرہ ادا کرتے تھے، اب تقریباً پچیس سال سے دوسرے شہر کے حافظ شافعی امام مقرر ہیں، کُل حنفی وشافعی ایک ہی امام کے پیچھے ایک ہی جماعت سے نماز پنجگانہ و وتر وتراویح وجمعہ وعیدین باتفاق تمام ادا کرتے آئے ہیں، وقت عصر وعشاء وصبح میں شافعی امام حنفی مسئلہ کی رعایت سے تاخیر سے ادا کرتے آئے ہیں، رمضان شریف میں وتر بھی حسبِ عادتِ قدیم شافعی وحنفی علماء کی صلاح پر ایک ہی سلام سے شافعی امام پڑھاتے ہیں، یک بیک ایک صاحب

کہیں سے آکر شافعی وحنفی میں پھوٹ ڈالنے کے قصد سے کہا کہ نماز وتر بہ مذہب شافعی ایک سلام سے جائز نہیں، حنفی وشافعی جدا جدا دو جماعت سے ہی پڑھنا جائز ہوگا، اہل جماعت سے ایک دو صاحب ان کی بات کا اتباع کرکے وتر دو سلام سے پڑھنا چاہتے ہیں، مگر باقی اہل جماعت حسب عادتِ قدیم ایک ہی سلام سے پڑھنا چاہتے ہیں، کیونکہ دو سلام کے پڑھنے سے حنفیوں کی دوسری جماعت کرنی ہوگی، یہی افتراق آئندہ دوسرے اوقات میں بھی دو جماعت کا باعث ہوگا، پس ایک ہی مسجد میں دو جماعت ہونے سے ضرور فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے، اسی لئے اتفاق کو بحال رکھنے کے لئے اکثروں کا ارادہ مصمم ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق شرائط المذاہب اردو باب الوتر والنوافل میں ہے یعنی اور افضل ہے نزدیک ائمہ ثلثہ کے وتر فصل سے پڑھنا لیکن مقتدی حنفی ہوں تو وصل سے پڑھے نہیں تو اقتدا حنفی کی درست نہ ہوگی، انتہیٰ، چونکہ یہ عبارت اردو ہے، اس کی اصل عبارت کس کتاب میں ہے، معلوم نہیں، اور کتاب الاوطار ترجمہ در مختار میں ہے وصح الاقتداء فیه ففی غیرہ اولیٰ ان لم یتحقق منه ما یفسدھا فی اعتقادہ فی الاصح کما بسط فی البحر بشافعی مثلا لم یفصله بسلام لا ان فصله علی الاصح فیھما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد، اور درست ہے وتر میں اقتدا حنفی کا پیچھے شافعی کے مثلاً جو وتر کو سلام سے جدا نہ کردے، یعنی دو رکعت پر سلام نہ پھیر دے تو وتر کے غیر میں اقتدا بطریقِ اولیٰ درست ہے، بشرطیکہ امام سے کوئی ایسا امر متحقق نہ ہو جو نماز کا مفسد ہو، انتہیٰ، باقی کتاب میں دیکھ لیں،

اور عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ مؤلفہ حضرت مولانا عبدالحئ صاحب لکھنوی مرحوم میں ہے قوله خلافاً للشافعی ای فی احد اقواله الثلثة احدھا کقولنا وثانیھا یوتر ثلثا بتسلیمتین بان یتشھد علی راس الرکعتین ویسلم ثم یصلی رکعة واحدة وثالثھا انه مخیر بین ان یوتر بثلث بتسلیمة انتھی، اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بمذہب امام شافعی وتر کے بارے میں تین روایت ہیں، جن میں ایک روایت موافق حنفیہ ایک ہی سلام سے تین رکعت، اور ایک روایت میں تخییر ایک رکعت یا تین رکعت بیک سلام، ان روایات کی تفصیل سے اطلاع فرمادیں، اس مسئلہ کے متعلق مقام واقعہ یعنی کذمور۔ اولاً، لون کے مذکورہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قول فیصل

کیا ہو سکتا ہے بحوالہ کتب مع عبارت عربی تحریر فرما کر اہل جماعت کو ممنون فرماویں، کیونکہ افتراق کا سخت اندیشہ ہے، مذکور نماز وتر شافعی کے پیچھے حنفی کو حنفی کے پیچھے شافعی کو جائز نہ ہو تو کتنے سال کی نماز قضا کرنی چاہیے، صاف صاف مع حوالہ کتب و مزین مُہر و دستخط سرفراز فرماویں؟

الجواب: قال فی رحمۃ الامۃ واقل الوتر رکعۃ واکثرہ احدی عشر رکعۃ وادنی الکمال ثلث رکعات عند الشافعی واحمد وقال ابوحنیفۃ الوتر ثلث رکعات بتسلیمۃ واحدۃ لایزاد ولاینقص وقال مالک الوتر رکعۃ قبلها شفع منفصل عنها اھ (ص ۲۳) اس سے معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک وتر کی ایک رکعت جائز ہے، مگر کامل نہیں، وتر کامل ان کے نزدیک بھی تین رکعات ایک سلام کے ساتھ ہیں، کما ھو مفهوم قولہ وادنی الکمال ثلث رکعات الخ ولیس محملہ ثلث بالفصل بالسلام بینهن لذکرہ ذلک فیما بعد من مذهب المالک واللہ اعلم، اور زیادہ تحقیق مذہب شافعی کی علماء شافعیہ سے کی جاوے،

رہا یہ کہ حنفی کو شافعی کی اقتداء وتر میں جائز ہے یا نہیں، تو اصح قول حنفیہ یہ ہے کہ چند شرائط سے جائز ہے (۱) یہ کہ وہ تین رکعات بدون فصل بالسلام کے پڑھے اور درمیان دو رکعت پر قعدہ کرے (۲) یہ کہ وہ مطلق وتر کی نیت کرے، وتر کی نیت کرے وتر تطوع یا وتر مسنون کی نیت نہ کرے، صرّح بہ فی الشامیہ (ص ۶۹۹ ج ۱) واللہ اعلم

۱۲ شعبان ۴۵ھ،

رمضان میں وتر باجماعت افضل ہے یا بغیر جماعت بعد تہجد؟	**سوال** (۷)............ تہجد گذار کے لئے غیر رمضان میں افضل ہے

کہ وتر بعد تہجد کے پڑھے، بشرطیکہ جاگنے پر اعتماد ہو، مگر رمضان میں وتر باجماعت افضل ہے یا بعد تہجد، جواب مع نقل عبارات وحوالہ کتب معتبرہ ارقام فرماکر عند اللہ ماجور وعند الناس مشکور رہوں،

الجواب من بعض العلماء: تہجد گذار کو رمضان میں بھی افضل ہے کہ وتر تہجد کے بعد پڑھے، جبکہ جاگنے پر اعتماد ہو، وتر آخر شب میں پڑھنے کے متعلق حدیث میں فضیلت آئی ہے، عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ایکم خاف ان لایقوم

من آخر الليل فليوتر ثم ليرقد ومن وثق بقيام من آخر الليل فليوتر من آخره فان قرأة آخر الليل محضورة وذلك افضل (رواه احمد ومسلم والترمذي وابن ماجة) یہ حکم عام ہے رمضان اور غیر رمضان دونوں کو شامل ہے اور یہ عمومیت درج ذیل اقوال سے مستفاد ہے؛ فلعل من تأخره عن الجماعة فيه واحب ان يصلي آخر الليل فانه افضل كما قال عمر والتي ينامون عنها افضل وعلم من قوله عليه السلام اجعلوا آخر صلوتكم بالليل وترا فأخره لذلك فلا يدل ذلك على ان الافضل فيه ترك الجماعة لمن احب ان يوتر اول الليل كما يعطيه اطلاق جواب هولاء انتهى (كبيري شرح منيه ص ۴۰۱ ج۱) وايضاً جاء في شرح المنية انه بناء على استحباب تاخيره مطلقا لمن يأمن فواته واستحباب جعله آخر صلوة الليل الخ (ص ۳۸۵ ج۱) وان من تأخر عن الجماعة فيه واحب ان يصلي آخر الليل فانه افضل كما قال والتي ينامون عنها افضل وعلم من قوله عليه السلام اجعلوا آخر صلوتكم بالليل وترا فأخره لذلك والجماعة اذ ذاك متعذرة فلا يدل ذلك على ان الافضل فيه ترك الجماعة لمن احب ان يوتر اول الليل كما يفهم من الطلاق اختيارهم (شرح مختصر الوقاية للعلامة القاري ص ۱۹۶ ج۱) البتہ جو شخص وتر اول شب میں پڑھنا چاہے اس کیلئے رمضان المبارک میں جماعت سے پڑھنا افضل ہے، اگر تہجد گذار رمضان میں وتر بعد تہجد کے پڑھنا چاہے تو اسکو چاہئے کہ اپنے مقام پر چلا جاوے، وتر کی جماعت کے پیچھے الگ بیٹھے رہنا مذموم ہے، بوجہ مشابہ ہونے اعراض عن الجماعۃ کے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب،

کتبہ سید عبدالرحیم ۲۳ر رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ

الجواب من جامع امداد الاحکام:- جواب مذکور ایک روایت کے موافق صحیح ہے، مگر دوسری روایت یہ ہے کہ رمضان میں وتر جماعت سے مسجد میں پڑھنا افضل ہے تنہا گھر میں پڑھنا افضل نہیں، خواہ اول لیل میں پڑھے یا آخر لیل میں، قال الشامي رجح الكمال الجماعة بانه صلى الله عليه وسلم كان اوترهم ثم بين العذر في تأخره مثل ماصنع في التراويح فالوتر كالتراويح فكما ان الجماعة فيها سنة فكذلك الوتر، بحر وفي شرح المنية والصحيح ان الجماعة فيها اي في الوتر افضل الا ان سنيتها ليست كسنية جماعة التراويح اه قال الخير الرملي وهذا الذي عليه عامة الناس اليوم اه وقوله المحشي ايضا بانه مقتضى ما مران كل ماشرع بجماعته فالمسجد افضل فيه اه (ص ۶۴۲ ج۱) واللہ اعلم اور دلیل سے بظاہر یہی دوسری روایت قوی ہے، اور اسی پر امت کا عمل ہے، فقط

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ ۱۲ر ذیقعدہ ۴۶ھ

فضیلت تاخیر وتر آخر شب | **سوال** (۸) .... افضل وقت وتر را چیست وآنکہ عادت گذاردن وتر را در آخر شب دارد اگر وقبل ادائش در خواب بمیرد گناہ ترک واجب بر و لازم آید یا نہ؟

الجواب: تاخير الوتر الى آخر الليل افضل لمن يثق بالانتباه ولمن لم يثق ان يوتر قبل ان ينام هكذا في العالمگيريه ولا يلزمه بشيء من الاثم ان مات قبل الصبح لان الوقت في حقه باق والمعتبر في الفوت والقضاء هو آخر

الوقت فمن لم یدرک آخرہ لم یکن فائتاً للواجب۔ الجواب صحیح ،ظفر احمد عفا عنہ ۲ رصفر ھ

الجواب صحیح ، اشرف علی ، ۲ رصفر ۱۳۴۷ھ ،

سوال (۹) عشاء کی نماز جماعت سے نہیں پڑھی تو وتر جماعت سے پڑھے یا تنہا ؟

ایک مسئلہ میں اشکال پیدا ہو گیا، امید ہے کہ جواب باصواب ارشاد فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے، وہ یہ ہے کہ بہشتی گوہر میں ہ صفحہ ۴۰ مسئلہ ۵ "اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت پہونچے کہ عشاء کی نماز ہو چکے تو اسے چاہتے کہ پہلے عشاء کی نماز پڑھے پھر تراویح میں شریک ہو، اور اگر اس درمیان میں تراویح کی کچھ رکعتیں ہو جاویں تو ان کو بعد وتر پڑھنے کے پڑھے، اور یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے (ص ۳۷، ج ۱ شامی)

اور رغایۃ الاوطار میں ہے ولو لم یصلھا ای التراویح بالامام او صلّٰھا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ۔ بعد ترجمہ کے تحریر فرماتے ہیں "مراد اس سے یہ ہے کہ فرض کو جماعت کے ساتھ پڑھا اور تراویح کو جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا تو وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے، لیکن اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو وتر کو جماعت سے نہ پڑھے، کذا فی الشامی"

موجب اشکال یہ ہے کہ شامی اور رغایۃ الاوطار کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے جماعت سے فرض نہ پڑھے ہوں وہ وتر جماعت سے نہ پڑھے، اور بہشتی گوہر سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھ سکتا ہے، اگر شامی میں کسی جگہ یہ مسئلہ ہو تو تحریر فرمایئے بہت بڑا اشکال ہو رہا ہے، اور اکثر معمول بھی یہی ہے کہ اکثر نمازی دیر میں آتے ہیں، اور فرض جماعت سے نہیں پڑھتے ہیں، اور وتر پڑھ لیتے ہیں، لیکن شامی اور رغایۃ الاوطار کی عبارت کچھ اور کہہ رہی ہے، ضرورتاً محض بغرض تحقیق تکلیف دی گئی ہے، امید کہ از راہِ کرم جواب جلد مرحمت ہو گا،

دیگر امر ضروری العرض یہ بھی ہے کہ احقر کو یہ مسئلہ اُسی طرح معلوم تھا جو بہشتی گوہر میں ہے، اسی طرح لوگوں کو بتلا دیتا تھا، مگر مولوی حبیب اللہ صاحب مدرس مدرسہ قومیہ میرٹھ جو بریلوی خیال کے ہیں، انھوں نے آج میرے پاس شامی بھیجی ہے، اور کہلا کر بھیجا ہے کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے، لہٰذا مکرر عرض ہے کہ بہشتی گوہر کے مطابق عبارت شامی کی ہو تو ضرور ارشاد فرمائی جاوے،

الجواب: بہشتی گوہر کا مسئلہ اس صورت میں ہے جبکہ مسجد میں فرض نماز اور تراویح کی جماعت محلہ والوں نے کی ہو، مگر کسی ایک دو آدمی کو جماعت نہ ملی ہو تو ان بعد میں آنے والوں کے لئے وہی حکم ہے جو بہشتی گوہر میں ہے، اور عامۂ کتب فقہ میں اس کے موافق ہی ذکر ہے، درمختار میں ہے ووقتہا ای وقت التراویح بعد صلوٰۃ العشاء الی الفجر قبل الوتر اوتر معہ ثم صلی ما فاتہ اھ، قال الشامی بعد ذکرہ قولین مقابل الاصح الثالث، مشی علیہ المصنف تبعا للکنز وعزاہ فی الکافی الی الجمہور وصححہ فی الہدایۃ والخانیہ والمحیط والبحر اھ (ص ۳۷، ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بہشتی گوہر میں جس طرح مسئلہ مذکور ہے وہ ہی جمہور کا قول ہے، اور وہی اصح ہے، اسی کو ہدایہ، خانیہ، محیط وغیرہ میں صحیح کہا ہے، اور غایۃ الاوطار کی جس عبارت سے سائل کو دھوکہ ہوا ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ مسجد میں کسی نے بھی فرض نماز یا تراویح کی نماز جماعت سے نہ پڑھی ہو تو اس صورت میں اگر وتر جماعت سے پڑھنا چاہیں تو بیشک ایک صورت میں مکروہ ہے (جبکہ فرض میں جماعت ترک کی گئی ہو) اور دوسری صورت میں محل تامل ہے (جبکہ فرض تو سب نے جماعت سے پڑھے ہوں مگر تراویح کی جماعت کسی نے مسجد میں نہ کی ہو) درمختار میں ہے ولو ترکوا الجماعۃ فی الفرض لم یصلوا التراویح جماعۃ لانہا تبع فمصلیہ وحدہ یصلیہا معہ ولو لم یصلہا ای التراویح مع الامام او صلاہا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ بقی لو ترکہا الکل ہل یصلون الوتر بجماعۃ فلیراجع اھ، اور گو شامی نے اس مقام پر دوسرے الفاظ بھی نقل کئے ہیں، مگر صاحب درمختار اور اکثر اہل متون کا مختار وہی ہے جو مسئلہ جماعت و منفرد کے بارے میں درمختار میں مذکور ہے واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۵ رمضان ۱۳۴۷ھ

صلوٰۃ وتر سے قبل آیت ربنا ما خلقت ہذا باطلا کا پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟

سوال (۱۰) صلوٰۃ الوتر سے قبل اکثر مصلیین آیۃ ربنا ما خلقت ہذا باطلا الخ پڑھا کرتے ہیں،

الجواب: اس کی کوئی اصل ہماری نظر سے نہیں گذری، ۱۱ رمضان ۴۸ھ

جس نے عشاء کی نماز تنہا ادا کی ہو وتر جماعت سے ادا کرے یا تنہا،

سوال (۱۱) .... کل بعد عشاء و تراویح مسئلہ بیان کیا کہ جس شخص نے فرض نماز عشاء جماعت سے نہ پڑھی ہو (یعنی منفرداً پڑھی ہو) وہ وتر بھی منفرداً پڑھے، اور جماعت کی شرکت سلام سے پہلے امام

سے مشارکت ہوجانے سے ثابت ہوجاوے گی، اس کے بعد بعض لوگوں نے بیان کیا کہ بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ اگرچہ جماعت سے فرض عشاء نہ پڑھے ہوں تب بھی جماعتِ وتر میں شامل ہو اور وتر جماعت سے ادا کرے، اس کے بعد بہشتی زیور دیکھا گیا تو اس میں اس کے حصہ بہشتی گوہر میں مسئلہ بعبارتِ ذیل درج ہے:

تراویح کا بیان: **مسئلہ**: اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت پہنچے کہ عشاء کی نماز ہوچکی ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے عشاء کی نماز پڑھے پھر تراویح میں شریک ہو، اور اگر اس درمیان میں تراویح کی کچھ رکعتیں ہوجاویں تو ان کو بعد وتر پڑھنے کے پڑھے، اور یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے (شامی، ص ۷۴۳، ج ۱ مکمل و مدلل بہشتی گوہر، ص ۴۰)

اس مسئلہ سے معلوم ہوا کہ منفرداً فرض عشاء پڑھنے پر بھی وتر جماعت سے پڑھے، بہشتی زیور میں حوالۂ مذکور شامی مطبوعہ سند ۱۲۹۲ھ سے ہے، مگر یہاں وہ شامی نہیں بلکہ مطبوعہ مصر ہے، اس میں جب (مبحث صلوٰۃ التراویح) ص ۵۲۳ و ۵۲۴ میں دیکھا گیا تو مندرجہ ذیل عبارت ملی (ولو تركوا الجماعة في الفرض لم يصلوا التراويح جماعة) لانها تبع فمصيله وحده يصليها معه درمختار (قوله لانها تبع) اي لان جماعتها تبع لجماعة الفرض فانها لم تقم الا بجماعة الفرض فلو اقيمت بجماعة وحدها كانت مخالفة للوارد فيها فلم تكن مشروعة اما لو صليت بجماعة الفرض وكان رجل قد صلى الفرض وحده فله ان يصليها مع ذلك الامام لان جماعتهم مشروعة فله الدخول فيها معهم لعدم المحذور هذا ما ظهر لي في وجهه وبه ظهر ان التعليل المذكور لا يشمل المصلي وحده فظهر صحة التفريع بقوله فمصيله وحده الخ فافهم (شامی ص ۵۲۳ ج ۱ مصری)

عبارتِ محررہ سے واضح ہوا کہ اگر فرض باجماعت نہ پڑھے ہوں تب بھی تراویح کی جماعت میں شرکت کرے، جیسا کہ خط کشیدہ عبارت..... اس کو واضح کر رہی ہے،

اب آگے یہ عبارت ہے (ولو لم يصلها) اي التراويح (بالامام) او صلاها مع غيره (له ان يصلي الوتر معه) درمختار (قوله ولو لم يصلها الخ) ذكر هذا الفرع والذي قبله في البحر عن القنية وكذا في متن الدرر لكن في التاترخانية عن الثقة انه سئل علي بن احمد عمن صلى الفرض والتراويح وحده

او التراویح فقط هل یصلی الوتر مع الامام فقال لا اھ ثم رأیت القهستانی ذکر تصحیح ماذکرہ المصنف ثم قال لکنہ اذا لم یصل الفرض معہ لا یتبعہ فی الوتر اھ فقولہ ولو لم یصلھا ای وقد صلی الفرض معہ لکن ینبغی ان یکون قول القهستانی معہ احترازا عن صلاتها منفردا اما لو صلاها جماعۃ مع غیرہ ثم صلی الوتر معہ لا کراهۃ تامل (ص ۵۲۴ ج ۱ شامی مصری)

اس عبارت مسطورہ سے صاف صاف واضح ہے کہ تراویح چاہے منفرداً پڑھی ہو چاہے اُس امام (جس کے پیچھے وتر پڑھنا ہے) کے سوا دوسرے امام کے ساتھ پڑھی ہو، وتر اس امام کے پیچھے پڑھے، ہاں اگر فرض عشاء منفرداً پڑھے ہوں تو البتہ وتر امام کے ساتھ نہ پڑھے، یعنی جماعت سے نہ پڑھے،

باقی رہا یہ کہ "بقی لو ترکہا الکل یصلون الوتر الخ درمختار (قولہ بقی الخ) الذی یظہر ان جماعۃ الوتر الخ (شامی ص ۵۲۴ ج ۱ مطبوعہ مصر) اس کو اس جزئیہ سے تعلق نہیں،

اب معروض یہ ہے کہ اگر اس وضاحت میں بھی احقر سے غلط فہمی ہوئی ہے اور مسئلہ اس طرح صحیح ہے جس طرح بہشتی گوہر (بحوالۂ مذکور) میں ہے کہ اگر نماز عشاء منفرداً پڑھی تب بھی وتر جماعت سے پڑھے تو نہایت ادب سے عرض ہے کہ اس کی تصریح اور وضاحت فرمادی جاوے کہ احقر کے لئے شرح صدر کا باعث ہو، اور اس سے رجوع کرکے مصلّیوں کو مسئلہ سُنا دیا جاوے، یہ جو کچھ عرض کیا گیا محض رفعِ اشتباہ اور تحقیقِ حق کے لئے ہے نہ حضور والا کے انتباہ کے لئے، پس سوال یہ ہے کہ اگر فرضِ عشاء اور تراویح دونوں گھر پڑھے ہوں یا اکیلے کہیں اور پڑھے ہوں، اور وہ شخص ایسی جگہ (مسجد یا اور کسی مقام پر) حاضر ہوا کہ وہاں وتر جماعت سے شروع ہوئی، تو یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں ؟

الجواب: شامی ص ۷۰۳ ج ۱ مطبوعہ سندھ میں اس مسئلہ کا جزو اوّل یعنی "ان کو بعد وتر پڑھے" تک ہے، اور جزو دوم یعنی "یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے" اس جگہ اس کا ذکر نہیں، بلکہ اس کا ذکر اسی عبارت میں ہے، جو سوال میں درج ہے، اور مطبوعہ سندھ کے ص ۷۴۱ پر درج ہے، مگر شامی میں صفحہ مذکور پر جو عبارت مندرجہ فی السوال ہے، اسی سے بہشتی گوہر کی تائید نہیں ہوسکتی، ولو لم یصلھا الخ کا خلاف ہونا تو ظاہر ہے ہی، لیکن لانہ تبع فمصلیہ الخ سے بھی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے فاقد الفرض کے لئے جماعت

تراویح میں جوازِ شرکت ثابت ہوتی ہے، نہ کہ جماعت وتر میں، کما یظہر بادنی التأمل،
پس سائل کا استدلال صحیح ہے، مگر یہ ضرور نہیں کہ شامی اور درمختار میں عدم جواز شرکت ہو تو مسئلۂ بہشتی زیور یعنی جواز شرکت فی الوتر صحیح نہ ہو، اب رہی یہ بات کہ جواز شرکت کہاں سے ثابت ہے، سو اس کے متعلق عرض ہے کہ فتاویٰ عبد الحی میں بعد نقلِ روایات عدمِ جواز لکھا ہے، لیکن کدامے وجہ قوی معتد بہ عدمِ جواز معلوم نمی شود حق جواز معلوم می شود واللہ اعلم، حررہ الراجی عفو ربہ القوی ابو الحسنات محمد عبد الحی تجاوز اللہ عن ذنبہ الجلی والخفی،
بعد ازاں مولوی محمد نعیم صاحب کی تصدیق اس طرح درج ہے، فی غنیۃ المستملی فی شرح منیۃ المصلی واذا لم یصل الفرض مع الامام فعن عین الائمۃ الکرابیسی انہ لا یتبعہ فی الوتر ولا فی التراویح وکذا اذا لم یتابعہ فی التراویح لا یتابعہ فی الوتر وقال ابو یوسف اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معہ الوتر وکذا اذا لم یدرک شیئا وکذا اذا صلی التراویح مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ وھو الصحیح ذکرہ ابو اللیث اھ وفی مختصرہ (ای الصغیری) واذا لم یصلی الفرض مع الامام قیل لا یتبعہ فی التراویح ولا فی الوتر وکذا اذا لم یصل معہ التراویح لا یتبعہ فی الوتر والصحیح انہ یجوز ان یتبعہ فی ذلک کلہ اھ واللہ علیم بالصواب وعندہ علم الکتاب،
کتبہ ابو الاحیاء محمد نعیم، عفی عنہ ذنبہ العظیم،
اب ایک خلجان اور باقی رہا وہ یہ کہ پھر بہشتی گوہر میں اس کو اس کو درمختار کی طرف کیوں منسوب کیا گیا جس میں بجائے موافقت کے مخالفت موجود ہے، سو اصل واقعہ بعد کاوشِ بسیار یوں معلوم ہوا کہ علم الفقہ جو اصل ماخذ ہے گوہر کا اس میں جزو اول کا حوالہ درمختار موجود ہے، اور گوہر میں جزو دوم کا اضافہ کرکے صغیری کا حوالہ بڑھا دیا گیا تھا، جو مطبوعۂ قدیم میں موجود ہے، اور مکمل مدلل میں صغیری کا نام غلطیٔ کاتب کے باعث رہ گیا، واللہ اعلم، ۲۰ رمضان ۴۸ھ، کتبہ عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ

وتر وہی شخص پڑھائے جس نے فرض عشاء پڑھائی ہو، یا دوسرا شخص بھی پڑھا سکتا ہے؟

سوال (۱۲) اگر فرض نماز عشاء ایک شخص نے پڑھائی تو کیا وتر بھی وہی شخص ضرور پڑھائے، کیا دوسرے شخص کے وتر کا امام بننے میں کچھ کراہت ہے یا خلاف اولیٰ؟

الجواب: بظاہر قواعد سے اس میں کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا، لیکن کوئی جزئیہ نظر سے نہیں گذرا، البتہ عالمگیریہ میں سراج وہاج سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ فرض اور وتر خود پڑھاتے تھے اور تراویح حضرت اُبیؓ سے پڑھواتے تھے اھ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام فرض کو امام وتر بنانا بہتر ہے، ہاں اگر امام فرض وتر کی جماعت میں شریک ہی نہ ہو (خواہ کسی عذر کے باعث یا خود قرآن شریف دوسری جگہ پڑھنے وغیرہ کے سبب) تو پھر کسی دوسرے کو امام وتر بننا خلافِ اَولیٰ بھی نہیں ہے، واللہ اعلم، کتبہ عبدالکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ

نمازِ وتر میں شوافع کی اقتدار کا حکم | سوال (۱۹۱۳) شافعی مذہب کے امام .... رمضان میں وتر دو سلام سے ادا کرتے ہیں، پہلے دو رکعت کی نیت کرکے سلام پھیرتے ہیں، اس کے بعد ایک رکعت کی نیت کرکے سلام پھیرتے ہیں، اکثر مقتدی حنفی المذہب بھی شریک تراویح ہوتے ہیں، امام صاحب شافعی کا یہ کہنا ہے کہ تم لوگ بھی شریکِ وتر ہو جاؤ، جب ہم دو رکعت پر سلام پھیریں تم فوراً کھڑے ہو جاؤ، اور اپنی ایک رکعت پوری کرلو، حنفی المذہب مقتدی ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنا دوسرا امام مقرر کرکے بہ جماعت وتر تین رکعت ادا کرلیتے ہیں،

الجواب: ایسی حالت میں اس کی اقتدار جائز نہیں ہے، اس طریقہ سے وتر صحیح نہیں ہو سکتے، کمافی الدر المختار (وصح الاقتداء فیہ بشافعی لم یفصلہ بسلام) لا ان فصلہ (علی الاصح) فیھما وقال الشامی قولہ علی الاصح فیھما ای فی جواز اصل الاقتداء فیہ بشافعی وفی اشتراط عدم فصلہ الخ فقط واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ، ۸ رشوال ۴۸ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۰ رشوال ۴۸ھ

فصل فی السنن والنوافل

سننِ مؤکدہ کا ثبوت | سوال (۱) ہر پنج وقتی نماز فرض کے بعد جو نفل یا سنت زوائد پڑھی جاتی ہیں خاص کر ظہر میں دو رکعت اور مغرب اور عشاء میں دو رکعت سنت کے بعد یہ سب کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے نہیں؟

الجواب: نماز فرائض کے قبل و بعد جو سنن زوائد ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے ان کو سنت فرمایا ہے، اور سنت وہی ہے جو حدیث سے ثابت ہو، امام صاحبؒ ہم سے زیادہ حدیث کو

جانتے تھے، انھوں نے کسی حدیث سے ان کا سنت ہونا معلوم کیا ہوگا، ہم کو حدیث ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم مقلد ہیں، لیکن اس وقت محض تبرعاً حدیث صحیح لکھے دیتا ہوں، آئندہ ایسے سوالات کا جواب وہی ہوگا جو اوپر لکھا گیا ہے، اخرج البخاری عن نافع عن ابن عمر قال حفظت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر رکعات رکعتین قبل الظہر ورکعتین بعدھا ورکعتین بعد المغرب فی بیتہ ورکعتین بعد العشاء فی بیتہ ورکعتین قبل صلوٰۃ الصبح وکانت ساعۃ لایدخل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیہا حدثتنی حفصۃ انہ کان اذا اذن المؤذن وطلع الفجر صلی رکعتین واخرج عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لایدع اربعا قبل الظہر ورکعتین قبل الغداۃ،

ان حدیثوں سے بارہ سنن مؤکدہ کا ثبوت کافی طور پر ہو رہا ہے، اور اگر سنن زوائد سے سنن مؤکدہ کے علاوہ مراد ہیں تو دوبارہ سوال کیا جاوے،

نماز تہجد سنت مؤکدہ ہے یا مستحب

سوال (۲) ایک لڑکا نام حبیب اللہ، مالابدمنہ اردو پڑھتا تھا، ایک جگہ لکھا ہے کہ نماز تہجد سنتِ مؤکدہ ہے، اسی درمیان میں ایک حافظ صاحب تشریف لائے، اور کہنے لگے کہ سنت مؤکدہ نہیں بلکہ نفل ہے، اور تم کو معلوم نہیں، لڑکے نے کہا کہ جناب حافظ صاحب ہم نے تنبیہ الغافلین میں بھی یہی پڑھا ہے کہ نمازِ تہجد سنتِ مؤکدہ ہے، اور مالابدمنہ میں بھی موجود ہے، بس جناب حافظ صاحب بہت غصہ ہوکر بولے کہ تم کو کیا معلوم، اور کون شخص ہمارے میں اتنا مسئلہ جانتا ہے اس بستی میں، تو لڑکے نے کہا کہ ہم کو تو یہی کتاب بس ہے، تو فوراً حافظ صاحب نے کہا کہ ہم اس کتاب پدوڑی کو نہیں مانتے،

الجواب: نماز تہجد کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک سنت موکدہ ہے، بدلیل مواظبت صلی اللہ علیہ وسلم علیہا من غیر افتراض علیہ قال فی ردالمحتار ومفادہ اعتماد السنیۃ فی حقنا لانہ صلی اللہ علیہ وسلم واظب علیہ بعد نسخ فرضیتہ وکذا قال فی الحلیۃ الاشبہ انہ سنۃ اھ ص ۶۱۶ ج ۱، اور بعض کے نزدیک مستحب ہے، وحملوا مواظبتہ صلی اللہ علیہ وسلم علی کونہا فریضۃ مختصۃ بہ، اور اکثر علماء کا قول یہی ہے کہ امت کے حق میں صلوٰۃ تہجد مستحب ہے،

سنتِ مؤکدہ نہیں. قال فی مراقی الفلاح واکثر المتون علیہ وندب صلوٰۃ اللیل خصوصا آخرہ کما ذکرناہ، اور اس عبد ضعیف کا خیال یہ ہے کہ ابتداء تو صلوٰۃ تہجد مستحب ہی ہے، لیکن بعد شروع کردینے کے اور عادی ہوجانے کے اس پر مواظبت کرنا سنت مؤکدہ ہے، ودلیلہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم لابن عمر یا عبداللہ لا تکن مثل فلان کان یقوم اللیل ثم ترک' رواہ البخاری فی کتاب صلوٰۃ التہجد ج۱، چونکہ اس مسئلہ میں اختلاف ہی، اس لئے قاضی ثناء اللہ صاحبؒ جو بہت بڑے محقق ومحدث وعالم ہیں سنتِ مؤکدہ ہونے کو اختیار فرمایا، لقوۃ دلیلہ عندہ اس بناء پر اُن پر اعتراض کرنا ہرگز جائز نہیں، اور کتاب مالا بدمنہ کو بدوڑی کتاب کہنا نہایت سخت کلمہ ہے، جس سے سلبِ ایمان کا اندیشہ ہی، جس نے یہ لفظ زبان سے نکالا ہو اسے فوراً توبہ واستغفار وتجدیدِ ایمان کرنا چاہئے، اور احتیاطاً تجدیدِ نکاح کرلینا بھی ضروری ہے، قال فی العالمگیریۃ رجل عرض علیہ خصمہ فتوی الائمۃ فردہا وقال چہ بار نامہ فتویٰ آوردہ قیل یکفر لانہ رد حکم الشرع اھ ج ۳ ص ۱۶۴، ۴ رجب ۴۱ھ

سننِ مؤکدہ کے تارک کا حکم

سوال (۳) ....

..... اکثر لوگ جمعہ کی فرض نماز کے بعد بغیر سنت پڑھے ..... چلے جاتے ہیں نہ اپنے مکانوں میں جاکر پڑھتے ہیں، بازاروں میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں، کتنا بھی تاکید کرو نہیں سنتے ہیں، نہ پند ونصیحت قبول کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے کیا وعید آئی ہے، اور مذکورہ لوگوں کے لئے کیا عذاب ہے، شرعاً بالتفصیل بیان فرماکر عنداللہ ماجور ہوں؟

الجواب، یہ لوگ تارکِ سنتِ مؤکدہ ہیں، اور ترکِ سنتِ مؤکدہ گاہے بلا عذر ہوجاوے تو صغیرہ ہے اور اس پر مداومت کرنا کبیرہ ہے، جس سے علاوہ سخت گناہ کے حرمانِ شفاعتِ نبوی صلعم کا اندیشہ ہی، رجل ترک سنن الصلوٰۃ ان لم یر السنن حقا فقد کفر لانہ ترکہا استخفافا وان راٰہا حقا فالصحیح انہ یأثم لانہ جاء الوعید بالترک عالمگیریۃ واللہ اعلم قلت ومخافۃ حرمان الشفاعۃ رأیتہ فی مقام لا احفظ الآن موضعہ واللہ اعلم، ۲۵ شعبان ۴۲ھ

صلوٰۃ التسبیح میں سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد قیام طویل میں ہاتھ باندھے یا کھلے رکھے

سوال (۴) مکمل ومدلل بہشتی زیور مطبوعہ اشرف المطابع ۱۳۴۳ھ دوسرا حصہ ص۴۴ پر

ف ذکرہ فی اللآلی المصنوعۃ للسیوطی ۱۲ منہ

صلوٰۃ التسبیح پڑھنے کا طریقہ درج ہے "رکوع سے اٹھے اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد پھر دس دفعہ پڑھے"، حضرت صاحب اُس وقت ہاتھ باندھ کر تسبیح پڑھنی چاہئے یا کہ کھلے ہی رکھے جائیں، مطلع فرمائیں،

الجواب: قال الطحطاوی فی حاشیۃ علی مراقی الفلاح (ص ۱۵۰) تحت قول المصنف ویسن وضع الرجل یدہ الیمنی علی الیسری ما نصہ ولا بد فی ذلک القیام ان یکون فیہ ذکر مسنون ومالا فلا ما لم یطل فحینئذ یضع کما فی السراج وغیرہ فان قیل فی القومۃ من الرکوع ذکر مشروع وھو التسبیح والتحمید فینبغی ان یضع فیہا علی قولہما اجیب بان المراد قیام لہ قرار وھذا لا قرار لہ اھ وھل یضع فیہا فی صلوٰۃ التسبیح لکون القیام لہ قرار فیہ ذکر مشروع یراجع اھ قال الشامی ومقتضاہ ان یعتمد بیدیہ (فی القومۃ) فی النافلۃ ولم ار من صرح بہ تامل لکنہ مقتضی اطلاق الاصلین المارین ومقتضاہ ان یعتمد فی صلوٰۃ التسبیح اھ (۵۰۹ ج ۱)
ان عبارات سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ التسبیح میں قومہ کے وقت ہاتھ باندھ کر تسبیح پڑھی جاوے، فقط واللہ اعلم، ۱۴ صفر ۴۵ھ

تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد سنت ہیں یا مستحب اور اس کے متعلق چند سوال کے جوابات

سوال (۵) تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد یہ سنت ہے یا مستحب، ایک روز میں ان نمازوں کو کتنی بار اور کس وقت پڑھنا چاہئے، مسجد کو نماز کے وقت جاتے ہیں، ظہر کے وقت ظہر کو، عصر کے وقت عصر کو، ایسا ہی سب نمازوں کو کبھی اذان کے قریب اور کبھی اذان کے بعد اور کبھی نماز کے قریب جیسا اتفاق ہو، اب ان نمازوں کو کیسے ادا کرنا چاہئے، اور ان میں کونسی سورتیں پڑھنا مناسب ہے؟ از راہِ مہربانی وبندہ پروری مفصل ترکیب اور اوقات سے مطلع فرما کر ممنون اور مشکور فرماویں،

الجواب: تحیۃ الوضو مستحب ہے، اور تحیۃ المسجد سنت ہے، مگر مؤکدہ نہیں، تحیۃ الوضو ہر وضو کے بعد مستحب ہے، دن میں جتنی بار بھی وضو کیا جاوے، اور تحیۃ المسجد مسجد میں داخل ہونے کے وقت سنت ہے، جتنی بار بھی داخل ہو، لیکن جس کی آمد و رفت زیادہ رہتی ہو اس کو دن رات میں ایک بار تحیۃ المسجد پڑھنا بھی کافی ہے، اور تحیۃ المسجد

وتحیۃ الوضو سنن مؤکدہ اور فرائض سے بھی ادا ہو جاتی ہے، جبکہ وضو کے بعد فوراً یا مسجد میں جاتے ہی سنت اور فرض میں معاً مشغول ہو جاوے اور بعد طلوعِ فجر کے طلوعِ آفتاب تک اور بعد عصر کے غروب تک مستقلاً[ف] اور عین طلوع شمس و غروب اور استواء شمس کے وقت مطلقاً تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد پڑھنا جائز نہیں، باقی اوقات میں جس طرح چاہے پڑھے، خواہ مستقلاً خواہ سنتِ مؤکدہ وغیرہ کے ضمن میں، اور ان کے لئے کوئی سورت خاص نہیں جو سورۃ چاہے پڑھے، ۲۶ ربیع الثانی ۴۵ھ

رکعتین بعد الوتر کے متعلق بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر شبہ کا جواب،

سوال (۶) بہشتی زیور دوسرا حصہ بیان نفل پڑھنے میں لکھا ہے کہ نفل کھڑے ہو کر پڑھنا بیٹھکر پڑھنے سے بہتر ہے، اور اس میں وتر کے بعد کی نفل بھی آگئی، مگر مجموعہ فتاویٰ عبد الحی رح جلد سوم صفحہ ۵ میں ہے کہ وتر کے بعد نفل بیٹھ کر پڑھنا چاہیئے، ان دونوں مسائل کو کیسا سمجھنا چاہیئے، جواب باصواب سے مشرف فرماویں، دیگر جائے مجموعہ فتاویٰ جلد اول صفحہ ۱۵۴ میں بھی بیٹھکر پڑھنا بتلایا ہے، فقط

الجواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے فاذا اوتر احدکم فلیرکع رکعتین (رواہ الدارمی عن ثوبان) و نیز ارشاد فرمایا ہے من صلی قاعداً فلہ نصف اجر القائم (رواہ البخاری عن عمران بن حصین) جو اپنے عموم کی وجہ سے نوافل بعد الوتر کو بھی شامل ہے، اور ابنِ ماجہ اور امام احمدؒ نے کان یصلیہما وھو جالس جو روایت کی ہے ہمارے نزدیک یہ جلوس تعبداً نہ تھا، بلکہ بوجہ تکان وغیرہ کے تھا، اور کَانَ ہمیشہ استمرار کے لئے نہیں ہوتا جو دوام ثابت ہو، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم، عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۹ شوال ۴۳ھ

دو سورتوں کے درمیان ترک سورۃ نوافل میں مکروہ نہیں،

سوال (۷) جب ہر رکعت میں بعد الحمد شریف کے دوسری سورۃ ملانے کی ضرورت ہو تو کیا اس میں دو یا تین رکعت کے بعد بھی بیچ میں ایک سورۃ چھوڑنا منع ہے؟

ف اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نمازیں اس وقت میں پڑھنا جائز ہیں ان کے ضمن میں یہ بھی درست ہے ۱۲ حضرت مولاناؒ،

الجواب: نوافل میں امر مذکور مکروہ نہیں ہے، کما فی مراقی الفلاح و فی الخلاصۃ لا یکرہ ھذا فی النفل قال الطحطاوی یعنی القرأۃ منکوسا و الفصل والجمع کما ھو مفاد عبارۃ الخلاصۃ حیث قال بعد ذکر المسائل الثلاث وھذا کلہ فی الفرائض اما فی النوافل لا یکرہ (ص ۲۰۶) اھ کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۲ ذیقعدہ ۴۳ھ

سنن رواتب کے ترک کرنیوالے کا حکم | **سوال** (۸) سوال اوّل این کہ شخصے در اوقات خمسہ سنن رواتب علی سبیل التہاون والتکاسل نمی خواند فقط برخواندن نماز ہائے فریضہ اکتفا می کند در حق آنکس شرعاً چہ حکم است، و در آخرت بوجہ ترکِ سننِ رواتب معذب وماخوذ خواہد شد یا نہ، و بایں سبب در زمرۂ بے نمازاں محشور شود یہ یا نہ؟

سوال دوم اینکہ شخصے نماز ہائے پنجگانہ بجماعت میخواند بدیں طور کہ ہرگاہ بجماعت شریک شود اقتدیت بہذا الامام اللہ اکبر گفتہ باامام اقتدا کند، و پستر دعا، ثناء وتسبیحات رکوع وسجود وتکبیرات انتقالات وتشہد وغیرہ ہیچ نمی خواند وبعد تکبیر تحریمہ تا آخر نماز بالکل ساکت می ماند اما در افعال دیگر یعنی قیام وقعود ورکوع وسجود وقومہ وجلسہ باامام متابعت کرد وچوں نماز تمام شد باامام لفظ السلام علیکم ورحمۃ اللہ بہر دو جانب گفتہ از نماز بیروں شد، پس نماز ایں شخص کہ بطور مذکور فرائض بجماعت میگذارد صحیح شود یا نہ وازفرائض بری الذمہ گردد یا نہ،

الجواب: (۱) ترک سننِ مؤکدہ بلاعذر بطریق اصرار واستمرار موجبِ عتاب وقدرے گناہ ہے، لیکن تارکِ سنن بے نمازی شمار نہ ہوگا، قال الشامی عن الکشف الکبیر معزیا الی اصول ابی الیسر حکم السنۃ ان یندب الی تحصیلھا ویلام علی ترکھا مع لحوق اثم یسیر اھ وعن ھذا قال فی البحر ان الظاھر من کلامھم ان الاثم منوط بترک الواجب او السنۃ المؤکدۃ لتصریحھم باثم من ترک سنن الصلوات الخمس علی الصحیح وتصریحھم باثم من ترک الجماعۃ مع انھا سنۃ علی الصحیح ولاشک ان الاثم وبعضہ اشد من بعض فالاثم لتارک السنۃ المؤکدۃ اخف منہ لتارک الواجب اھ وظاھرہ حصول الاثم بالترک مرۃ ویخالفہ ما فی شرح التحریر ان المراد الترک بلا عذر علی سبیل الاصرار و قال محمد فی المصرین علی ترک السنۃ

بالقتال وابو یوسف بالتادیب اھ فیتعین حمل الترك فیما مر عن البحر علی الترك علی سبیل الاصرار توفیقا بین کلامھم اھ (ص ۴۹۴ ج ۱) اور اگر احیاناً ترک ہو جائے یا عذر سے ترک ہو مثلاً سفر یا مرض یا تعب شدید کی وجہ سے تو موجب عتاب وملامت وگناہ نہیں،

(۲) اس شخص کے ذمہ سے فرض تو ساقط ہو جائے گا، لیکن ترکِ واجبات وترکِ سننِ مؤکدہ کا گناہ ہوگا وہو ظاہر، ۲۴ ذیقعدہ ۴۴ھ

طالب علم، قاضی یا مفتی کو درس، فتویٰ اور قضاء میں مشغول رہنے کی وجہ سے ترکِ سنن رواتب جائز ہے یا نہیں؟

سوال (۹) طالب علمے بوجہ قلتِ فرصت بسبب کثرتِ اشتغال بمطالعۂ کتبِ دینیہ اگر برخواندن فرائض فقط اکتفا کند وسننِ رواتب ترک سازد، ایں چنیں عمل کردن بعلتِ مذکور درحقِ او شرعاً روا باشد یا نہ؟

الجواب: طالب علم یا قاضی یا مفتی کو سنتِ فجر کے سوا دیگر سننِ رواتب کا ترک وقت اشتغال بالعلم یا بالقضاء والفتویٰ جائز ہے، لیکن اگر وقتِ صلوٰۃ میں درس و فتویٰ وقضاء سے فارغ ہو جائے تو سنن کا بجا لانا ضروری ہے ولا یجوز ترکھا ای سنۃ الفجر لعالم صار مرجعا فی الفتویٰ بخلاف باقی السنن فلو ترکھا لحاجۃ الناس الی فتواہ اھ قال الشامی معناہ انہ یترك وقت اشتغالہ بالافتاء لاجل حاجۃ الناس المجتمعین علیہ وینبغی انہ یصلیھا اذا فرغ فی الوقت و ظاھر التفرقۃ بین سنۃ الفجر وغیرھا انہ لیس لہ ترك الجماعۃ لانھا من الشعائر فھی اکد من سنۃ الفجر ولذا اجاز ترکھا لو خاف فوت الجماعۃ وافاد انہ ینبغی ان یکون القاضی وطالب العلم کذلك لاسیما المدرس[1] واقول فی المدرس نظر بخلاف الطالب العلم اذا خاف فوت الدرس او بعضہ اھ (ص ۴۰۸ ج ۱) میں کہتا ہوں کہ شامی نے جو مدرس وطالب علم میں فرق کیا ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ طالب علم کو خوف فوت درس کے وقت تو ترکِ سنن غیر سنتِ فجر وجماعت جائز ہو، لیکن مطالعہ کی وجہ سے اُن کا ترک جائز نہ ہو، کیونکہ درس کے فوت کا تو بدل نہیں اور وہ دوسرے کے قبضہ میں ہے، اور مطالعہ اپنے قبضہ

[1] یعنی عند الدرس کما سیأتی، ۱۲

میں ہے، دوسرے وقت بھی کرسکتا ہے، لیکن اگر ان لوگوں کے ترک سنن سے عوام الناس کو دینی ضرر ہو تو پھر اس کی اجازت نہیں، واللہ اعلم، ۲۴ ذی الحجہ ۴۳ھ

قبل عشاء چار رکعت کے قعدۂ اولیٰ میں درود شریف اور تیسری رکعت میں ثناء و تعوذ پڑھنا جائز ہے،

سوال (۱۰) عشاء کی چار رکعت سنت میں جب دو رکعت پڑھ کر قعدۂ اولیٰ سے قیام میں کھڑا ہو تب ثناء و تعوذ پڑھ کر قرآت شروع کرے، نیز قعدۂ اولیٰ میں درود شریف و دعاء پڑھے آیا یہ درست ہے؟

الجواب: قبل عشاء چار رکعت کے قعدۂ اولیٰ میں درود شریف اور تیسری میں ثناء و تعوذ پڑھنا جائز ہے، فی العالمگیریۃ وفی الاربع قبل الظہر والجمعۃ وبعدھا لا یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی القعدۃ الاولیٰ ولا یستفتح اذا قام الی الثالثۃ بخلاف سائر ذوات الاربع من النوافل (ص ۲۷، ج ۱) وھکذا فی الدر وقال ایضا ویتعوذ (ص ۷۰۰، ج ۱ مع الشامی) کتبہ عبدالکریم عفی عنہ ۱۴ صفر ۴۴ھ

نفل کی جماعت جبکہ مقتدی تین سے زائد ہوں مکروہ ہے،

سوال (۱۱) دو تین آدمیوں کی اقتداء بلا املائے نفل نماز میں درست ہے مگر جماعت کا ثواب نہیں ملتا، اور جب جماعت کا ثواب نہیں ملتا تو دو تین آدمیوں کی جماعت بلا املائے بے سود ہے؟

الجواب: نفل کی جماعت کرنا جبکہ چار مقتدی ہوں تو اتفاقاً مکروہ ہے، اور تین مقتدی ہوں تو کراہت میں اختلاف ہے، اور جس صورت میں مکروہ نہیں اس میں ثواب نہ ملنے کی تصریح تو نہیں ہے، شامی نے قول بدائع ان الجماعۃ فی التطوع لیست بسنۃ سے استنباط کیا ہے، اور اس میں تامل بھی ظاہر کیا ہے (شامی ص ۶۴۱، ج ۱) بہرحال اہتمام جماعت نفل میں نہ کرنا چاہئے،

عشاء و عصر کی چار سنت میں قعدۂ اولیٰ پر درود شریف اور تیسری رکعت میں ثناء و تعوذ پڑھنا جائز ہے،

سوال (۱۲) .... عشاء اور عصر کی چار سنت میں دو رکعت کے بعد التحیات کے ساتھ درود شریف اور دعاء اور تیسری رکعت سبحانک اللہ سے شروع کرنی چاہئے؟

الجواب: فی الدر المختار (ولا یزید) فی الفرض علی التشہد فی القعدۃ الاولیٰ اجماعا وقال الشامیؒ (قولہ فی الفرض) ای وما الحق بہ کالوتر

والسنن الرواتب وان نظر صاحب البحر فیھا (ص ۳۲ ۵ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ اس حکم میں عشاء، وعصر کی چار سنتیں نوافل مطلقہ میں داخل ہیں، عبدالکریم عفی عنہ ۵ محرم ۴۵ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ ۶ محرم ۴۵ھ

چھوٹی مسجد جو صرف ایک مکان پر مشتمل ہو جماعتِ فجر کھڑی ہونے کے بعد اس میں سنتِ فجر ادا کرے یا ترک کردے؟

سوال (۱۳) .... جو چھوٹی مسجد ایک مکانیت پر مشتمل ہو اس میں نہ صحن نہ حجرہ نہ برآمدہ نہ ستون نہ جگہ صیفی نہ شتوی، تو قیام جماعت مکتوبہ کی حالت میں سنتوں کا خصوصًا فجر کی سنت کا ترک کرنا ضروری ہے اور جماعت میں ملنا چاہئے، اور اولیٰ وافضل سنن کے لئے مکان ہی ہے گھر سے سنت پڑھ کر آنا افضل ہے کیونکہ مسجد صلوٰۃ مکتوبہ کے لئے ہے نہ کہ سنت کے واسطے، اور افضلیت سنن ونوافل پڑھنے کی مکان میں مسجد سے حدیث سے ثابت ہے، خواہ سنت فجر ہو یا غیر، وعلیکم بالصلوٰۃ فی بیوتکم فان خیر صلوٰۃ المرء فی بیتہ الا المکتوبۃ، اور ترک کرنا اس وجہ سے بھی چاہئے کہ جب جماعتِ مکتوبہ قائم ہوجاوے تو اس وقت دوسری نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، چونکہ یہ مسجد ایک ہی مکانیت پر مشتمل ہے، اس میں کوئی گوشہ یا دوسری جگہ نہیں ہے، لہذا بربناء عباراتِ فقہیہ کے بھی ترک سنتِ فجر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، چنانچہ مجمع الانہر میں ہے وکرہ خلف الصف بلاحائل، اور فتاویٰ امدادیہ جلد اوّل صفحہ ۵۳ کی اس عبارت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، فی ردالمحتار باب ادراک الفریضۃ الحاصل ان السنۃ فی سنۃ الفجر ان یاتی بھا فی بیتہ والا فان کان عند باب المسجد مکان صلاھا فیہ والا صلاھا فی الشتوی او الصیفی ان کان للمسجد موضعان والا فخلف الصف عند ساریۃ الخ، یہ قول زید کا ہے،

عمر کہتا ہے کہ سنتِ فجر کی قیام جماعت مکتوبہ کی حالت میں پڑھے، جبکہ تیقن ہو کہ رکعت ثانیہ قطعی فوت نہ ہوگی اور وقت میں بھی گنجائش ہو، البتہ صفوف سے ہٹ کر بُعد اختیار کرے، جس قدر ممکن ہو والا فخلف الصف عند ساریۃ، عند ساریہ سے مسجد کی جگھوں میں خواہ گوشہ ہو، خواہ محاذی صف یا خلفِ صف ہو بُعد ہی مطلوب ہے، بحالتِ قیام جماعتِ فجر کی سنت کا ادا کرنا تعامل سے ہے، اور سنت فجر اشرف سنت مؤکدہ ہے، اور جماعت سنت مؤکدہ ہے، سنن کا ادا کرنا مکان میں مخصوص خواص کو ہے، عوام کے واسطے مسجد ہی

افضل ہے، بر بناء فضل حدیث ثواب کے مکان سے مسجد میں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سنت پڑھنا مسجد میں وارد و ثابت ہے، ترمذی شریف کی حدیثوں سے، اب حضرت والا ہم لوگوں کو کیا حکم فرماتے ہیں کہ کس کا قول صحیح اور کس پر عمل کیا جاوے، بالدلیل جواب کلی عطا فرمایا جاوے، بینوا بالکتاب وتوجروا یوم الحساب۔

الجواب، قال الشامی بعد العبارۃ المذکورۃ فی الفتاوی الامدادیۃ التی نقلہا السائل مانصہ لکن اذا کان للمسجد موضعان والامام فی احدہما ذکر فی المحیط انہ قیل لا یکرہ لعدم مخالفۃ القوم وقیل یکرہ لانہما کمکان واحد قال فاذا اختلف المشایخ فیہ فالافضل ان لا یفعل قال فی النہر وفیہ افادۃ انہا تنزیہیۃ اھ (ص ۴۹، ج۱) قلت ہذا فیما اذا کان للمسجد موضعان واذا لم یکن سوی موضع واحد فالظاہر کراہۃ الاشتغال بالسنۃ ہناک تحریما الا اذا صلاہا بعیدًا عن الصفوف منحرفا عن القوم فی جانب منہ واللہ اعلم۔

صورتِ مذکورہ میں کہ مسجد میں بجز مکان واحد کے کچھ نہیں ہے، اقامت للمکتوبہ کے بعد مسجد کے اندر سنتیں فجر کی پڑھنا مکروہ ہے، بلکہ مسجد سے باہر دروازہ کے متصل پڑھنا چاہیے، یا اگر مسجد بڑی ہو اور جماعت قائم ہونے کے بعد ایک جانب گوشے میں سنتیں پڑھتے ہوئے صفوف سے بُعد کافی ہو جاتا ہو تو یہ بُعد بھی قائم مقام حائل کے ہو جائے گا، کما یظہر من قول الطحاوی وغیرہ من مشائخ الحنفیۃ وقد ذکرتہ فی اعلاء السنن بالبسط من ذلک واللہ اعلم۔

اور نوافل وسننِ مؤکدہ کا گھر میں پڑھنا فی نفسہٖ افضل ہے، مگر چونکہ عوام نے اس فضیلت کو ترک سنن کا وسیلہ بنا لیا ہے اب سننِ مؤکدہ کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے، ورنہ ترک سنن کے ساتھ متہم ہوگا، اور تہمت سے بچنا لازم ہے، لما فی الحدیث من قولہ صلی اللہ علیہ وسلم اتقوا مواضع التہم والامر للوجوب، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۸؍ رجب ۱۳۴۶ھ

سامع اگر تراویح سے قبل نوافل میں امام کو قرآن سنائے جس سے مشغولین فی السنن وغیرہ کو تشویش ہو تو یہ عمل ان کا جائز ہے یا نہیں، اور اس جماعت نفل میں شرکت کا حکم	**سوال** (۱۴۲) ہمارے یہاں مسجد میں تراویح کے قاری کے جو حافظ صاحب سامع ہیں وہ قبل تراویح دو رکعت نفل میں اپنا قرآن شریف قاری کو سنا دیتے ہیں، مگر ان کے سنانے کے

وقت عشاء کا وقت بھی ہو جاتا ہے اور لوگ کچھ انکی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں کچھ علیحدہ ادائے سنن میں مشغول ہو جاتے ہیں،

پھر یہ حافظ صاحب جو نفل میں قرآن شریف سناتے ہیں بالکل اسی جگہ کھڑے ہو کر سناتے ہیں، جو تراویح و فرض کے امام کی جگہ ہے، بظاہر مجھے یہ صورت پسندیدہ نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس میں مشغولین بالسنن سے تزاحم ہوتا ہے، اور ایسے وقت یا تو حافظ صاحب کے نفل موقوف ہوں یا سنن متروک، کیونکہ اذا قرء القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا الآیۃ کا عموم موجودہ صورت کو جائز نہیں ٹھہراتا، پھر مجھے یاد ہے کہ مدینہ طیبہ میں میرے سامنے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی بلد سے یہ فرمایا تھا کہ لوگ مسجد نبوی میں تلاوت کرتے رہتے ہیں جس سے مصلّین کو تشویش ہوتی ہے، اس لئے اس کی ممانعت ہونی چاہیئے تو قاضی صاحب نے وعدہ کیا تھا وہاں بھی تلاوت کرنے والے فرض نماز کی جماعت کے وقت نہیں کرتے تھے، کیونکہ اس وقت تو وہ بھی جماعت میں شامل ہو جاتے تھے، البتہ قبل جماعت و بعد اذان تلاوت بلند آواز سے کرتے تھے جس سے ادائے سنن و رواتب میں تزاحم ہوتا تھا،

الجواب: آپ کا خیال صحیح ہے، اس حافظ سامع کو ایسا جہر نہ کرنا چاہیئے جس سے مصلّین کو تشویش ہو، بلکہ کسی الگ جگہ پڑھا کریں، اور اس کے ساتھ دوسرے لوگوں کو اقتدا بھی نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ نوافل مطلقہ کی جماعت میں تین چار سے زیادہ آدمی ہونا مکروہ ہیں، ۱۶ ر رمضان ۴۸ھ

اضطجاع بعد قیام اللیل سنت ہے یا نہیں؟

سوال (۱۵) میرا معمول یہ ہے کہ اگر کبھی تہجد کو اٹھ بیٹھا تو پھر بغیر نماز فجر پڑھے نہیں لیٹتا، ایک صاحب نے جنھیں میں معتبر نہیں سمجھتا یہ کہا کہ تہجد کے بعد سو رہنا مسنون ہے اور فجر کے لئے پھر اٹھنا مسنون ہے

الجواب: اس قائل کا قول صحیح ہے مگر حنفیہ نے اضطجاع بعد قیام اللیل کی سنت عادت پر محمول کیا ہے، جس کا منشا یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طول قیام لیل کے تعب رفع کرنے کے لئے اضطجاع فرماتے تھے، اور اگر یہ سنت مقصودہ بھی ہو تو اس پر عمل اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ فوت جماعت فجر کا اندیشہ نہ ہو ورنہ واجب و فرض کا اہتمام ایسی سنت کے اہتمام سے مقدم ہے جس کا سنت مقصودہ ہونا ہی..... مختلف فیہ ہے، ۶ ر رمضان ۴۸ھ

خطبۂ جمعہ شروع ہونے کے بعد آنے والا پہلی چار سنتیں ادا کرے، اور کب؟ یا یہ سنتیں ساقط ہوجاتی ہیں؟	**سوال** (۱۶) مسئلہ یہ ہو کہ جو شخص ایسے وقت آکر کے شریک ہوا کہ خطبہ جمعہ کا ہورہا ہے تو فرضوں سے پہلی جو چار سنت ہیں ان کو کب ادا کرے یا

نہ کرے، یہاں پر لوگ اصرار کرتے ہیں کہ وہ سنت خطبہ ہونے سے پہلے پڑھے تو پڑھے اور بعد جمعہ کے وہ نہیں پڑھی جاتی ہیں، وہ معاف ہوجاتی ہیں،

الجواب: جمعہ کے بعد والی سنتِ مؤکدہ ادا کرنے کے بعد اُن سنتوں کو پڑھے جو جمعہ سے قبل والی فوت ہوگئی ہیں کما فی الدر المختار (بخلاف سنة الظهر) وکذا الجمعة (فانه) ان خاف فوت رکعة (یترکها) ویقتدی (ثم یأتی بها) علی انها سنة (فی وقته) ای الظهر (قبل شفعه) عند محمد وبه یفتی وقال الشامی تحت (قوله وبه یفتی) اقول وعلیه المتون لکن رجح فی الفتح تقدیم الرکعتین قال فی الامداد وفی فتاوی العتابی انه المختار وفی مبسوط شیخ الاسلام انه الاصح لحدیث عائشة انه علیه السلام کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر یصلیهن بعد الرکعتین وهو قول ابی حنیفة وکذا فی جامع قاضی خان اھ والحدیث قال الترمذی حسن غریب فتح (شامی ص ۷۵۲ ج۱)

اور بعض کتابوں میں ان سنتوں کا ساقط ہوجانا لکھا ہے، مگر شامی نے ان کے ایک استدلال کا جواب دیدیا ہے، اور دوسرے استدلال کے بعد فتأمل فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی پہلی سنتوں کا ظہر کی پہلی سنتوں کے .... برابر[1] ہونا راجح ہے، واللہ اعلم بالصواب، اور اگر بالفرض اُن کے سقوط کو راجح کہا جاوے تب بھی قضا سے اصرار کے ساتھ منع کرنا ٹھیک نہیں، کوئی شخص احتیاط کی بنا پر پڑھے تو اس کے روکنے کے کیا معنی، سنت نہ ہوں گی تو نفل کا ثواب مل جاوے گا، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، ۲۵ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۵ھ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ، ۲۶ رجمادی الاولیٰ سنہ ۴۵ھ

استخارہ میں دونوں شقیں برابر ہوں تو کیا کرنا چاہئے؟	**سوال** (۱۷) کسی خاص رسم کے معاملہ میں استخارہ کرنے کے لئے دو رکعت نماز پڑھ کر دعاء اللّٰہم انی استخیرک الخ پڑھنا

[1] وقد صرح به ابن نجیم فی البحر، انظر بحر الرائق باب الجمعة،

اس کے بعد دل میں غور کرتا پھر جس طرف ارادہ پختہ ہوجاوے اسے حکم سمجھنا[٥] اور اس پر کاربند ہونا لکھا ہے، مگر مجھ گنہگار شخص کی یہ حالت ہے کہ غور کرنے میں دونوں جانب خیال کی حالت یکساں رہتی ہے،

الجواب؛ دونوں میں خیر ہے جس پر چاہے عمل کرے، بشرطیکہ وہ دونوں شقیں جائز ہوں، اور اگر ان میں سے ایک شق ناجائز ہو تو استخارہ جائز نہیں ہے، کیونکہ استخارہ اسی وقت مشروع ہے جبکہ دونوں صورتیں جائز ہوں، کتبہ العبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۵ رمضان ۴۸ھ

تہجد کی کتنی رکعتیں ہیں

سوال (۱۸) تہجد کی نماز کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، کتنی رکعتیں پڑھنی چاہئے، اور دو دو رکعت کی نیت باندھنی چاہئے یا چار چار کی؟

الجواب؛ آٹھ رکعتیں مختار ہیں، اور دو دو رکعت پڑھنا افضل ہے،

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ — عبد الکریم عفا عنہ ۱۸ ر رمضان ۴۸ھ

صلوٰۃ التسبیح کی دوسری رکعت کی تسبیحات میں راجح قول کونسا ہے، اور اس سے متعلق ایک ضمنی سوال،

سوال (۱۹) صلوٰۃ التسبیح کے بارے میں ترمذی شریف کے صفحہ ٦٣ پر ابو رافعؓ کی حدیث اور مشکوٰۃ کے صفحہ ۱۱۷ پر ابن عباسؓ کی روایت سے دوسری رکعت کے ختم کی تسبیحات بعد تشہد پڑھی جاسکتی ہیں، کیونکہ ان کی روایتوں میں پہلی کے ختم کی بھی جلسۂ استراحت میں ہیں، مگر کہتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک یہ صورت مرجوح ہے، راجح عبد اللہ بن المبارکؒ والی ہے، جو ترمذی کے صفحہ ٦٤ پر ہے، اور اس میں جلسۂ استراحت کی ضرورت نہیں، کیونکہ قیام ہی میں تسبیحیں ہوجاتی ہیں، تو اس راجح صورت عند الحنفیہ پر دوسری رکعت کی تسبیحات کی کیا صورت ہوگی، یا جو عبد اللہ بن المبارکؒ نے سبحانک الخ سے بیان فرمایا ہے یہی ہے، اور آنجناب کی معمول بہا کونسی صورت ہے؟

الجواب؛ ابن عباسؓ کی روایت میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں، کہ تسبیحات تشہد سے پیشتر پڑھی جاویں یا بعد تشہد، اور سوال میں بعد تشہد ہونے پر جو استدلال کیا گیا ہے اس سے مدعا ثابت نہیں ہوتا، پہلی اور تیسری رکعت کے جلسۂ استراحت

---

[٥] حکم کا مطلب یہ ہے کہ ایک جانب رجحان ہونیکے بعد اس پر عمل کرنا بہتر ہے، لیکن اگر دوسری مرجوح شق پر بھی عمل کرلیا جاوے تو جائز ہے، ۱۲ عبد الکریم عفی عنہ

میں تسبیحات ہونے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ دوسری اور چوتھی رکعت میں بعد تشہد ہو، البتہ اگر قرات پر قیاس کیا جاوے تو ممکن ہے، یعنی یوں کہا جاوے کہ جس طرح قیام میں قرات کے بعد تسبیحات ہیں اسی طرح قعود میں تشہد کے بعد پڑھی جاویں، لیکن ایک روایت میں قبل تشہد پڑھنے کی تصریح وارد ہوئی ہے، اس واسطے اس قیاس پر عمل نہ ہوگا، بلکہ روایت پر عمل کیا جاوے گا، والروایۃ قد اخرجھا الدارقطنی عن ابن عباس مرفوعا وفیھا انك اذا جلست للتشھد قلت ذلك عشر مرات قبل التشھد (اللآلی المصنوعۃ ص ۲۰) وقال العلامۃ السیوطی رجالہ ثقات الاصدقۃ وھو الدمشقی کما نسب فی روایۃ ابی نعیم وابن شاھین وھو ابن عبد اللہ ویعرف بالسمین ضعیف من قبل حفظہ ووثقہ جماعۃ (ص ۲۲)۔

اور ابن المبارک کی روایت میں سجدۂ ثانیہ کے بعد تسبیحات ہی نہیں جو ان کے محل کا سوال ہو، فافہم، اور عبد اللہ بن المبارک سے ترمذی نے جو روایت کی ہے وہ مرفوعاً بھی مروی ہے، رواہ البیھقی من حدیث ابی خباب الکلبی عن ابی الجوزاء عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۵۲، ج ۳) والکلبی مختلف فیہ ضعفہ کثیرون وذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال ابن نمیر صدوق کان صاحب تدلیس قال الفلاس قال ابو نعیم لم یکن بابی خباب بأس الا انہ کان یدلس وکذا قال احمد وابن معین وابوداؤد عن ابی نعیم وقال احمد بن سلیمان الرھاوی عن ابی نعیم مثل ذلك وزاد ما سمعت منہ شیئا الا شیئا قال فیہ حدثنا (تھذیب التھذیب) اور اللآلی المصنوعۃ (ص ۴۴) میں ہے قال الحاکم ولا یتھم بعبد اللہ انہ یعلم مالم یصح عندہ سندہ وایضا فیہ (ص ۲۳) وقال البیھقی بعد تخریجہ کان عبد اللہ بن المبارك یصلیھا وتداولہ الصالحون بعضھم بعضا وفی ذلك تقویۃ للحدیث المرقوم، پس یہ روایت بھی ثابت ہے، اور جب دونوں طریق ثابت ہیں تو دونوں طرح پڑھنا جائز ہے، جس طریق سے چاہیں پڑھ لیں اور حنفیہ اگر طریق اول پر پڑھیں، یعنی جلسۂ استراحت کریں تو اُن پر کوئی اعتراض نہیں

کیونکہ یہ ایک جداگانہ نماز ایک خاص طریق سے وارد ہوئی ہے، پس جس طرح اس میں تسبیحات کا اضافہ ہے اسی طرح جلسۂ استراحت کا اضافہ ہے، اس سے تمام نمازوں میں جلسۂ استراحت ہونا لازم نہیں آتا، اور حنفیہ میں سے بعض نے دونوں طریق نقل کئے ہیں، اور بعض نے طریق اول پر اقتصار کیا، اور بعض نے طریق ثانی پر، اور علامہ شامی نے کہا ہے: "الذی ینبغی فعل ہذہ مرۃ وہذہ مرۃ" اور ملا علی قاریؒ نے بھی مرقات میں فرمایا ہے "وینبغی للمتعبد ان یعمل بحدیث ابن عباسؓ تارۃ ویعمل بحدیث ابن المبارک اخری" ولیکن قنیہ میں روایت ابن المبارک کے متعلق ہے "انہا المختار من الروایتین" (شامی ص ۱۹، ج ۱) ونیز علامہ نوویؒ نے اذکار میں اس کی موافقت کی ہے (بذل المجہود، ص ۲۷۶ ج ۲) اور امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے "ہذا ہو الاحسن وہو اختیار ابن المبارک (ص ۱۸۶ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ راجح طریق ابن المبارک کا ہی، اور نوویؒ وغزالیؒ کی موافقت سے معلوم ہوا کہ حنفیہ میں سے جن حضرات نے اس کو اختیار کیا ہے، ان کا مطمح نظر موافقت حنفیہ فی عدم الجلسۃ للاستراحۃ نہیں ہے، بلکہ کوئی اور وجہ ہے، اور اگر کوئی حنفی یہ بھی کہے کہ جب دونوں طریق ثابت ہیں تو ہمارے لئے وہ طریق اختیار کرنا بہتر ہے، جو اقرب الی المذہب ہو تو اس میں کچھ حرج بھی نہیں، ان پر اعتراض تو جب ہوتا .... جب غیر ثابت کو صرف موافقتِ مذہب کی بناء پر ترجیح دیتے، واللہ اعلم،

۱۷ ر شوال ۱۳۵۱ھ — کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

فصل فی التراویح

تراویح کی چار رکعت میں اگر قعدۂ اولیٰ بھول گیا تو کیا حکم ہے؟

سوال (۱) امداد الفتاوی جلد اول صفحہ ۹۳ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ "تراویح میں قعدۂ اولیٰ کو سہواً ترک پر سجدۂ سہو کے بعد چاروں محسوب ہوں گی" اور قاضی خاں کی عبارت سے استدلال کیا ہے، حالانکہ کبیری ہندوستانی مطبع ص ۳۹۰ میں ہے "ان صلی اربع رکعات بتسلیمۃ واحدۃ ولم یقعد علی رکعتین تجزیٔ عن تسلیمۃ واحدۃ وہو المختار قال قاضی خاں وہو الصحیح وقال ابو اللیث تنوب عن تسلیمتین والصحیح الاول انتہی مختصراً"، اور طحطاوی مراقی الفلاح ص ۲۲۵ میں ہے "ویسلم علی کل رکعتین فاذا وصلہا وجلس علی کل شفع فالاصح انہ ان تعمد ذلک

کرہ وصحت واجزائہ عن کلہا واذا لم یجلس الا فی آخر اربع نابت عن تسلیمۃ "، اس پر طحطاوی نے ایک خلجان بھی کیا ہے، مگر کچھ وقیع نہیں، بالجملہ اس کی تحقیق حضرت مولانا سے مراجعت کے بعد فرمادیں، انتظار ہے، اب تک کبیری وغیرہ ہی پر عامل تھا، مگر فتاویٰ کی عبارت سے تردد میں پڑ گیا، السائل محمد زکریا کاندھلوی،

الجواب: مکرمی المحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بجواب مسئلہ عرض ہے کہ فتاویٰ قاضی خاں کی عبارت میں نے دیکھی، اس میں بھی آگے چل کر دوسرے ہی قول کو صحیح لکھا ہے، جیساکہ کبیری وطحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں ہے، قال قاضی خان وقال الفقیہ ابو جعفر والشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضلؒ فی التراویح ینوب الاربع عن تسلیمۃ واحدۃ وھو الصحیح لان القعدۃ علی رأس الثانیۃ فرض فی التطوع فاذا ترکہا کان ینبغی ان تفسد صلوٰتہ اصلا کما ھو وجہ القیاس وانما جاز استحسانا فاخذنا بالقیاس وقلنا بفساد الشفع الاول واخذنا بالاستحسان فی حق بقاء التحریمۃ واذا بقیت التحریمۃ صح شروعہ فی الشفع الثانی وقد اتمہا بالقعدۃ فجاز عن تسلیمۃ واحدۃ وعن ابی بکر الاسکاف الخ فذکر نحوہ، ص ۱۱۵، میں نے یہ عبارت حضرت مولانا کو بھی دکھلائی فرمایا کہ میرا معمول تو عرصہ سے دوسرے ہی قول پر فتوی دینے کا ہے، کہ یہ چار قائم مقام دو کے ہوں گی، جیساکہ کلام مشائخ سے اس کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے، لیکن امداد الفتاویٰ کا جواب غالباً اس بناء پر ہے کہ آجکل طبائع میں کسل غالب ہے، اگر چار کو قائم مقام تسلیمۃ واحدۃ کے مان کر دو رکعت کا اعادہ کیا جائے گا تو وہ اعادہ مع اس مقدار قرآن کے ہوگا، جو اُن رکعتوں میں پڑھا گیا ہے، اور بعض دفعہ اُن دو رکعتوں میں بہت زیادہ مقدار تلاوت کی جاچکی ہے، ان کا اعادہ مع مقدارِ تلاوت نمازیوں پر بہت گراں ہوتا ہے حتیٰ کہ فرماتے تھے کہ میں نے بعض جگہ اس پر لڑائی ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اس لئے تسہیل عوام کے لحاظ سے امداد الفتاویٰ میں فقیہ ابو اللیث کے قول پر میں نے اکتفاء کیا، کہ جب مسئلہ میں دو قول موجود ہیں، اور ایک قول میں عوام کو سہولت ہے تو اسکو اس جہت سے ترجیح ہے، وقال النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا، گو قواعد کے لحاظ سے دوسرا ہی قول صحیح ہے ھذا واللہ اعلم، پس جس جگہ دوسرے قول پر فتویٰ دینے سے لوگوں میں توحش اور تنگی کا

اندیشہ ہو وہاں میرے نزدیک پہلے ہی قول پر فتوی دینا چاہئے، واللہ اعلم، ۲۲ رمضان ۴۷ھ

حروف کاٹ کر تیز پڑھنے والے حافظ کے پیچھے نماز مکروہ ہے

سوال (۲) ایسا حافظ جو سال بھر قرآن مجید کی تلاوت نہ کرتا ہو، اور حافظ بھی پختہ نہیں ہے، دنیا دار ایسا کہ تین چار قسم کا روزگار کئے ہوئے ہے، مگر اتنا چاہتا ہے کہ سال بھر میں بذریعہ تراویح قرآن سُنا دوں، انداز اس کے سنانے کا یہ ہے کہ صاف لفظ نہیں ادا کرتا، کسی لفظ کا کوئی جزو پڑھا اور تیزی میں اس لفظ کا کوئی جزو چھوڑ دیا، اور اسی تیزی میں کئی بلکہ آیت یا دو آیت یا کئی آیتیں چھوڑ گیا تو ایسے حافظ کے پیچھے نماز تراویح درست ہے یا نہیں؟

الجواب: ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا مکروہ ہے، ۲۲ شوال ۴۷ھ

ایک حافظ کا ایک رمضان میں تین چار جگہ قرآن ختم کرنا،

سوال (۳) ایک حافظ ایک رمضان میں مثلاً تین عشر میں تین جگہ تراویح میں قرآن ختم کرتے ہیں اور ہر ایک جگہ مقتدی غیر ہوتے ہیں، اب سوال ہے کہ ایسے ختم وتراویح جائز ہے یا نہیں، اگر اس کے جواز کی ایک دلیل مرقوم ہو تو بہتر ہے؟

الجواب: جائز ہے قال فی نور الایضاح وشرحہ وسن ختم القراٰن فیہا ای مرۃ فی الشہر علی الصحیح وھو قول الاکثر قال الطحطاوی ومرتین فضیلۃ وثلاثا فی کل عشر مرۃ افضل اھ ص ۲۴۱، قلت والاطلاق یدل علی افضلیۃ الختم ثلاثا مطلقا سواء کان فی مسجد واحد او فی ثلاث مساجد فی کل مسجد مرۃ، اور فتاوی قاضی خان میں جس صورت کو مکروہ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ روزانہ ایک مسجد میں پوری تراویح پڑھائے اور پھر وہی امام دوسری مسجد میں جا کر تراویح پڑھائے یہ مکروہ ہے، قال فی صفحہ ۱۱۲ ج ۱ ولو صلی امام واحد التراویح فی مسجدین کل مسجد علی وجہ الکمال اختلف المشائخ فیہ حکی عن ابی بکر الاسکاف رح انہ لا یجوز وقال ابو بکر سمعت ابا نصر انہ قال یجوز لاہل المسجدین جمیعا کما لو اذن المؤذن واقام وصلی ثم اتی مسجدا اٰخر فاذن واقام وصلی معہم فانہ لا یکرہ وانما یکرہ اذا اذن واقام ولا یصلی معہم کذلک فی التراویح الی ان قال ھذا اذا ام للناس مرتین فان لم یکن اماما وصلی التراویح فی مسجد بجماعۃ ثم ادرک جماعۃ اخری فی مسجد اٰخر

فصلیٰ لا بأس بہ، اھ، اور وجہ کراہت یہ ہو کہ جب ایک بار یہ شخص تراویح پڑھ چکا ہے، تو دوبارہ اس کی نماز نفل ہوگی اور مقتدیوں کی تراویح ہوگی تو امام کی نماز مقتدی سے اضعف ہوگی، وذا لایجوز بخلاف اس کے ایک مسجد میں ختم کرکے دوسری مسجدوں میں ختم کرے، اور ہر جگہ امام و مقتدی کی نماز تراویح کی ہو اس میں کوئی حرج نہیں، واللہ اعلم، ۳ شعبان

روزہ اور تراویح لازم و ملزوم ہیں یا نہیں

سوال (۴) نماز تراویح اور روزہ لازم و ملزوم ہیں یا نہیں، بے روزہ نماز تراویح ہرگز نہ پڑھے یا پڑھ لے؟

الجواب: روزہ اور تراویح لازم و ملزوم نہیں ہیں، اگر کوئی شخص عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے لیکن وہ تراویح پڑھ سکتا ہے تو اس کو تراویح پڑھنا چاہیئے، ۲۱ رمضان ۱۳۴۱ھ

فصل کی کٹائی کی وجہ سے روزہ افطار کرنے والے کی اقتدار کا حکم،

سوال (۵) فصل کٹائی یا کسی ایسے ہی سخت مشقت والے کام کے لئے روزہ کا افطار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر فصل کاٹنے میں تاخیر کرنے سے زراعت کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تب تو کاشتکار کو لازم ہے کہ فصل کو بعد رمضان کے کاٹے، اور اگر تاخیر سے زراعت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اس لئے رمضان ہی میں کاٹنا پڑے، اور کٹائی کی حالت میں روزہ دشوار ہو تو کاشتکار کو اس حالت میں افطار جائز اور درست ہے، بعد رمضان کے ان ایام کی قضا کرے، کفارہ نہ ہوگا، قال فی الفتاوی الکاملیۃ سئلت عن حصاد لم یقدر علی حصاد زرعہ مع الصوم واذا اخرہ یہلک ھل یجوز لہ الافطار حینئذ فالجواب نعم یجوز لہ ذلک حینئذ فقد نقل المحقق ابن عابدین رحمہ اللہ فی حواشیہ علی الدر من الخیر الرملی ما نصہ وعلی ھذا الحصاد واذا لم یقدر علیہ مع الصوم ویہلک الزرع بالتاخیر لا شک فی جواز الفطر والقضاء اھ واللہ اعلم، ص ۱۶ و ۱۷، ۲۲ رمضان ۱۳۴۱ھ

نماز تراویح میں قرآن کی سورتوں کی ترتیب کا حکم

سوال (۶) ایک شخص نماز تراویح کی چار رکعت کی نیت کرتا ہے اول رکعت میں سورۂ والعصر پڑھتا ہے، دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھتا ہے، تیسری میں سورۃ الہمزہ اور چوتھی میں پھر سورۂ اخلاص پڑھتا ہے، اس صورت میں نماز تراویح ہوگی کہ نہیں، اگر ہوگی تو حوالۂ کتاب اور استدلال حدیث کی ضرورت ہے اور اگر نہیں ہوگی تو بھی دلائل کی ضرورت ہے، بہر حال ہر حالت میں ثبوت اور حوالہ

کتاب کی ضرورت ہے، ایسا کرنے والے کو کیا کرنا چاہئے، اور اس کے لئے کیا حکم ہے، میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ نماز نہیں ہوگی، کیونکہ ترتیبِ قرآن ٹھیک نہیں، اور ہر نماز کے لئے ترتیبِ قرآن کا ہونا ضروری ہے، بہرحال اس مسئلہ کے لئے جو کچھ ضروری ہو تحریر فرمائیے،

(۲) ایک شخص دو رکعت نماز تراویح کی نیت کرتا ہے پہلی رکعت میں سورۂ والعصر پڑھتا ہے دوسری میں سورۃ الاخلاص اسی طرح وہ نماز تراویح کی بست رکعتیں ختم کرتا ہے، یا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ دونوں صورتوں کے لئے دلائل کی ضرورت ہے،

الجواب: قال فی الخلاصہ رجل یصلی اربع رکعات بتسلیمۃ وقعد فی الثانیۃ قدر التشہد اختلف المشائخ فیہ اکثرہم علی انہ یجزی عن تسلیمتین اھ ص ۶۵ ج ۱، صورتِ مذکورہ میں نماز درست ہوجاوے گی، مگر تراویح میں چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا خلافِ سنت ہے،

قال فی الخلاصۃ وان قرأ فی رکعۃ سورۃ وفی رکعۃ اخریٰ فوق تلک السورۃ او فعل ذلک فی رکعۃ مکروہ وان وقع ھذا من غیر قصد بان قرأ فی الرکعۃ الاولیٰ قل اعوذ برب الناس یقرأ فی الرکعۃ الثانیۃ ھذہ السورۃ ایضا وھذہ کلھا فی الفرائض اما فی النوافل لایکرہ اھ ص ۹۷ ج ۱، اس سے معلوم ہوا کہ سورتوں کی ترتیب فرائض میں ضروری ہے، غیر ترتیب سے پڑھنے میں کراہت ہوگی، لیکن نوافل میں ہر طرح اختیار ہے گو..... نوافل میں بھی ترتیب کی رعایت افضل ہے، لیکن جو صورت سائل نے لکھی ہے اس میں تو کچھ بھی حرج نہیں، کیونکہ نوافل و تراویح کا ہر شفعہ صلوٰۃ مستقلہ ہے، اور ہر شفعہ کی قرأت میں الگ الگ رعایت ترتیب کی ہے، گو مجموعہ شفعتین میں ترتیب نہ رہی ہو اس کا مضائقہ نہیں، ۲۳ رمضان ۱۳۴۵ھ

نماز تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد دعاء مانگنے کا حکم،

سوال (۷)........ یہاں کی مسجدوں میں دستور یہ تھا کہ رمضان المبارک میں نماز تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد امام و مقتدی کچھ وظیفہ پڑھتے تھے، پھر وظیفہ کے بعد امام ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگتا تھا، اور جملہ مقتدی آمین کہتے تھے، اس سال اتفاق سے مدینہ طیبہ زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً سے خطیب مسجد نبوی ایک مسجد میں تشریف لائے، اور وہ اس مسجد موصوف کے امام مقرر ہوتے، یہ مدنی امام حافظِ قرآن بھی تھے، لہذا اس سال رمضان المبارک میں آپ نے تراویح میں قرآن پاک پڑھا، لیکن ہمیشہ کے دستور کے خلاف ہر چار رکعت

تراویح کے بعد صرف ذکر و وظیفہ پر قناعت کی دعاء نہیں مانگی، البتہ بیس رکعت تراویح کے ختم پر ذکر کر کے دعاء مانگی، دوسرے روز جب اس واقعہ کی اطلاع دوسری مسجدوں میں ہوئی تو ایک مسجد میں اُس پر سخت اعتراضات کئے گئے، جب امام صاحب مدنی سے اس کی بابت دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں مسجد نبویؐ میں جس طریقہ سے تراویح پڑھی جاتی ہیں میں نے اسی طریقہ پر پڑھیں، چونکہ مدینہ پاک میں ہر چہار رکعت کے بعد دعاء نہیں مانگی جاتی ہے، لہٰذا اسی کے مطابق میں نے بھی کیا، مجھے یہاں کا دستور نہ تو معلوم تھا، اور نہ یہاں کے رواج کی تقلید میرے ذمہ ضروری تھی، اُس دوسری مسجد والوں نے نفسانیت کی بنا پر ایک صاحب سے اپنی مسجد میں وعظ کہلایا، واعظ صاحب نے کھلم کھلا ہر چہار رکعت پر دعاء نہ مانگنے پر بہت کچھ اعتراضات کئے، اور اپنے نزدیک یہاں کے اعتبار سے اس جدید فعل کی پوری تردید کر دی،

پس اب سوال یہ ہو کہ ہر چہار رکعت تراویح کے بعد صحابہ کرام رضؓ وائمہ مجتہدینؒ خصوصاً امام اعظم ابو حنیفہؒ کا عمل در آمد دعاء کے متعلق کیا تھا، اور[۲] اگر ان کا دستور العمل نہیں تھا، تو آیا یہ دعاء مانگنا بلا کراہت جائز ہے یا نہیں، اور[۳] یہ کہ محض جائز ہی ہے یا مستحب یا سنت، اور[۴] امام کو اس دعاء پر مجبور کرنا اور نہ کرنے پر شور و شر پھیلانا شرعاً درست ہے یا نہیں، در[۵] صورتِ جواز جب عوام کا اس قدر اصرار ہو کہ تارک کو موجب ملامت قرار دیں تو عوام کے عقیدے کی درستی کے لئے اس کا ترک کر دینا بہتر ہے یا نہیں ؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہر چہار رکعت کے بعد دعاء مانگنا جائز بھی ہو تو بھی موجودہ حالات میں اس کا ترک کر دینا ضروری ہو گا، اس لئے کہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ جب کسی غیر ضروری فعل پر مداومت عقیدۂ عوام کے فساد کا باعث ہو تو خواص پر واجب ہے کہ عقیدۂ عوام کی درستی کے لئے اس کو ترک کر دیں، پس سوال مذکور کا مفصل جواب ارشاد فرمائیں،

الجواب واللہ الموفق للصواب : قال فی الدر یجلس ندبا بین کل اربعۃ بقدرھا وکذا بین الخامسۃ والوتر ویخیرون بین تسبیح وقراءۃ وسکوت وصلوٰۃ فرادیٰ الخ قال العلامۃ الشامی تحت قولہ بین تسبیح قال القہستانی فیقال ثلث مرات سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزۃ والجبروت

الی قولہ لا الٰہ الا اللہ نستغفر اللہ نسألک الجنۃ ونعوذبک من النار کما فی منھج العباد اھ ص ۷۳۹ ج ۱، قلت وفی البدائع ومنھا ان الامام کلما صلی ترویحۃ قعد بین الترویحتین قدر ترویحۃ یسبح ویھلل ویکبر ویصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویدعو وینتظر ایضا بعد الخامسۃ قدر ترویحۃ لانہ متوارث من السلف اھ ص ۲۶۰ ج ۱، ولعل المراد بقولہ یدعو ان یأتی بالادعیۃ الماثورۃ لا الدعاء برفع الیدین لان المتوارث من السلف فی ھذا الموضع انما ھو مطلق الانتظار سواء کان بالجلوس او بالقیام او بالسکوت او بالذکر ونحوہ قال فی شرح المنیۃ ولیس المراد حقیقۃ الجلوس بل المراد الانتظار وھو مخیر فیہ ان شاء جلس ساکتا وان شاء ھلل او سبح او قرأ او صلی نافلۃ منفردا وھذا الانتظار مستحب لعادۃ اھل الحرمین فان عادۃ اھل مکۃ ان یطوفوا بعد کل اربع اسبوعا ویصلوا رکعتی الطواف وعادۃ اھل المدینۃ ان یصلوا اربع رکعات، وقد روی البیھقی باسناد صحیح انھم کانوا یقومون علی عھد عمرؓ یعنی بین کل ترویحتین اھ (ص ۳۸۶)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ ہر ترویحہ کے بعد مستحب مطلق انتظار ہے جس میں امام و مقتدین کو اختیار ہے کہ خواہ خاموش بیٹھے رہیں یا اذکار وغیرہ میں مشغول رہیں، اور دعاء بہیئت متعارفہ خصوصیت کے ساتھ نہ درمیانی ترویحوں میں مسنون ہے نہ آخری ترویحہ میں، لیکن اس میں شک نہیں کہ مطلق سکوت سے ذکر وادعیہ میں مشغول ہونا بہتر ہے، پس اگر جائز وامر اختیاری سمجھ کر تمام ترویحوں میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کی جائے تو اس کا بھی مضائقہ نہیں، اور اگر صرف ترویحۂ خامسہ میں دعاء کی جائے تو اس کا بھی مضائقہ نہیں، اور اگر کسی ترویحہ میں بھی دعاء نہ کریں یہ بھی جائز ہے، یہ تو اصل حکم ہے، لیکن ایک عارض پر نظر کر کے اولیٰ یہ ہے کہ درمیانی ترویحوں میں دعاء نہ کی جائے، وہ یہ کہ ہر ترویحہ کے بعد بطریق متعارف دعاء کرنا موجب ثقل علی القوم ہوتا ہے اگر تسبیحات وتہلیلات کے بعد خشوع کے ساتھ دعاء کی جائے گی تو اس میں ضرور کچھ دیر ہوگی، اور اگر بدون خشوع وحضور قلب کے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر منہ کو مل لئے تو ایسی دعاء سے دعاء نہ کرنا بہتر ہے، ان اللہ لا یقبل الدعاء من قلب لاہٍ، اور فقہاء نے امام تراویح کو تعلیم فرمائی ہے کہ صلوٰۃ تراویح میں بعد تشہد کے صرف اللھم صل علی محمد کہکر سلام پھیر دیا کرے، ادعیہ ماثورہ نہ پڑھے، مخافۃ الثقل علی القوم، توجب دعاء مسنون کو فقہاء نے ترک کرنے کی تعلیم کی ہے تاکہ قوم

پر ثقل نہ ہو تو دعاء ترویحہ جو کہ مسنون بھی نہیں بلکہ جائز اور غایت سے غایت مستحب ہے اس کو ترک کرنا ثقل سے بچنے کے لئے کیوں افضل و اولیٰ نہ ہوگا، ویاتی القوم والامام بالثناء فی کل شفع ویزید الامام علی التشھد الا ان یمل القوم فیاتی بالصلوات ویکتفی باللّٰھم صل محمد لانہ الفرض عند الشافعی ویترك الدعوات ویجتنب المنکرات اھ کذا فی الدر علی الشامیۃ (ص ۳۰، ج ۱) اور ہرچند کہ اصل حکم تخییر پر نظر کرتے ہوئے ترویحہ خامسہ میں بھی دعاء بطریق متعارف کو کچھ ترجیح معلوم نہیں ہوتی مگر ایک علت پر نظر کر کے ترویحہ خامسہ میں دعاء کرنا مستحب و اولیٰ ہوجاتا ہے، وہ یہ کہ ترویحۂ خامسہ میں حزب قرآن پورا ہوجاتا ہے، اور بعد تلاوت حزب قرآن کے دعاء کرنا مستحب ہے، اور وہ وقت اجابتِ دعاء کا ہے، قال فی الاحیاء فی بیان آداب التلاوۃ الثامن ان یقول فی مبتدأ قراءتہ اعوذ باللّٰہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم، الی ان قال ولیقل عند فراغہ من القراءۃ صدق اللّٰہ تعالیٰ وبلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اللّٰھم انفعنا بہ وبارك لنا فیہ الحمد للّٰہ رب العالمین استغفر اللّٰہ الحی القیوم اھ (ص ۲۴۹، ج ۲) وقال فی الحصن فی احوال اجابۃ الدعاء ما نصہ وعقیب تلاوۃ القرآن ولاسیما الختم ط موص خصوصاً من القاری. ت ط اھ (ص ۳۰ و ۳۱) وفی الاتقان للسیوطی ناقلاً عن الشعب من حدیث انس مرفوعا من قرأ القرآن وحمد الرب وصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم واستغفر ربہ فقد طلب الخیر مکانہ اھ (ص ۱۱۶، ج ۱)، غرض تلاوتِ قرآن سے فارغ ہوکر دعاء کرنا مستحب ہے، اور یہ وقت قبولِ دعاء کا ہے، اس لئے ترویحہ خامسہ میں دعاء کرنا مستحب و افضل و اولیٰ ہوگا، اور ہر ترویحہ میں دعاء کرنا ایسا ہوگا، جیسے کوئی شخص تلاوت قرآن کے وقت ہر رکوع یا ہر ربع پر ہاتھ اٹھا کر دعاء کیا کرے، اور یقیناً یہ صورت مستحدث ہے، سلف صالحین صرف فراغت عن الحزب کے وقت دعاء کیا کرتے تھے، اور یہی منصوص بھی ہے، وسطِ قرأت یا تلاوت میں دعاء کرنا ثابت نہیں، لہذا گاہے گاہے تو مضائقہ نہیں، مگر اس پر مواظبت بدعت ہے، اور اگر مواظبت سے گذر کر اس کے خلاف سے مزاحمت ہونے لگے تو یقیناً یہ فعل ممنوع ہوگا، کیونکہ اصولِ شرع میں یہ بات منقح ہوچکی ہے کہ امر مباح و مستحب بلکہ

سنت کو بھی اگر اس کی حد سے بڑھا دیا جائے اور اس کے تارک پر ملامت ہونے لگے تو ایسے وقت میں اس مباح یا مستحب یا سنت کا ترک عوام و خواص سب پر ضروری ہو جائے گا، ہذا واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، ۱۸ ر ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ

ایک مسجد میں قرآن ختم کرنے کے بعد دوسری مسجد میں قرآن مجید سنانے کا حکم اور اس پر ایک شبہ کا جواب

سوال (۸) اس مسئلہ میں مدت سے شبہ ہے لہذا حضرت والا سے استفتاء کرتا ہوں، امید ہے کہ جواب سے تشفی خاطر فرما دیں گے ایک حافظ قرآن نے رمضان کے عشرۂ اولیٰ میں ایک مسجد میں چند مقتدیوں کو ایک ختم لوجہ اللہ سنایا، پھر عشرۂ ثانیہ میں دوسری مسجد میں دوسرے مقتدیوں کو جنھوں نے ختم سنا نہیں ان کو دوسرا ختم سنایا، اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں بناء قوی علی الضعیف لازم آتا ہے، کیونکہ دوسرے مقتدیوں کو ایک ختم سننا سنتِ مؤکدہ ہے، اور حافظ صاحب کو دوسرا ختم سنانا مستحب ہی، یہ تو بندہ کا شبہ ہے، باقی جو حضرت کی مرضی ہو وہی صواب ہے؟

الجواب: بناء القوی علی الضعیف یہ ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز سے اضعف ہو اور یہاں ایسا نہیں، کیونکہ عشرۂ ثانیہ میں تراویح کی نماز امام و مقتدی دونوں پر علی السواء سنتِ مؤکدہ ہی، اس لئے یہ صورت جائز ہے، دوسرے یہ بھی مسلّم نہیں ہے کہ امام کی قرأت مقتدیوں کی قرأت سے اس صورت میں اضعف ہے، کیونکہ گو نماز شروع کرنے سے پہلے تو امام پر قرأت واجب و سنت نہ تھی، بلکہ نفل تھی، لیکن نیت و افتتاحِ صلوٰۃ کے بعد اس پر قرأت بقدر صحت صلوٰۃ فرض ہو گئی، اور اب وہ جتنی بھی قرأت کرے گا، سب فرض میں داخل ہو گی، اگرچہ سارا قرآن ہی ایک نماز میں پڑھ جائے یہ سب فرض ہی میں داخل ہو گی، ۹ شعبان ۱۳۴۲ھ

فاسق امام کے پیچھے نمازِ تراویح پڑھنے کا حکم اور اس کی تفصیل

سوال (۹) .... بعض بعض حفاظِ قرآن مجید بعد گذر جانے ماہِ رمضان المبارک کے تارک الصلوٰۃ ہو جاتے ہیں، اور بعض پنجوقتہ نمازیں سے ایک دو وقت کی نماز گاہے بگاہے ادا کرتے ہیں، یا ڈاڑھی بالکل منڈواتے ہیں، یا نہایت مبالغہ کے ساتھ کترواتے ہیں کہ ایک انگشت کے برابر بھی نہیں چھوڑتے، جب ماہِ مبارک آتا ہے تو ایسے حافظ نماز تراویح میں امام بن کر کلام پاک سناتے ہیں تو ایسے حفاظ کے پیچھے نماز.. یا تراویح ... پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں، اور اگر مکروہ ہے تو تنزیہی ہے یا تحریمی، اور مکروہ تحریمی کی

کسی آیتِ قرآنی یا حدیث صحیح سے تشریح فرما دیجئے، اور نیز مکرر یہ ہے کہ مرتکب مکروہ تحریمی کا گنہگار ہوتا ہے یا نہیں، اور نماز بکراہت تحریمی ادا کی ہوئی واجب الاعادہ ہوتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا،

الجواب: اگر یہ لوگ رمضان میں گذشتہ گناہوں سے توبہ کرلیں اور نماز پنجوقتہ کی پابندی شروع کردیں، اور ڈاڑھی منڈانا یا کتروانا چھوڑ دیں تب تو ان کے پیچھے تراویح مکروہ نہیں، اور اگر رمضان میں بھی وہ اپنے افعال فسقیہ پر باقی ہوں تو ان کے پیچھے نماز مکروہ ہے، اور اس میں اختلاف ہے کہ کراہتِ تنزیہی ہے یا تحریمی، شرنبلالی اور زیلعی نے کراہتِ تحریمیہ کو ترجیح دی ہے، اور طحطاوی بھی اسی طرف مائل ہیں، باقی علماء نے تنزیہی کہا ہے، مگر یہ کراہت اُس وقت تک ہے جبکہ کوئی امام نیک دستیاب ہوسکے، اور اگر بجز فاسق کے کوئی حافظ نہیں ملتا، تو اہل محلہ کو چاہئے کہ اس صورت میں ختمِ قرآن کی طمع نہ کریں، کسی ناظرہ خواں نیک آدمی کو امام بناکر الم ترکیف سے تراویح ادا کرلیں، اگر اہلِ محلہ ایسا نہ کریں اور حافظ فاسق ہی کو امام بناویں تو پھر جو کچھ گناہ ہوگا، اوّل امام بنانے والوں کو ہوں گا، دوسرے لوگوں کو بلاکراہت اس کے پیچھے تراویح پڑھنا جائز ہے، مگر اپنے افعال و اقوال سے اس امام کی عظمت و تعظیم نہ کریں، اور اگر محلہ میں کوئی دوسری مسجد ایسی ہو جہاں نیک امام تراویح پڑھاتا ہو تو وہاں جاکر تراویح پڑھنا چاہئے، فاسق کے پیچھے نہ پڑھنا چاہئے، اور اگر نیک امام کوئی نہیں ملتا، نہ حافظ نہ ناظرہ خواں تو پھر فاسق کی اقتداء بلاکراہت جائز ہے، قال فی نور الایضاح وکرہ امامۃ العبد الی قولہ وکرہ امامۃ الفاسق اھ قال الطحطاوی افاد الحموی ان کراھۃ الاقتداء بالعبد وما عطف علیہ تنزیھیۃ ان وجد غیرھم والا فلا اھ وسیاتی ما یفید ان امامۃ الفاسق مکروھۃ تحریما اھ ص ۱۷۵) قال فی نور الایضاح وکرہ امامۃ الفاسق العالم[ف] لعدم اھتمامہ بالدین فتجب اھانتہ شرعا فلا یعظم بتقدیمہ للامامۃ (قال الطحطاوی قولہ فتجب الخ تبع فیہ الزیلعی ومفادہ کون الکراھۃ فی الفاسق تحریمیۃ اھ) واذا تعذر منعہ ینتقل عنہ الی غیر مسجدہ للجمعۃ وغیرھا وان لم یقم

[ف] قلت فامامۃ الفاسق الجاھل بالاولی لوجود السببین للمنع فیہ ۱۲ منہ

الجمعۃ الا ھو تصلی معہ اھ قال الطحطاوی وفی السراج ھل الافضل ان یصلی خلف ھؤلاء ام الانفراد قیل اما فی الفاسق فالصلوٰۃ خلفہ اولی وھذا انما یظھر علی ان امامتہ مکروھۃ تنزیھا اما علی القول بکراھۃ التحریم فلا واما الاخرون فیمکن ان یقال الانفراد اولی لجھلھم بشروط الصلوٰۃ ویمکن اجراءھم علی قیاس الصلوٰۃ خلف الفاسق وجزم فی البحر بان الاقتداء بھم افضل من الانفراد اھ (ص ۱۷۶) قلت بشرط ان لایکون الامام لحانا یفسد الصلوٰۃ بلحنہ والا فالانفراد اولی بل ھو المتعین اذ لم یجد اماما غیرہ ، واللہ اعلم،

تنبیہ: چونکہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ ہونے میں دو قول ہیں، ایک قول میں کراہت تنزیہی ہے دوسرے تحریمی ہے، اس لئے اس میں شر و فساد نہ بڑھانا چاہئے، اگر سہولت کے ساتھ ایسے امام سے علیحدگی ممکن ہو تو خیر ورنہ اگر فتنہ یا عداوت کا اندیشہ ہو تو اسی کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، دوسرے امام کی طرف منتقل ہونے کی سعی نہ کریں، البتہ اگر امام فاسق ہونے کے ساتھ جاہل بھی ہو اور قرآن بھی غلط سلط پڑھتا ہو جس سے فسادِ نماز کا احتمال قوی ہو تو پھر اس کے پیچھے نماز نہ پڑھنا چاہئے، واللہ اعلم، ۱۶ ررمضان ۴۲ھ

نابالغ بچے کے پیچھے تراویح کا حکم اور اس سلسلہ میں ایک حدیث کا جواب

سوال (۱۰) .... ایک لڑکا نابالغ حافظِ قرآن تراویح میں قرآن سنا دے، اور پیش امام مقرر شدہ الم ترکیف سے پڑھانے والا حاضر ہے تو آیا امام مقرر شدہ کی حاضری میں لڑکے نابالغ حافظ کے پیچھے اقتدا بالغ مقتدیوں کی جائز ہے یا نہیں، حالانکہ پیش امام مقرر شدہ کی ناراضگی بھی نہ ہو، اور نابالغ لڑکے کے پیچھے قرآن سنانے کی حالت میں تراویح بہتر ہے یا کہ پیش امام مقرر شدہ کے پیچھے الم ترکیف سے بہتر ہے، مفصل جواب آنا چاہئے؛ بالغ حافظ نہ ہونے کی وجہ سے ضرورۃً بھی نابالغ حافظ کے پیچھے تراویح جائز ہے یا نہیں، ایک مولوی صاحب نے فتویٰ دیا ہے اور حدیث شریف کا حوالہ دیا ہے، وہ پرچہ بھی ہمراہ اس سوال کے ہے، آیا یہ حدیث اس موقع پر ہے یا کہ اور موقع پر، اس کا خلاصہ فرما کر ارسال فرما دیں،

(نقلِ فتویٰ) نابالغ لڑکے کے پیچھے تراویح ہوتی ہے، جیسے حدیث محمد بن مقاتل

سے واضح ہوتا ہے، حدیث ھکذا ان امامۃ الصبی فی التراویح تجوز لان الحسن بن علی رضی اللہ عنہما کان یؤم عائشۃ رضی اللہ عنہا وکان صبیا حدیث کو ترجیح ہوتی ہے فقہ پر، اگر نفل نابالغ کے پیچھے ضعیف ہوتی تو عائشہ رض حضرت حسن بن علی رض کے پیچھے کیوں تراویح پڑھتیں، باقی غایۃ الاوطار والے کو حدیث مذکور نہیں ملی، اگر ملتی تو اختلاف بیان نہ کرتا، قاعدہ بناء قوی علی الضعیف یہاں پر معتبر نہیں، دیکھو تراویح میں اگر پیش امام باوجود قدرت کھڑے ہونے کے بیٹھا ہوا اور مقتدی کھڑے ہوں تو ثواب تراویح میں کچھ فرق نہیں آتا، حالانکہ بناء قوی علی الضعیف پائی جاتی ہے، قاعد کا ثواب نصف ہی قائم ہے،

الجواب: نابالغ کی اقتدا، نہ فرض میں جائز ہے نہ نفل میں، نہ تراویح میں، پس مقتدیوں کو لازم ہے کہ جب بالغ حافظ نہ ہو تو الم ترکیف ہی سے تراویح کسی ناظرہ خواں بالغ کے پیچھے پڑھ لیں نابالغ حافظ کے پیچھے نہ پڑھیں، ہذا ہو الصحیح المفتی بہ وما جوزہ مشایخ بلخ ضعیف لا یلتفت الیہ واللہ اعلم، اور ایک جواب جو دوسرے پرچہ پر لکھا ہوا ہے، جس میں حدیث محمد بن قاتل سے نابالغ کی امامت کو جائز کیا گیا ہے تو اس کے متعلق یہ سوال ہے کہ یہ حدیث محمد بن مقاتل کس کتاب میں ہے اور اس کی سند کیسی ہے، جب تک سند حدیث معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک یہ قابل احتجاج نہیں، اور امامت نابالغ کی ممانعت نصوص صریحہ سے ثابت ہے، قال صلی اللہ علیہ وسلم الامام ضامن والمؤذن مؤتمن اخرجہ البزار ورجالہ موثقون واخرجہ الطبرانی الامام ضامن فما صنع فاصنعوا واسنادہ حسن (اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۳۴) وظاہر ان الضامن لابد ان یکون اقوی من المضمون لہ وقال صلی اللہ علیہ وسلم ولیؤمکما اکبرکما اخرجہ الشیخان وعن ابن مسعود قال لا یؤم الغلام حتی تجب علیہ الحدود وعن ابن عباس قال لا یؤم الغلام حتی یحتلم رواہما الاثرم فی سننہ کذا فی النیل (ص ۴۳ ج ۳) والاثران لیسا بانزل من الحسن والا لما سکت عنہما الشوکانی واللہ اعلم، پس ان نصوص کے ہوتے ہوئے نابالغ کی امامت جائز نہیں ہو سکتی، ۱۹ رمضان ۴۲ھ

تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنے یا نہ پڑھنے میں امام عاصم کی تقلید کی جائے یا امام ابو حنیفہ رح کی؟	**سوال (۱۱۱)** .... نماز تراویح میں بسم اللہ شریف امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک سراً یا جہراً ہر سورۃ

کے شروع میں پڑھنا جائز ہے یا ناجائز، یا تمام قرآن شریف میں امام موصوف کے نزدیک صرف ایک ہی مرتبہ پڑھنا سراً یا جہراً کافی ہے، پھر ان میں کونسا عمل امام موصوف کے نزدیک اَولیٰ ہے، اور نماز تراویح میں قاری کو کس امام یا راوی کی تقلید ضروری ہے، اور اگر نماز تراویح میں قرآن کے اندر قاری امام ابوحنیفہ صاحبؒ کی تقلید کرے تو شبہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن تو پڑھا جاتا ہے راوی حفصؒ کی روایت میں پھر امام موصوف کی تقلید کس طرح کرے گا، اور کیونکہ امام صاحبؒ کی تقلید کے موافق یعنی ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ شریف نہ پڑھی جائے تو حفصؒ کی روایت کے مطابق قرآن مجید پورا نہیں ہوتا، کیونکہ بسم اللہ شریف کو آپ نے ہر سورۃ کا جزء فرمایا ہے، لہذا نماز تراویح میں قاری کو ان میں سے کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور کس کی تقلید ضروری ہوگی؟ بینوا توجروا،

الجواب: امام عاصم یا حفص کی تقلید صرف قرآن کی تلاوت اور وجوہ قرأت میں کی جاتی ہے، باقی احکام صلوٰۃ میں ان کی تقلید نہ ہوگی، بلکہ اس میں فقہاء کی تقلید ہوگی، سو ابوحنیفہؒ کے نزدیک بسم اللہ صرف ایک مرتبہ پڑھنا ختم قرآن کے لئے ضروری ہے اگر ایک دفعہ کسی سورۃ پر بسم اللہ پڑھ دی گئی تو قرآن پورا ہوگیا، اور بہتر یہ ہے کہ ایک دفعہ تراویح میں اس آیت کو جہراً پڑھا جائے، جیسا کہ تراویح میں سارا قرآن جہر سے پڑھا جاتا ہے، اگر امام کسی جگہ بھی بسم اللہ کو جہر سے نہ پڑھے، بلکہ کسی ایک جگہ سراً پڑھ لے تو امام کا ختم تو پورا ہوجائے گا، لیکن سامعین کے ختم میں ایک آیت کی کمی رہے گی، باقی سب سورتوں کے اول میں بسم اللہ کو جہر سے پڑھنا امام صاحبؒ کے نزدیک مکروہ ہے، اور ہر سورۃ کے اول میں سراً پڑھنا جائز ہے، بلکہ اگر مقتدیوں پر تطویل کا خوف نہ ہو تو مستحب ہے، واللہ اعلم، ۲ رجمادی الاُولیٰ ۴۵ھ

سوال (۱۲) .... تراویح کے ترویحہ میں تمام جماعت کو چائے وغیرہ پلوانا خلاف سنت و بدعت ہے

.... یہاں کے پیش امام نماز تراویح میں چار رکعت و دس رکعت کے بعد تمام جماعت کو مع امام مسجد کے برآمدے میں بلا کر چائے پلواتے ہیں، اور جب ان کو کہا گیا کہ یہ فعل اچھا نہیں ہے تو یہ جواب دیتے ہیں کہ مکہ شریف اور مدینہ شریف میں ایسا ہی ہوتا ہے، اور کتاب شامی اور درمختار میں یہ مسئلہ موجود ہے، علمائے کرام سے ہم مسلمانوں کی التجا ہے کہ اگر یہ فعل واقعی جائز ہے تو بھی اور اگر ناجائز

ہو تو بھی مع سند و مہر کے فی سبیل اللہ لکھ کر روانہ فرماویں نماز تراویح سے چھوٹی چھوٹی سورۃ سے پڑھی جاتی تھی،

الجواب؛ قال فی الدر یجلس ندبًا بین کل اربعۃ (الاوضح قول الکنز بعد کل اربعۃ ۱۲ ش) بقدرھا وکذا بین الخامسۃ والوتر (والاستراحۃ علی خمس تسلیمات اختلف المشایخ فیہ واکثرھم علی انہ لایستحب وھو الصحیح اھ مرادہ بخمس تسلیمات خمس اشفاع ای علی الرکعۃ العاشرۃ کما فسر بہ فی شرح المنیۃ ۱۲ ش) ویخیرون بین تسبیح وقراءۃ وسکوت وصلوٰۃ فرادیٰ (وفی النھر واما الصلوٰۃ فقیل مکروھۃ وقیل سنۃ وھو ظاھر مافی السراج واھل مکۃ یطوفون واھل المدینۃ یصلون اربعا اھ ۱۲ ش) ص ۳۸ ، و ۳۹ ج ۱۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ چار رکعت کے بعد تراویح میں قدرے استراحت وانتظار مستحب ہے، جس میں تسبیح وقراءت وسکوت کا اختیار دیا گیا ہے، اور بعض نے منفرداً نماز پڑھنے کی بھی اجازت دی ہے، اور بعض نے اس سے منع کیا ہے، لیکن کھانے پینے کا اختیار کسی نے نہیں دیا، اس لئے اکل وشرب کو اس جلسہ میں معمول قرار دے لینا یقیناً بدعت ہے، ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ کسی نمازی کو پیاس لگے تو وہ بوقت جلسہ پانی پی لے یا کوئی شخص کبھی ضرورت کی وجہ سے چائے پی لے، لیکن اس جلسہ کو چاء نوشی کا جلسہ قرار دے لینا کہ سب نمازی مع امام کے چاء نوشی میں مشغول ہو جائیں، خلاف سنت اور طریقۂ بدعت ہے، اور اہل مکہ ومدینہ کا فعل زمانۂ خیریت میں تو بوقت جلسہ ترویحہ طواف وصلوٰۃ تھا، اگر اس زمانۂ شر میں یہ معمول بدل گیا ہو تو ہمیں اس کا علم نہیں، اور نہ اُن کا یہ فعل حجت ہے، واللہ اعلم، ۲۲ رشوال ۴۴ھ

نماز تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد امام کس ہیئت سے بیٹھے ؟ ؛ ؛

سوال (۱۳) تراویح میں جبکہ ہر چار رکعت کے بعد آرام کے لئے بیٹھتے ہیں امام کو کس ہیئت سے بیٹھنا چاہئے، یعنی امام کو قبلہ رُخ بیٹھکر آرام لینا چاہئے، یا کہ فجر عصر کی فرض نماز کے بعد امام مقتدیوں کی طرف مُنہ کر کے بیٹھتا ہے اس ہیئت سے بیٹھنا چاہئے، سنت کے مطابق بہتر طریقہ ارشاد فرماویں،

الجواب؛ تراویح کے درمیان بیٹھنے کی کوئی خاص کیفیت منقول نہیں ہے، مگر فقہاء کے قول سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اگر امام کو تھوڑی دیر بیٹھنا ہو جتنی دیر بعد نماز کے دعاء کرتے ہیں عموماً ہوتی ہے تو اتنی دیر نمازیوں کی طرف پشت کر کے بیٹھنے کا مضائقہ نہیں،

اور اگر اس سے زیادہ دیر بیٹھنا ہو تو دائیں یا بائیں انحراف کر کے بیٹھنا چاہئے، واللہ اعلم
قال الحافظ ویحتمل ان قصر زمان ذلک ان یستمر مستقبلا للقبلة من اجل انها الیق بالدعاء ویحتمل الاول علی ما لوطال الذکر والدعاء، واللہ اعلم اھ
(ص ۲۷۸ ج ۲ فتح الباری) قلت وقواعدنا لا تاباہ فقط
الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۵ ذی القعدہ ۱۳۴۳ھ، عبد الکریم عفی عنہ مدرس مدرسہ

نمازِ تراویح میں دو دو رکعت افضل ہے یا چار چار رکعت،

سوال (۱۴) حضور نے بہشتی زیور کے دوسرے حصّہ میں تحریر فرمایا ہے کہ تراویح کی نماز اگر دو دو رکعت یا چار چار رکعت کی نیت باندھے دونوں طرح جائز ہے، لیکن کوئی عالم کہتا ہے کہ عرب سے عجم تک کوئی دیار میں نہیں دیکھا جاتا ہے، لہذا چار رکعت کی نیت ترک کر کے دو دو رکعت کی نیت کرنا افضل ہے اور چار رکعت کی نیت کرنا مکروہ کس کتاب میں اس کی دلیل ہے، اطلاع فرماویں ؟

الجواب: فی البدائع (ص ۲۸۹ ج ۱) ومنها رای من السنن، یصلی کل رکعتین بتسلیمة علیحدة ولو صلی ترویحة بتسلیمة واحدة وقعد فی الثانیة قدر التشهد لاشک انه یجوز علی اصل اصحابنا ان صلوات کثیرة تتادّی بتحریمة واحدة بناء علی ان التحریمة شرط ولیست برکن عندنا خلافا للشافعیؒ لکن اختلف المشایخ انه هل یجوز عن تسلیمتین اولا یجوز الا عن تسلیمة واحدة قال بعضهم لا یجوز الا عن تسلیمة واحدة لانه خالف سنته المتوارثة بترک التسلیمة والتحریمة والثناء والتعوّذ والتسمیة فلا یجوز الا عن تسلیمة واحدة وقال عامتهم انه یجوز عن تسلیمتین وهو الصحیح اھ،

وفی نور الایضاح وتنویر الابصار وهی عشرون رکعة بعشر تسلیمات و فی السراجیة کل ترویحة اربع رکعات بتسلیمتین وفی الوقایة والقدوری لکل ترویحة تسلیمتان وفی بحر الرائق (ص ۶۷ ج ۲ مثل ما فی البدائع .....
وفی البحر ایضا (ص ۵۴ ج ۲) وفی المحیط وانما اخترنا فی التراویح مثنی مثنی لانها تؤدّی بالجماعة واداؤها علی الناس مثنی مثنی اخف علیهم وفی .... فتح القدیر تحت قول الهدایة (ولهما الاعتبار بالتراویح) فان الاجماع علی الفصل فیها وفی العنایة تحت قول الهدایة (والتراویح

تؤدی بجماعۃ) جواب عن اعتبارھما بالتراویح فیراعی فیھا جھۃ التیسیر بالقطع بالتسلیم عن رأس الرکعتین لان ماکان ادوم تحریمۃ کان اشق علی الناس اھ فتح القدیر (ص ۳۹۲ ج ۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ تراویح میں دو دو رکعت پڑھنا سنت ہے، لیکن چار چار پڑھنا بھی بناء بر مذہب صحیح جائز ہے، گو خلاف متوارث ہونے کی وجہ سے مکروہ تنزیہی ہو، البتہ بحر الرائق و ہدایہ کی تعلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم یعنی دو دو کا افضل ہونا جماعت کے ساتھ خاص ہے، پس ممکن ہے کہ منفرد کے لئے اصل قاعدہ یعنی امام صاحبؒ کے نزدیک چار چار نوافل افضل ہونے کی بناء پر تراویح بھی چار چار افضل یا کم از کم مساوی ہوں (وفیہ ان الحکم لاینتفی بانتفاء التعلیل فابقاء الروایۃ علی العموم اولی للتوارث ویمکن ان یجاب بان التوارث ثابت فی الجماعۃ واما اذا صلّی منفرداً فلا دلیل علی توارثہ فافہم[عہ]) اور بہشتی زیور کی مخاطب مستورات ہیں، جو نماز تنہا پڑھتی ہیں، اس لئے بہشتی زیور پر شبہ نہ کیا جاوے، ونیز بہشتی زیور کی عبارت یہ ہے (چاہے دو دو رکعت کی نیت باندھے چاہے چار چار رکعت کی) اور اس میں یہ تصریح نہیں کہ دونوں فضل میں مساوی ہیں، بلکہ دونوں کے جواز پر بھی یہ عبارت محمول ہوسکتی ہے، فلا اشکال علیہ بای حال،

جماعتِ ثانیہ تراویح کی ایک صورت | **سوال** (۱۵) ہمارے یہاں رمضان المبارک کے شروع سے یہ طریقہ ہو رہا ہے کہ ایک قرآن شریف بعد نمازِ عشاء تراویح میں سنایا جارہا ہے، اور سامع جو کلام مجید سنتا ہے اپنی چار رکعت تراویح باقی رکھ لیتا ہے، یعنی امام کے ساتھ سولہ رکعت تراویح پڑھتا ہے، بقیہ چار رکعت تراویح اسی مسجد میں امام ہو کر جس میں ایک یا دو پارہ سُناتا ہے پوری کرتے ہیں، مقتدی کل تراویح بعد نمازِ عشاء ختم کرلیتے ہیں، جو مقتدی سننے کے شائق ہیں اُن کو گھر جاکر جگانے کا اہتمام بھی ہوتا ہے، جو قریب ۱۴، ۱۵ کے ہو جاتے ہیں، ان مقتدیوں میں بعض کی نیت نفل نماز کی اور بعض کی

[عہ] اشارۃ الی ان لقائل ان یقول ان اثبت امران اداء التراویح بالجماعۃ وادارہ مثنیٰ مثنیٰ ولا یتوقف سنیۃ احدھما علی الآخر ۱۲ منہ

تہجد کی ہوتی ہے، ایسی صورت میں یہ جماعت بلا کراہت جائز ہے یا نہیں، اگر نہیں تو اور کونسی صورت درست ہونے کی ہوسکتی ہے ؟

الجواب: جیساکہ وہ حافظ صاحب چار رکعت تراویح میں شامل نہیں ہوتے اسی طرح وہ مقتدی بھی چار رکعت میں شامل نہ ہوا کریں، اور پھر چار رکعت جماعت سے پڑھ لیں، کما ہو الظاہر، لیکن احتیاطاً جگہ بدل دیں، یعنی جہاں پہلی جماعت ہوئی تھی اس جگہ سے الگ پڑھ لیں، کما سیأتی، اور پھر اس تراویح کی جماعت میں کچھ مقتدی نفل پڑھنے والے بھی شامل ہوجائیں، تو مضائقہ نہیں، لانہ اقتداء المتطوع بمن یصلی السنۃ وانہ جائز الخ۔ بدائع ص۲۰۹ ج۱)

کیا ایک مسجد میں دو مرتبہ تراویح کی جماعت مکروہ ہے؟

سوال (۱۶) ایک مسجد میں دو مرتبہ تراویح کی جماعت مکروہ ہے ؟

الجواب: تراویح کے تکرار فی المسجد کے متعلق کوئی جزئیہ نہیں ملا، دوسری جگہ تحقیق کرلیا جاوے، محض رکن الدین پر اعتماد نہ کیا جاوے، البتہ مزید احتیاط کی بناء پر جگہ بدل لیا کریں، تاکہ تکرار مکروہ ہونے کی صورت میں بھی کراہت مرتفع ہوجاوے، اور باوجود تبدیل ہیئت تکرار جماعت فرض تو مکروہ ہے، لیکن تراویح میں بناء بر قول ابو یوسفؒ تبدل ہیئت سے تکرار مکروہ نہ رہے گا، عن ابی یوسفؒ انہ اذا لم تکن الجماعۃ علی الھیئۃ الاولی لا تکرہ والا تکرہ وھو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الھیئۃ کذا فی البزازیۃ اھ (شامی ص۵۷۸ ج۱) اور امام ابو یوسفؒ کا قول مذکور گو عام ہے، لیکن فرائض میں اس پر فتویٰ نہیں دیا جاتا، اور تراویح میں فرائض سے توسع ہے اس لئے تراویح میں اس پر عمل کی گنجائش ہے، اور یہ کلام اس تکرار میں ہے جو امام آخر اور مقتدین آخرین کے ساتھ ہو، اور اگر پہلا امام اور پہلے مقتدی ہی تکرار کریں تو وہ مطلقاً مکروہ ہے، خواہ مسجد میں ہو یا غیر مسجد میں، ہو صرح بہ فی البدائع ص۲۰۹ ج۱ عبدالکریم عفی عنہ، ۸ رمضان ۵۱ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ

بہشتی گوہر کے ایک مسئلہ متعلق تقدیم وتر علی التراویح پر شبہ کا جواب۔

سوال (۱۷) بہشتی گوہر، ص ۳۹ میں تراویح کا بیان مطالعہ کررہا تھا، وقت تراویح کے متعلق یہ عبارت دیکھی گئی کہ وتر کا بعد تراویح کے پڑھنا بہتر ہے، اگر پہلے پڑھ لے تب بھی درست ہے (مراقی الفلاح ص۲۴۰) اس سے مجھے شبہ پیدا ہوا، اس لئے کہ میرے علم میں اس کے برعکس ہے، یعنی وتر کا پہلے تراویح سے پڑھنا بہتر ہے، اگر بعد کو پڑھے تب بھی درست ہے، لیکن چونکہ حوالہ موجود تھا، خیال ہوا ممکن ہے کہ میری ہی معلومات غلط ہوں، دفع شبہ کے لئے مراقی الفلاح

نکالی گئی اس میں یہ عبارت ملی ہے کہ (وقتھا) ما بعد صلوٰۃ العشاء (علی الصحیح الی طلوع الفجر (و) لتبیعتھا للعشاء (یصح تقدیم الوتر علی التراویح وتاخیرہ عنھا) وھو افضل الخ پھر حاشیۂ طحطاوی میں لکھتے ہیں کہ (قولہ ویصح تقدیم الوتر علی التراویح الخ) وقیل وقتھا بعد العشاء وقبل الوتر وبہ قال عامۃ مشائخ بخاریٰ،

اس سے میری معلومات کی تائید ہوتی ہے، تاہم چونکہ میں ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں کہ ارجاع ضمیر میں غلطی ہو، بنابریں آپ سے درخواست ہے کہ مراقی الفلاح کی عبارت کا وہی مطلب ہے جو بہشتی گوہر میں مندرج ہے، یا نہیں، اگر نہیں تو معلوم کروں گا کہ یہ کاتب ہی کی غلطی ہے، صحیح کرلیا جائے گا، انشاء اللہ، اور اگر بہشتی گوہر کی عبارت کی تائید کرتا ہو، تو میں اپنے کو اس شبہ سے بچالوں گا،

الجواب، بہشتی گوہر کا مسئلہ درست ہے، مراقی الفلاح میں وھو افضل کا مرجع تاخیرہ عنھا ہے، اور طحطاوی میں قول مشائخ بخاریٰ بعد العشاء وقبل الوتر کو قیل سے تعبیر کرنا خود اس کے ضعف کی علامت ہے، فافہم، ۲۷ رجب ۴۶ھ

جماعت ثانیہ تراویح کی ایک صورت کا حکم

سوال (۱۷) یہاں پر تین چار سال سے متواتر رمضان شریف میں بعد نصف شب کے اس طرح سے قرآن شریف پڑھا جاتا ہے کہ امام جو بعد نصف شب کے قرآن شریف سُناتا ہے، اول شب کی تراویح میں بجائے بیس رکعت کے ۱۶ رکعت پڑھتا ہے، چار رکعت تراویح میں بعد نصف شب قرآن شریف سناتا ہے، لیکن کُل مقتدی تہجد کی نیت باندھتے ہیں، جن کی تعداد دس پندرہ کے قریب ہوتی ہے، اور ان میں سے بعض بعض کو بلانا اور جگانا بھی پڑتا ہے، کیونکہ اس جماعت میں جواز کی صورت تھی، اس لئے یہ عمل دوسرے قرآن شریف کا ثواب حاصل کرنیکے واسطے کیا جاتا تھا، کیونکہ تنہا پڑھا نہیں جاتا، اگر ایسا نہ کیا تو اس ثواب سے محروم رہیں گے، لیکن اس کے ساتھ حسب ذیل مفسدات بھی نظر آتے ہیں، یہ جماعت اس نام سے موسوم ہے، کہ (تہجد میں قرآن شریف ہوتا ہے) دوسری مسجد والوں نے ہماری جماعت دیکھ کر تہجد کی نوافل میں جماعت شروع کردی، جو مکروہ تحریمی ہے، یہ غلط فہمی جماعت مذکورۂ بالا کی وجہ سے ہوئی، دوم ایک ہی مسجد میں ایک پوری جماعت تراویح کی ہو کر دوسری جماعت تراویح کی ہوئی، اور مقتدیوں میں کوئی تراویح پڑھنے والا نہیں ہوتا جو امور مختلف فیہ میں سے ہے،

سوئم جو مقتدی اخیر شب کو قرآن شریف سنتے ہیں، اور رات کو زیادہ جاگنے کے عادی نہیں ہیں ان کو جگایا جاتا ہے، بعض کی صبح کی نماز یا صرف جماعت جاتی رہتی ہے، ممکن ہے اس جماعت کی وجہ سے صبح کی نماز یا جماعت فوت ہوئی ہو، چہارم قصداً بیس رکعت ایک ساتھ نہیں پڑھی بلکہ سولہ رکعت اور چار رکعت کے درمیان وقفہ دیا گیا، پنجم جہاں تک خیال ہے سلف میں بھی ایسا عمل نہ ہوا ہوگا، ایسی صورتوں کا خیال کرتے ہوئے کہ مفسدات بھی نظر آتے ہیں اور پابندی کے ساتھ کئی سال سے جماعت ہو رہی ہے، جناب والا سے گذارش ہے کہ جناب ایسی جماعت کے واسطے اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: قال الطحطاوی فی حاشیته علی مراقی الفلاح وکره ان یؤم فی التراویح مرتین فی لیلة واحدة وعلیه الفتوی لان السنة لا تتکرر فی الوقت الواحد فتقع الثانیة نفلاً مضمرات بخلاف ما لو صلاها ماموما مرتین حیث لا یکره کما لو ام فیها ثم اقتدی بآخر فی تلك الصلوة وکما لو صلی العشاء اماما او مقتدیا ثم اقیمت ثانیاً فانه لا یکره له ان یدخل فیها ثانیا بل یستحب له اھ (ص ۲۳۹) یہ صورت عمل فی نفسہ تو جائز تھی، جیسا کہ عبارتِ مذکورہ سے معلوم ہوا، مگر ان مفاسد کے انضمام سے جو سوال میں ہیں کہ عوام اس کو جماعتِ تراویح نہیں بلکہ جماعتِ تہجد سمجھتے ہیں اور دوسرے لوگوں نے اس کو دیکھ کر جماعت نوافل محضہ بھی شروع کر دی، یہ قابلِ ترک بلکہ واجب الترک ہے، فان المباح والمستحب اذا ادی الی مفسدة یجب ترکہ صرح به الفقهاء قاطبة، واللہ اعلم، غرہ رمضان ۴۵ھ

تراویح کی بیس رکعت ہونے کے دلائل | **سوال** (۱۹) رمضان کی بیس تراویح کی اصل حدیث سے تحریر فرمائیں، اور ایک حدیث سے نہیں بلکہ کئی ایک حدیثیں تحریر فرماویں، کیونکہ اس جگہ پر آٹھ تراویح پڑھی جاتی ہیں، ان کو بیس تراویح کا ثبوت اور یقین دلانا بھی ضروری ہے اور اس کے اندر اور بات خیال نہ فرماویں،

الجواب: [1] عن یزید بن حفیفه عن السائب بن یزید رض قال کانوا یقومون علی عهد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه فی شهر رمضان بعشرین رکعة، رواه البیهقی واسناده صحیح، و[2] عن یزید بن رومان انه قال کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعة رواه النسائی رواه

مالك واسناده مرسل قوی، وعن[۳] عبد العزیز بن رفیع قال کان ابی بن کعب یصلی بالناس فی رمضان بالمدینۃ عشرین رکعۃ ویوتر بثلث اخرجہ ابو بکر بن ابی شیبۃ فی مصنفہ واسنادہ مرسل قوی اھ من آثار السنن للنیموی ص ۵۵ ج ۲، ان سب احادیث سے تراویح کی بیس[۲] رکعات کا ثبوت ظاہر ہے اور آثار السنن میں ان کے علاوہ اور بھی بہت احادیث مذکور ہیں، اور اگران احادیث میں حضور کا عمل مذکور نہیں بلکہ صحابہ کا عمل مذکور ہے، مگر ظاہر ہے کہ حضرات صحابہؓ اپنے عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے متبع تھے، پس ان کا ایسا عمل جس پر بعد میں سب نے اتفاق کرلیا ہو یقیناً حجت ہے، اور اس کی دلیل یہی ہے کہ ان کے پاس اس عمل کی کوئی دلیل ضرور موجود تھی، قال ابن قدامۃ فی المغنی ولنا ان عمرؓ لما جمع الناس علی ابی ابن کعب کان یصلی لهم عشرین رکعۃ وعن علی انہ امر رجلاً یصلی بهم فی رمضان عشرین رکعۃ وهذا کالاجماع الی ان قال ما فعلہ عمر واجمع علیہ الصحابۃ فی عصرہ اولی بالاتباع اھ (ص ۸۰۳ ج ۱)

پس ان آثار موقوفہ سے اس حدیث مرفوع کی تقویت ہوگئی جس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے، حدثنا یزید بن هارون قال انا ابراهیم بن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباسؓ ان رسول الله صلی الله علیہ وسلم کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر اھ (من آثار السنن ص ۵۶ ج ۲) وابراهیم بن عثمان جد الامام ابی بکر بن ابی شیبۃ ضعیفٌ، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بہ نفسِ نفیس بیس[۲] رکعت پڑھنا معلوم ہوا، مگر اس میں صرف ایک راوی ضعیف ہے جس کا ضعف آثار قویہ مذکورۂ سابقہ سے منجبر ہوگیا، واللہ اعلم، ۲۲ رمضان شریف ۴۵ھ

المفاتیح لابواب التراویح
بجواب اشتہار
التحقیق فی اعداد التراویح

سوال (۲۰) بعد الحمد والصلوٰۃ، غیر مقلدین کی طرف سے ایک اشتہار[۱] شائع ہوا ہے، جس میں تراویح کی گیارہ[۱] رکعت کے سنت ہونے پر زور دیا گیا ہے، اور بیس[۲] رکعات کی سنیت سے انکار کیا گیا ہے، اور ستم ظریفی دیکھو کہ حاشیہ اشتہار میں حنفیہ کو

۱ے اشتہار کا عنوان "التحقیق فی اعداد التراویح" تھا، اور مشتہر کا نام حافظ محمد عمر ٹھیکہ دار لوہا منڈی اکبر آباد لکھا ہوا تھا، یہ بوالعجبی دیکھئے کہ ٹھیکہ دار بھی مجتہد بننے کا دعویٰ کرتے ہیں، کیونکہ حدیث سے ایک مسئلہ کو ثابت کرنا اور دوسرے عالموں کے مسئلہ کو رد کرنا مجتہد ہی کا تو کام ہے ۱۲ منہ

اعلان دیا ہے کہ" جو کوئی حدیث صحیح جو اپنے معنی میں صریح ہو پیش کر دے اس کو دس روپیہ انعام فی حدیث دیا جائے گا"

اس کے **جواب** میں مجھے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ پہلے جماعت غیر مقلدین "حدیث صحیح" کی تعریف کسی حدیث ہی سے بیان کر دیں، اور حدیثِ رسول ؐ ہی سے یہ ثابت کریں کہ حدیث حسن اور ضعیف ومرسل ومعضل ومعلل وشاذ ومنکر ومدلس وغیرہ کی یہ تعریف ہے، اور ان میں سے فلاں قابلِ قبول ہے اور فلاں قابلِ قبول نہیں، بلکہ قابلِ رد ہے، تو ہم اُن کو فی حدیث مرفوع بجائے دس کے دہ چند دینے کو تیار ہیں، اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قولِ صریح سے ان امور کو ثابت نہ کر سکیں تو پھر وہ ہم کو بتلائیں کہ "حدیث صحیح" کے معنی جو کچھ بھی اُن کے نزدیک ہیں انھوں نے کہاں سے اخذ کئے، کتاب اللہ اور سنتِ رسول ؐ سے تو یقیناً ماخوذ نہیں، پھر کہیں قیاس واجماع سے تو ماخوذ نہیں، جس سے غیر مقلدین کوسوں دُور بھاگتے ہیں، اگر قیاس واجماع سے ماخوذ ہے تو براہ کرم یہ بھی بتلادیں کہ قیاس واجماع صحابہ کا ہے یا تابعین کا، اور تابعین میں سے فقہاء کا ہے یا محدثین کا یا دونوں کا، اور یہ کہ فقہاء یا محدثین کا قیاس واجماع غیر مقلدوں کے نزدیک اس بارے میں حجت کیونکر ہو گیا، جن کے یہاں تقلیدِ علماء شرک ہے، کیا براہِ عنایت وہ کسی آیت یا حدیث سے یہ ثابت کریں گے کہ حدیث کی تعریف وتصحیح وتضعیف وغیرہ میں فقہاء یا محدثین کا قیاس واجماع حجت ہے، اور اس کی تقلید حنفیہ اور غیر مقلدین سب پر فرض ہے، اور باقی مسائل میں تقلید حرام اور شرک ہے، جب تک جماعت غیر مقلدین ان سب مسائل کو حدیث ہی سے ثابت نہ کر دیں اُس وقت تک اُن کو کسی مسئلہ میں نہ خود حدیث صحیح پیش کرنے کا حق ہے نہ حنفیہ سے مطالبہ کا حق ہے، کیوں کہ جو حدیث وہ پیش کریں گے ہم کو ان سے اس سوال کا حق ہے کہ اس حدیث کا صحیح ہونا... کتاب اللہ سے معلوم ہوا یا سنتِ رسول ؐ سے یا قیاس سے یا اجماع سے، الی آخر السوالات التی ذکرناہا،

نیز ہم کو یہ بھی سوال کرنے کا حق ہے کہ اس کی کیا وجہ کہ قبولِ حدیث وردِ حدیث میں بخاری ومسلم وترمذی واحمد وغیرہ کی تقلید تو حجت اور واجب یا جائز ہو، اور فہم معانی حدیث میں ابو حنیفہ ومالک وشافعی رحمہم اللہ کی تقلید ناجائز وحرام ہو، کما ہو زعم الطائفۃ

الغیر المقلدین،

اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ غیر مقلد مشتہر نے جس قدر حدیثیں اپنے اشتہار میں گیارہ رکعت تراویح کے متعلق درج کی ہیں، اور ان کی صحت کا دعویٰ کیا ہے اس نے اپنے اس دعوے کی صحت پر کوئی دلیل کتاب اللہ یا سنتِ رسول اللہؐ سے قائم نہیں کی، پھر وہ کیونکر ان کو صحیح کہتا اور اُن کے تسلیم کو ہم پر لازم بتاتا ہے، اور اگر اقوالِ علماء سے اُن کی صحت ثابت کرنے کا مدعی ہے، تو وہ اُن علماء کا نام لے جنھوں نے اُن کو صحیح کہا ہے، اور بتلائے کہ اس معاملہ میں وہ ان کی تقلید کیوں کرنے لگا، نیز ہم کو ان کی تقلید پر کس دلیل سے مجبور کر سکتا ہے۔
اب میں اس کی پیش کردہ احادیث کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں، اس نے سب سے پہلے بخاری و مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہ رضؓ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان و غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے اھ

اس کا جواب یہ ہے کہ غیر مقلد کو صلوٰۃ اللیل کی کیفیت و کمیت کے متعلق حضرت عائشہ رضؓ کی تمام روایات کو دیکھنا چاہئے تھا، جو بخاری و مسلم و سننِ اربعہ میں مذکور ہیں، اگر وہ سب روایتوں کو دیکھ لیتا تو ہرگز اس کو دلیل میں پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا، کیونکہ حضرت عائشہ رضؓ سے کسی روایت میں تو یہ منقول ہے کہ آپ گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے، نہ رمضان میں نہ رمضان کے علاوہ، اور بعض روایات میں بخاری کی یہ ہے کہ آپ تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے، اور بعض روایاتِ مسلم میں یہ ہے کہ آپ وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر بھی پڑھتے تھے، تو کُل مقدار رکعات پندرہ ہوئیں، اور بعض روایات سے سترہ رکعتوں کا ثبوت ہوتا ہے، اسی لئے امام قرطبی شارح مسلم نے فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کی روایات میں بہت سے اہلِ علم کو اشکال و خلجان ہے، حتیٰ کہ بعض علماء نے ان کی حدیث کو مضطرب کہا ہے، دیکھو فتح الباری (ص ۱۷، ج ۳) قال القرطبی اشکلت روایات عائشۃ علیٰ کثیر من اھل العلم حتی نسب بعضھم حدیثھا الی الاضطراب اھ

اور جس نے اصولِ حدیث پڑھا ہے، وہ جانتا ہے کہ حدیثِ مضطرب سے استدلال و احتجاج صحیح نہیں، جب تک اضطراب رفع نہ ہو، پس اوّل غیر مقلد مشتہر اس حدیث کے اضطراب کو رفع کرے، اس کے بعد اس سے احتجاج کرے اور اضطراب کو رفع کرتے ہوئے یہ بھی سوچ لے کہ حنفیہ پر اس کی بیان کردہ تاویل و تقریر حجت نہ ہوگی، ممکن ہے

کہ وہ کسی دوسری تقریر سے اضطراب کو رفع کریں، نیز یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ حضرت عائشہ رضؓ کی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں اور دنوں سے زیادہ عبادت کرتے تھے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ ہی رکعتیں پڑھتے ہوں، اور یہ احادیث ہم آئندہ بیان کریں گے،

اس کے بعد اس نے صحیح ابن خزیمہ وابن حبان کے حوالہ سے حضرت جابر رضؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو رمضان میں آٹھ رکعت نماز اور وتر پڑھائی اھ" اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے غیر مقلد کو شرمانا چاہئے، کیونکہ ابتک لوگ تراویح کی جماعت کو سنتِ نبویہ نہ کہتے تھے، بلکہ الگ الگ تراویح پڑھنے کو سنتِ نبویہ اور جماعتِ تراویح کو سنتِ عمر یہ کہتے تھے، اب وہ وقت آگیا کہ غیر مقلدین بھی جماعتِ تراویح کو سنتِ نبویہ ماننے لگے، صرف عدد میں اختلاف رہ گیا، سو انشاء اللہ کچھ دنوں میں یہ اختلاف بھی رفع ہو جائے گا،

اب سنئے کہ اس حدیث سے غیر مقلد نے بیس رکعت تراویح کی نفی پر استدلال کیا ہے، حالانکہ اس سے بیس کی نفی کسی طرح بھی نہیں ہوئی، کیونکہ ایک عدد کا ثبوت دوسرے کی نفی کو مستلزم نہیں، البتہ اگر غیر مقلد اس بات کو ثابت کر دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی ہر رات میں تراویح کی جماعت کا اہتمام کرتے تھے، اور صحابہ کو عام طور پر اس کی اطلاع تھی، اور حضرت جابر رضؓ تراویح کی جماعت میں شروع سے آخر تک شریک تھے، تو بیشک اس سے بیس رکعت کی نفی ہو جائے گی، ورنہ یہ احتمال باقی رہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ تراویح آٹھ رکعت سے زیادہ پڑھی ہوگی، اور صحابہ کو بوجہ خوف فرضیت کے جمع نہیں کیا، اور اس لئے عام طور پر سب کو اطلاع نہیں کی، پھر کیفما اتفق جس کو جس وقت خبر ملی آکر شریک ہو گیا، منجملہ ان کے حضرت جابرؓ بھی تھے جن کو آٹھ رکعت ملی، اور اس احتمال کی تائید حضرت عائشہ رضؓ کی اُس حدیث سے ہوتی ہے جو بخاری (صفحہ ۱۵۲ ج ۱) میں مذکور ہے، ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صلی ذات لیلۃ فی المسجد فصلی بصلوتہ ناس ثم صلی القابلۃ فکثر الناس ثم اجتمعوا من الثالثۃ فلم یخرج الیھم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وقال لم یمنعنی من الخروج الیکم الا انی خشیت ان یفرض علیکم الحدیث

اس کے بعد غیر مقلد مشتہر نے امام محمد مروزی کے قیام اللیل سے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث بلاسند نقل کی ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ صحابی رمضان میں آپؐ کے پاس آئے اور کہا یارسول اللہ آج رات مجھ سے کچھ ہوگیا ہے، فرمایا بیان کرو، کہا میرے محلہ کی عورتوں نے کہا کہ ہم قرآن نہیں پڑھ سکتے ہیں، ہم تمھارے پیچھے نماز پڑھیں گے، تو میں نے ان کو آٹھ رکعت نماز پڑھائی، اور وتر پڑھائے، آپؐ سنکر خاموش ہوگئے،، الخ

اس کے متعلق عرض ہے کہ غیر مقلد نے اس حدیث کی سند نقل نہیں کی، اور نہ کسی امام کے قول سے اس کی تصحیح بیان کی، اور بدون اس کے اس کو استدلال کا کیا حق ہے، افسوس! غیر مقلد ہم سے تو حدیث صحیح ونص صریح کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود مطلق العنان ہو کر احادیث نقل کرتے ہیں، گویا حدیث کے صحیح کرنے کی باگ اُن کے ہاتھ میں ہے کہ جس کو چاہیں گے صحیح کردیں گے، پس اوّل غیر مقلد اس حدیث کی صحت ثابت کرے، اور اس کے بعد یہ بتلائے کہ اس سے بیس۲۰ کی نفی کیونکر ہوئی، کیا یہ احتمال نہیں کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے بارہ رکعت تراویح حضورؐ کے پیچھے مسجد میں یا تنہا پڑھ لی ہوں، اس کے بعد گھر پہونچے اور عورتوں کے اصرار پر آٹھ رکعت اُن کو پڑھادی ہوں؟

اس کے بعد مشتہر نے مؤطا امام مالکؒ ومصنف ابن ابی شیبہؒ وسنن سعید بن منصورؒ سے سائب بن یزید کا یہ اثر بیان کیا ہے کہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب وتمیم داری رضی اللہ عنہما کو فرمایا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھایا کریں الخ

سو مشتہر کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ اثر صحیح نہیں ہے، گو راوی سب ثقہ ہیں، مگر یہ مضطرب المتن ہے، محمد بن یوسف راوی پر اس میں اختلاف ہوا ہے، مالکؒ اور یحیٰ قطان اور عبدالعزیز بن محمد نے محمد بن یوسف سے گیارہ رکعت روایت کی ہیں، اور قیام اللیل مروزی میں محمد بن اسحٰق نے محمد بن یوسف سے تیرہ رکعت روایت کی ہیں، اور مصنف عبدالرزاق میں داؤد بن قیس وغیرہ نے انہی محمد بن یوسف کے واسطہ سے سائب بن یزید سے اکیس۲۱ رکعت بیان کی ہیں، دیکھو فتح الباری (ص ۲۱۹ ج ۲) و (عمدۃ القاری ص ۳۵۷ ج ۵) اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے گیارہ رکعت کی روایت کو راوی کا وہم بتلایا ہے، دیکھو زرقانی شرح مؤطا (ص ۲۱۵ ج ۱) اور سائب بن یزید سے محفوظ اور صحیح روایت وہ ہے جس کو مالک اور بیہقی نے یزید بن خُصَیفہ کے واسطہ سے

سائب بن یزید سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیس رکعت (تراویح) اور وتر کے ساتھ قیام رمضان ہوتا تھا، دیکھو (التعلیق الحسن ص ۵۰، ج ۲) اور (فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۴) اور راس کے محفوظ اور صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ میں راویوں نے اختلاف نہیں کیا، دوسرے اس کے مؤیدات بہت زیادہ ہیں،

منجملہ ان کے وہ ہے جو مالکؒ نے مؤطا میں یزید بن رومان سے روایت کیا ہے، کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ رمضان میں تیئیس رکعت کے ساتھ قیام کرتے تھے، (مراد تراویح ہے) اور ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مسنف میں یحیی بن سعیدؒ سے روایت کیا ہے، کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھائے، اور ابنؒ ابی شیبہؒ نے عبدالعزیز بن رفیع سے روایت کیا ہے کہ ابی ابن کعبؓ رمضان میں مدینے کے لوگوں کو بیسؓ رکعت (تراویح) اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے، اور ان تینوں کی سند صحیح ہے، (دیکھو مؤطا اور تعلیق حسن) البتہ یہ مؤیدات مرسل ہیں، مگر مرسل کے سب راوی ثقہ ہوں تو وہ ہمارے نزدیک مثل موصول کے ہے، اگر غیر مقلد اس کے ضعیف ہونے کا دعویٰ کریں تو کتاب وسنت سے دلیل لائیں، کسی عالم کا قول بیان نہ کریں، کیونکہ کسی عالم کا قول جب خود اُن کے اوپر حجت نہیں تو دوسروں پر اس سے حجت قائم کرنے کا ان کو کیا حق ہے، دوسرے اگر وہ دو عالموں کا قول اپنی تائید میں لائیں گے تو ہم دسؒ کا قول اس کے خلاف دکھلا سکتے ہیں،

مشتہر نے حافظ ابن حجرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ پہلا عدد گیارہ رکعت کا رسول خدا صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے موافق ہے،، اھ، اس کے متعلق صرف ہم یہ چاہتے ہیں کہ اول مشتہر یہ بتلائے کہ کیا وہ حافظ ابن حجرؒ کا مقلد ہے، یا ان کی تقلید کو دوسروں پر واجب سمجھتا ہے، دوسرے فتح الباری کی عبارت بعینہ مع حوالہ صفحہ وسطر کے شائع کرے، کیونکہ ہم کو مشتہر کی فہم کا چند مواقع کے مطالعہ سے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ کچھ کا کچھ سمجھ جاتا ہے، یا مخلوق کو دھوکہ دینا چاہتا ہے ہم اس کو متنبہ کرتے ہیں کہ یہ قول حافظ ابن حجر کا نہیں، بلکہ ابن اسحٰق صاحب مغازی کا ہے، اور گیارہ کے متعلق نہیں بلکہ تیرہ کے متعلق ہے، اس کے بعد اس نے علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے رسائل تسعہ کے حوالہ سے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے گیارہ رکعت کو زیادہ محبوب بتلایا ہے، اور یہ کہ یہی مقدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تھی، اور فرمایا کہ میں اسکی وجہ نہیں جانتا کہ یہ زیادہ رکعتیں کہاں سے اور کیوں پیدا ہو گئیں اھ ملخصاً۔

اس کے متعلق بھی ہم سوالاتِ مذکورہ کا اعادہ کرکے یہ کہتے ہیں کہ بالفرض اگر یہ قولِ امام مالکؒ سے کسی نے نقل بھی کیا ہو تو اس کی سند دیکھنا ضروری ہے، ورنہ امام مالکؒ کی طرف اس کی نسبت جائز نہیں ہوسکتی، کیونکہ مدونہ مالک میں جو سحنون مالکی ثقہ کی روایت ابن القاسم مالکی ثقہ سے ہے، اور ابن قاسم بلاواسطہ امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اس کے خلاف یہ مرقوم ہے،

قال مالك بعث الى الامير واراد ان ينقص من قيام رمضان الذی کان یقومه الناس بالمدینة قال ابن القاسم وهو تسعة وثلاثون ركعة ست وثلاثون ركعة والوتر ثلاث قال مالك فنهيته ان ينقص من ذلك شيئا وقلت له هذا ما ادركت الناس عليه وهذا الامر القديم الذی لم تزل الناس عليه (ص ۱۹۳ ج ۱)،

جس میں صاف تصریح ہے کہ امام مالک کے نزدیک تراویح چھتیس رکعت ہی، اور وہ اس سے کم کرنے کو منع کرتے ہیں اور اس کو عمل قدیم سمجھتے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہی کہ امام مالک گیارہ رکعت سے زیادہ پر تعجب ظاہر کرتے ہوں، اور یوں کہیں کہ میں اس کی وجہ نہیں جانتا کہ یہ زیادہ رکعتیں کہاں سے پیدا ہوگئیں،

اس کے بعد مدونہ میں نافع اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سے چھتیس رکعت کی روایت نقل کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ کے پاس عمل اہل مدینہ کے علاوہ روایت بھی گیارہ رکعت سے زیادہ کے ثبوت میں موجود ہے،

اس کے بعد مشتہر نے علامہ عینی حنفی کی شرح بخاری سے یہ نقل کیا ہے کہ بعض ائمہ کا مذہب گیارہ رکعت تراویح کا ہے، اور اسی کو امام مالک نے اپنے نفس کے لئے پسند فرمایا الخ: اس کے متعلق ہم کو مشتہر کے انصاف کی داد دینا ضروری ہی، کہ علامہ عینی حنفی نے جس عدد کو جمہور صحابہ اور جمہور علماء سے نقل کیا تھا، اور جس کی تائید میں بہت سے آثار نقل کئے تھے اس کو تو چھوڑ دیا اور جس قول کو سب سے اخیر میں تضعیف کے صیغہ سے نقل کیا تھا اس پر زور دینے لگا، دوسرے ہم اس کے متعلق بھی تصحیح سند کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ امام مالکؒ کا قول مدوّنہ میں اس کے خلاف مذکور ہے، اور مدوّنہ فقہ مالکی کا فتاویٰ معتبر ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی روایت امام مالک کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی، اگر امام مالکؒ کے نزدیک گیارہ رکعت مختار ہوتیں تو مدوّنہ میں ضرور اس کا ذکر ہوتا، قاضی ابن رشد نے بھی بدایۃ المجتہد میں امام مالک سے ایک روایت تو بیس رکعت کی جمہور کے موافق نقل کی ہے، اور دوسری روایت چھتیس رکعت

کی نقل کی ہے گیارہ کا کوئی ذکر نہیں، پس گیارہ کی روایت مالک سے یقیناً ضعیف ہے،

اور شیخ ابوبکر بن اعربی ائمہ مجتہدین میں سے نہیں ہیں، بلکہ خود مقلد ہیں، ان کا قول مقلدین پر حجت ہی، اور غیر مقلدین سے حیرت ہی کہ وہ امام ابوحنیفہ وشافعی ومالک واحمد کی تقلید سے تو عار کرتے ہیں اور ان کے مقلدوں کی تقلید کو تیار ہیں، کہیں حافظ ابن حجر کا نام لیتے ہیں کہیں حافظ ابوبکر بن عربی کا،

اس کے بعد مشتہر نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ماثبت بالسنۃ اور شرح مشکوٰۃ وغیرہ کے حوالے سے اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صحیح روایت وہ ہی جسکو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے گیارہ رکعتیں پڑھیں، جیسا کہ آپ کی قیام اللیل میں عادت تھی اور نقل کیا گیا ہے کہ بعض سلف امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز کی خلافت میں گیارہ رکعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت کی نیت سے پڑھتے ہیں، اھ،

اس عبارت کے نقل کرنے میں مشتہر نے بڑی چالاکی سے کام لیا ہے، کیونکہ اس نے اس قول کو جو شیخ عبدالحقؒ نے محدثین سے نقل کیا تھا خود شیخ کا قول بتا کر حنفیہ کو دھوکا دیا ہے کہ دیکھو شیخ عبدالحق حنفی بھی گیارہ رکعت کے قائل ہیں، حالانکہ شیخ کی عبارت اس طرح ہے فعندنا ھی عشرون رکعۃ لما روی البیہقی باسناد صحیح الیٰ ان قال وروی ابن عباس انہ صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشرین رکعۃ فی رمضان واوتر بعدھا بثلث لکن المحدثین قالوا ان ھذا الحدیث ضعیف والصحیح ما روتہ عائشۃ انہ صلی احدی عشرۃ رکعۃ الخ جس کو ذرا بھی عربی سے مس ہوگا وہ سمجھ جائے گا کہ گیارہ رکعت کے عدد کو ترجیح شیخ عبدالحقؒ خود نہیں دے رہی، بلکہ محدثین کا قول نقل کر رہے ہیں، اور خود شیخ کے نزدیک تو راجح بیس ہی کا عدد ہے، جسکو سب سے اول بیہقی کی سند صحیح کے حوالہ سے لکھا ہے، اور خلافت عمر بن عبدالعزیزؒ میں جن بعض سلف کا فعل بیان کیا جاتا ہے اس کی کوئی سند نہیں، نہ یہ معلوم کہ یہ بعض سلف کون ہیں، کہیں محمد بن اسحٰق صاحب مغازی اور واقدی تو نہیں؟ اور ایسی بے سند بات سے استدلال کرنا غیر مقلد کی اتباع حدیث صحیح کی کافی دلیل ہے، اس کے بعد مشتہر نے حضرت مجددالف ثانیؒ کا قول مبدأ ومعاد سے نقل کیا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ مشابہت کرنا چاہتے، اگرچہ بحسب ظاہر کیوں نہ ہو، الخ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ہر حنفی کا ایمان ہے، اور تمام مقلدین خواہ حنفی ہوں

یا شافعی تراویح کی بیس رکعتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت کا اتباع کر کے پڑھتے ہیں، اور ہم اوپر محدثین ہی کے قول سے بتلا چکے ہیں کہ حضرت عائشہ رضؓ کی وہ روایت جس میں گیارہ کا ذکر ہے مضطرب ہے، اور جب تک اضطراب رفع نہ ہو اس وقت تک وہ حدیث حجت نہیں،

اس کے بعد مشتہر نے علامہ ابن ہمام کا قول فتح القدیر سے نقل کیا ہے کہ حاصل احادیث و آثار صحابہ سے از روئے دلیل یہ ہے کہ تراویح سنت گیارہ رکعت مع وتر بجماعت ہیں الخ مشتہر نے علامہ ابن ہمام کی عبارت میں ایسی کانٹ چھانٹ کی ہے، جس نے اس کی دیانت کی قلعی کھول دی، علامہ ابن ہمام کی عبارت سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا، کہ تراویح بیس رکعت سنتِ نبویہ نہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ بیس رکعت تراویح اور وتر میں سے گیارہ رکعت تو سنتِ نبویہ ہے، اور باقی بارہ رکعتیں سنت خلفائے راشدین ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سنتِ خلفاء کے اتباع کی بھی دعوت دی ہے اپنے ارشاد علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین (اخرجہ الترمذی وقال حسن صحیح) اھ میں،

بتلائیے اس سے یہ مطلب کیونکر نکلا کہ تراویح بیس نہ پڑھنا چاہیئے بلکہ گیارہ پڑھنا چاہیئے یا یہ کہ بیس رکعت سنت نہیں، بلکہ علامہ تو بیس کو سنت مان کر یہ تفصیل کرتے ہیں، کہ ان میں سے گیارہ رکعت سنتِ نبویۂ ہے، اور باقی سنت خلفاء ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ ان بیس سنتوں میں سے گیارہ بہت زیادہ مؤکد ہیں، اور باقی ان کے برابر مؤکد نہیں اور سننِ مؤکدہ میں باہم فرق مراتب ہو سکتا ہے، جیسا کہ سنتِ فجر تمام سننِ مؤکدہ سے آکد ہے اگر کسی کے نزدیک علامہ ابن ہمام کی عبارت کا یہ مطلب نہیں تو ہمارے اوپر غیر مقلدین کی فہم حجت نہیں، کیونکہ علماء حنفیہ کے اقوال کا مطلب وہ ہم سب سے زیادہ نہیں سمجھ سکتے،

اور بعد تسلیم کے ہم کو یہ بھی کہنے کا حق ہے کہ امام ابن ہمام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ سنتِ نبویہ کو نہیں سمجھ سکتے تو جب امام ابو حنیفہ نے بیس رکعات کو سنتِ مؤکدہ فرمایا ہے، اُن کے مقابلہ میں ابن ہمام کا قول کوئی چیز نہیں، حنفیہ نے امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کی تقلید کا التزام کیا ہے، ابن ہمام کی تقلید کا التزام نہیں کیا، پس اگر غیر مقلد کو اقوالِ علماء بیان کرنے سے حنفیہ پر الزام قائم کرنا مقصود ہے تو وہ امام ابو حنیفہؒ یا صاحبین کا کوئی

قول پیش کریں، جن میں انھوں نے صرف گیارہ رکعت کو سنت فرمایا ہو اور بیس کو خلافِ سنت کہا ہو، کیونکہ اصلی اکابر حنفیہ یہی حضرات ہیں، ان کے مقابلہ میں سب اکابر و مشائخ اصاغر ہیں، اور ہم عنقریب احادیث و آثار صحابہ ہی سے بیس رکعات تراویح کی مسنونیت کا ثبوت دینے والے ہیں، ناظرین منتظر رہیں،

اس کے بعد مشتہر نے بحر الرائق و طحطاوی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ تحقیق ثابت ہوتی ہے تعداد گیارہ رکعات مع وتر صحیح بخاری و صحیح مسلم میں، تو اس صورت میں ہمارے مشائخ حنفیہ کے اصول پر از روئے دلیل آٹھ ہی رکعت ہیں، اھ

یہاں بھی مشتہر نے دھوکا دیا ہے، کیونکہ بحر الرائق و طحطاوی وغیرہ نے علامہ ابن ہمام ہی کا قول فتح القدیر سے نقل کیا ہے، خود صاحب بحر و طحطاوی نے اپنی ذاتی رائے بیان نہیں کی، پس اس کو صاحبِ بحر و طحطاوی کا قول بتا کر نقل کرنا عجیب حرکت ہے، نیز مشتہر نے بحر و طحطاوی کی عبارت کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے اس کو لازم ہے کہ اصل عبارت پیش کرے، اور علامہ ابن ہمام کا مطلب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اسی جواب کا یہاں بھی اعادہ کر لیا جائے،

اس کے مشتہر نے فتح المعین شرح کنز کی ایک عبارت نقل کی ہے، چونکہ فتح المعین میرے پاس نہیں ہے، اس کے متعلق میں تفصیل کے ساتھ مشتہر کی دیانت کو ظاہر نہیں کر سکتا ہاں اجمالاً اتنا کہتا ہوں کہ یہ قول شارح کنز کا نہیں ہے، بلکہ غالباً اس نے محدثین کا قول نقل کیا ہے، اور مشتہر کی عادت ہے کہ وہ ہر منقول کو ناقل کا قول بنا دیتا ہے، جیسا کہ شیخ عبد الحق کی عبارت میں وہ ایسا کر چکا ہے،

اس کے بعد مشتہر نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ حق الصریح کے حوالہ سے علامہ قدوری حنفی کا قول نقل کیا ہے کہ تراویح آٹھ رکعت سنت مؤکدہ ہے اس کے بعد خود مولانا گنگوہیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ گیارہ رکعت تراویح ثابت اور مؤکدتر ہے، الخ،

سو ہم نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا رسالہ حق الصریح اب تک نہیں سنا، شاید اس نام کا کوئی رسالہ مشتہر کے گھر بیٹھ کر مولانا نے تصنیف کیا ہو، ہاں الرائی النجیح فی عدد رکعات التراویح مولانا کا رسالہ ہم نے ضرور دیکھا ہے، اس میں تو ان باتوں میں سے

ایک کا بھی پتہ نہیں جو مشتہر نے نقل کی ہیں، نہ اس میں علامہ قدوری کا قول مذکور ہے، نہ خود مولانا گنگوہی کا یہ قول ہے کہ گیارہ رکعت تراویح ثابت اور مؤکد تر ہیں، بلکہ اس میں تو مشتہر کے خلاف مولانا ؒ نے یہ فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کی وہ حدیث جس میں فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت سے زیادہ رمضان وغیر رمضان میں نہیں پڑھتے تھے، الخ تراویح کے متعلق نہیں بلکہ صرف تہجد کے متعلق ہے، یعنی آپؐ تہجد میں اس سے زیادہ غالب اوقات میں نہ پڑھتے تھے، کیونکہ تہجد میں بھی یہ حدیث کلی نہیں بلکہ اکثری ہے، خود حضرت عائشہ رضؓ کی دوسری روایات سے گیارہ پر زیادت اور عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کی روایات سے اس سے زیادہ رکعات تہجد میں ثابت ہیں، ملاحظہ ہو (ص ۸ و ۹)

اس کے بعد مشتہر نے سیدی مرشدی مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مدنی کا یہ قول براہینِ قاطعہ سے نقل کیا ہے کہ سنتِ مؤکدہ ہونا آٹھ رکعت تراویح کا تو بالاتفاق ہے، انتہیٰ،

واقعی مشتہر کو عبارت کی قطع و برید اور مبتدا کو خبر سے جدا کر دینا خوب آتا ہے، کیوں نہ ہو، دھوکا دہی کا فن اسی طرح سیکھا جاتا ہے، اب سنئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر انوارِ ساطعہ کے اس قول کو رَد کر رہے ہیں کہ وہ تراویح کو جڑ ہی سے بدعت کہہ رہا تھا، اور اس نے حضرت عمر رضؓ کے قول نعم البدعۃ ہذہ سے استدلال کیا تھا اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں کہ فخرِ عالمؐ خود فرما چکے ہیں، سننت لکم قیامہ الحدیث من قام رمضان ایمانا واحتسابا، اور اس کا فعل ابتداعی کر دکھایا تواب فعل اور مطلق قول سے جس قدر امور صلوٰۃ تراویح کے متعلق ہیں، سب ثابت ہوگئے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اور سنت مؤکدہ ہونا آٹھ رکعت تراویح کا تو باتفاق ہے، اگر خلاف ہے تو بیس میں ہے الخ یعنی پھر تمھارا اصل تراویح کو بدعت کہنا خلافِ اجماع ہے، کیونکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں، نہ مقلد نہ غیر مقلد، نہ سنّی نہ وہابی، یہ تم نے تیسری شاخ کہاں سے نکالی، کہ تراویح اصل ہی سے بدعت ہے، یہ مطلب تھا مولانا کا جس پر نہ معلوم ..... غیر مقلد کیوں اچھل رہا ہے، مولانا نے اس میں یہ کہاں فرمایا ہے کہ بیس رکعت کے سنت ہونے میں حنفیہ کو بھی اختلاف ہے، بلکہ صرف مؤلف انوارِ ساطعہ کی حماقت ظاہر

کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی فرقۂ مبتدعہ کو تراویح کی سنتِ موکدہ ہونے میں اختلاف ہے تو وہ گیارہ سے زیادہ میں ہے، ورنہ اصل تراویح کو سب کے سب بالاتفاق سنت مانتے ہیں، اسکو کوئی بدعت نہیں کہتا،

یہ تو مشتہر کے دلائل کا جواب تھا، جس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مشتہر اور اس کی جماعت غیر مقلدین کے پاس کوئی دلیل صحیح اور صریح ایسی نہیں جس سے بیس رکعات تراویح کی نفی ہوتی ہو، بلکہ جو حدیث مرفوع حضرت عائشہ رضؓ کی اور جو اثر سائب بن یزیدؓ کا حضرت عمر رضؓ سے گیارہ رکعت تراویح کے متعلق وہ پیش کرتے ہیں وہ دونوں مضطرب ہیں، اور دلالتِ معنویہ بھی اُن کی صریح نہیں،

اس کے بعد میں جمہور علماءِ مجتہدین و فقہاء حنفیہ وغیرہ کے دلائل بیان کرتا ہوں، جن سے بیس رکعت تراویح کا سنت ہونا معلوم ہوگا،

حدیث اول: اخرج ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ حدثنا یزید بن ھارون قال اخبرنا ابراھیم بن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر واخرجہ الکشی فی مسندہ والبغوی فی معجمہ والطبرانی فی الکبیر والبیہقی فی سننہ اھ التعلیق الحسن (ص ۵۶ ج ۲)

(ترجمہ) عبداللہ بن عباس (صحابی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے، اس کو ابن ابی شیبہ و بیہقی وغیرہ نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں تمام راوی ثقہ ہیں، مگر شاید کوئی غیر مقلد ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے سند پر کچھ کلام کرے تو اس کو تہذیب التہذیب میں حافظ ابن عدی کا یہ قول دیکھ لینا چاہئے، لہ احادیث صالحۃ وھو خیر من ابراھیم بن ابی حیۃ اھ، اس کی یعنی ابراہیم بن عثمان کی احادیث عمدہ ہیں، اور وہ ابراہیم بن حیہ سے بہتر ہے اب ذرا ابراہیم بن ابی حیہ کو بھی لسان المیزان میں دیکھ لو تو اس کے متعلق یحییٰ بن معین امام جرح و تعدیل کا یہ قول ہے، نقل عثمان الدارمی عن یحیی بن معین انہ قال شیخ ثقۃ کبیر، یعنی عثمان دارمی نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ابراہیم بن ابی حیہ کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ شیخ ثقہ ہے۔ بزرگ ہے، اب بتلاؤ جو شخص ایسے ثقہ

شیخ کبیر سے بھی بہتر ہو وہ کیا کچھ ہوگا، پھر ابراہیم بن عثمان کی عدالت وغیرہ کی تعریف امام یزید بن ہارون، محدّث حنفی نے کی ہے جو ابراہیم مذکور کے کاتب و منشی زمانہ قضاء میں رہ چکے ہیں، اس لئے ہم اس کو ضعیف ماننے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ اس کی تعریف ایک حنفی محدّث اور حافظ ابن عدی نے کی ہے، ہمارے لئے تو ایک محدّث حنفی کی تعریف ہی راوی کے معتبر ہونے کو کافی تھی، خواہ سارے محدثین اس کو ضعیف کہتے ہوں چہ جائیکہ اس کے ساتھ ابن عدی جیسا امام جرح و تعدیل مسلّم فریقین بھی اس کی احادیث کو عمدہ کہتا ہے، تو اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم ابراہیم بن عثمان کی حدیث کو ضعیف مانیں، اور اگر غیر مقلد اس حدیث کو ضعیف ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ اوّل حدیث کے ردّ و قبول کے اصول کتابؔ و سنت سے بیان کرے، پھر اس حدیث کو ضعیف ثابت کرے، اور جو چاہے انعام ہم سے لیلے بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی تقلید نہ کرے، کیونکہ تقلید اسکے نزدیک جائز نہیں، اور اگر وہ بخاری و مسلم وغیرہ کی تقلید کر کے ایک حدیث کو ضعیف کہے گا تو یاد رکھے کہ حدیث کے ردّ و قبول کے اصول و قواعد فقہاء حنفیہ نے بھی بیان کئے ہیں ہم ان کے مقابلہ میں یہ اصول پیش کر کے غیر مقلد سے سوال کریں گے کہ تم کتاب و سنت سے اس کا ثبوت دو کہ حدیث کے ردّ و قبول میں بخاری و مسلم کی تقلید واجب ہو اور ابو حنیفہ کی جائز نہیں،

نیز غیر مقلد کو معلوم ہونا چاہئے کہ کسی راوی میں کسی محدّث کے طعن و جرح سے اگر وہ راوی ضعیف یا اس کی احادیث ضعیف ہو جایا کریں تو خود امام بخاری بھی ضعیف اور انکی احادیث بھی ضعیف ہو جائیں گی، کیونکہ امام بخاری پر بھی امام محمد بن یحییٰ ذہلی نے جرح کی ہے، دیکھو مقدمۂ فتح الباری، نیز بخاری کے بہت سے راویوں پر بعض محدثین نے جرح و طعن کیا ہے، جیسا کہ مقدمۂ فتح الباری کے مطالعہ سے واضح ہوگا، پس اگر بعض محدثین کا طعن بوجہ دوسرے محدثین کی توثیق و تعدیل کے امام بخاری میں اور انکی احادیث میں مؤثر نہیں ہو سکتا تو ابراہیم بن عثمان میں بھی کسی کا طعن حافظ ابن عدی کی تعدیل اور یزید بن ہارون کی تعریف کے بعد مؤثر نہ ہونا چاہئے، لہٰذا کسی کا منہ نہیں جو اس حدیث کو ضعیف کہہ سکے، اور اگر علماء حنفیہ میں سے بھی کسی نے بعض محدثین کی تقلید کر کے اس کو ضعیف کہہ دیا ہو تو ان کا قول ہم پر حجت نہیں، کیونکہ اس وقت اصولی گفتگو ہو رہی ہے، تقلیدی گفتگو نہیں ہے،

دوسری حدیث قالت عائشۃ رضی اللہ عنہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجتہد فی رمضان مالا یجتہد فی غیرہ رواہ مسلم فی صحیحہ،

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں (عبادت کے لئے) زیادہ مشقت کرتے تھے کہ غیر رمضان میں اس قدر مشقت نہ کرتے تھے، اس کو مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے،

وعنہا قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل العشر (الاخیر ۱۲ فتح) شد مئزرہ واحیی لیلہ وایقظ اھلہ، اخرجہ البخاری)

حضرت عائشہ رضؓ ہی سے روایت ہے کہ جب رمضان کا اخیر عشرہ آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر کس لیتے اور رات بھر جاگتے اور گھر والوں کو جگاتے تھے، اس کو بخاری رحؒ نے روایت کیا ہے،

وعنہا مرفوعًا کان اذا دخل شہر رمضان شد مئزرہ ثم لم یأت فراشہ حتی ینسلخ واسنادہ حسن رواہ البیہقی فی شعب الایمان قالہ العزیزی فی شرح الجامع الصغیر للسیوطی رحؒ، حضرت عائشہ رضؓ ہی سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ جب رمضان آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے اور بستر پر نہ لیٹتے تھے یہاں تک کہ رمضان ختم ہو جاتا، اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے، اور اس کی سند حسن ہے (عزیزی)

وعنہا مرفوعا قالت کان اذا دخل رمضان تغیر لونہ وکثرت صلوتہ و ابتہل فی الدعاء واشفق لونہ اخرجہ البیہقی فی الشعب (عزیزی) حضرت عائشہ رضؓ ہی سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ جب رمضان داخل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بدل جاتا اور آپ کی نماز (پہلے سے) زیادہ ہو جاتی اور دعا میں زیادہ عاجزی کرنے لگتے، اور آپکا رنگ سرخ ہو جاتا، اس کو بھی بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے،

یہ چار احادیث صاف طور سے اس بات کو بتلاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی راتوں میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کرتے اور زیادہ نماز پڑھتے تھے، گو انمیں بیس رکعات تراویح کا صاف ذکر نہیں، مگر یقینًا ان سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضؓ کی وہ حدیث جو بواسطہ ابو سلمہ کے شیخین رحؒ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اھ اس کا وہ

مطلب نہیں جو غیر مقلدوں نے سمجھا ہے کہ حضور رمضان کی راتوں میں بھی تہجد وغیرہ ملاکر صرف گیارہ ہی رکعت پڑھتے تھے، کیونکہ یہ مطلب حضرت عائشہ رضؓ کی دوسری روایات کے بالکل خلاف ہے، بلکہ تمام روایات کو ملاکر اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تہجد میں آپؐ کا معمول غالب گیارہ رکعت ہی کا تھا، رمضان میں بھی تہجد کی مقدار اکثر یہی تھی، باقی یہ کہ تہجد کے علاوہ بھی آپؐ رمضان کی راتوں میں کچھ نماز نہ پڑھتے تھے، اس سے یہ گیارہ والی روایت ساکت ہے، اور حضرت عائشہ رضؓ کی دوسری روایات بتلاتی ہیں کہ آپؐ تہجد کے علاوہ رمضان میں اور نماز بھی پڑھتے تھے، جسکو ابن عباسؓ کی روایت نے صاف طور پر واضح کردیا کہ آپؐ رمضان میں بیسؔ رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے، پس یہ چار احادیث بالاجمال حدیث ابن عباسؓ کی مؤید ہیں،

اور اگر غیر مقلد ہماری اس تقریر کو تسلیم نہ کرے تو ہم کہیں گے کہ اچھا تم کسی دوسری تقریر سے حضرت عائشہ رضؓ کی روایات کا اختلاف رفع کردو، مگر اختلاف رفع کرنے سے پہلے تم کو گیارہ رکعت والی حدیث سے استدلال کا کیا حق تھا؟

عنؔ السائب بن یزید الصحابی قال کانوا یقومون علی عهد عمر رضی الله عنه بعشرين وعلى عهد عثمان وعلی رضی الله تعالیٰ عنهما مثله رواه البیهقی باسناد صحیح (عینی شرح بخاری، ص ۵۹۸ ج ۳) سائب بن یزید صحابیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان وحضرت علی رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بیسؔ رکعات (تراویح) پڑھا کرتے تھے،

قال الحافظ ابن عبد البر وروى الحارث بن عبد الرحمن بن ابی ذباب عن السائب بن یزید قال کان القیام علی عهد عمر بثلاث وعشرين رکعة قال ابن عبد البر والثلاث للوتر اھ (عینی شرح بخاری، ص ۳۵۷ ج ۵) حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ حارث ابن عبد الرحمن نے سائب بن یزید سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں قیام رمضان (تراویح) تئیس۲۳ رکعت تھا، حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ تین رکعت وتر کی ہیں،

وکیع عن حسن بن صالح عن عمرو بن قیس عن ابی الحسناء عن علی رضی الله عنه انه امر رجلا یصلی بهم رمضان عشرين رکعة اخرجه فی مسنده (عینی ص ۳۵۷ ج ۵)

حضرت علی رضؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو رمضان میں بیسؔ رکعت (تراویح) پڑھادیا کریں، اس کو وکیع نے روایت کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اسکی سند حسن ہو،

اخبرنا یحیی بن یحیی اخبرنا حفص بن غیاث عن الاعمش عن زید بن وھب قال کان عبد اللہ بن مسعود یصلی لنا فی شہر رمضان فینصرف وعلیہ لیل قال الاعمش کان یصلی عشرین رکعۃ و یوتر بثلاث، رواہ محمد بن نصر المروزی (عینی صفحہ مذکور) زید بن وہبؓ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رمضان کے مہینہ میں ہم کو نماز پڑھاتے اور ایسے وقت فارغ ہوتے کہ کچھ رات باقی رہتی، اعمش راوی کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضؓ بیس رکعت اور وتر کی تین رکعت پڑھا یا کرتے تھے اس کو محمد بن نصر مروزی نے روایت کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ سند صحیح ہے، اور تین مرسل آثار ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، جن میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح پڑھے جانے کا ثبوت ہے،

اب ان سب احادیث کو ملاؤ تو معلوم ہوگا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھنا ثابت ہے، اور حضورؐ کے بعد حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں عام طور پر صحابہ بیس رکعت اور تین وتر پڑھتے تھے، اور حضرت علیؓ نے بھی اسی کا حکم دیا ہے، اور عبد اللہ بن مسعودؓ بھی بیس رکعت اور تین رکعت وتر پڑھتے تھے، اور اس کے خلاف کسی صحابی سے ثابت نہیں، اور جو روایت مؤطا کی گیارہ رکعت کی مشہر نے بیان کی تھی ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ مضطرب ہو، اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں،

ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کا یہی قول ہے، اور کوفہ والے اور امام شافعیؒ اور اکثر فقہاء اسی کے قائل ہیں، اور ابی بن کعب سے بھی صحیح طور پر یہی ثابت ہے، اور اس کا خلاف صحابہ سے ثابت نہیں، دیکھو (عینی، ص ۳۵۷ ج ۵)

اور حافظ ابن قدامہ مغنی میں فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل کے نزدیک (جو محدثین کے امام ہیں) تراویح میں بیس رکعت ہی مختار ہیں، اور سفیان ثوری و ابو حنیفہ اور شافعی بھی اسی کے قائل ہیں، ہماری دلیل یہ ہو کہ حضرت عمرؓ نے جب سب آدمیوں کو ابی بن کعب کے پیچھے جمع کیا ہے، تو وہ اُن کو بیسؔ رکعت ہی پڑھاتے تھے، اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے،

اور سائب بن یزید نے بھی ایسے ہی روایت کیا ہے، جو متعدد طرق سے اُن سے مروی ہے، اور امام مالکؒ نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں صحابہؓ رمضان میں تیئیس رکعت سے قیام کرتے (یعنی تراویح پڑھتے) تھے، اور حضرت علیؓ نے بھی ایک شخص کو رمضان میں بیس رکعت پڑھانے کا حکم کیا، اور یہ اجماع کے مثل ہے، آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جو کچھ حضرت عمرؓ نے کیا جس پر ان کے زمانہ میں حضرات صحابہؓ نے اجماع کر لیا ہے وہی اتباع کے زیادہ لائق ہے، اھ (ص ۸۰۳ ج ۱)

اب غیر مقلد بتلائیں کہ وہ اس اجماع کی مخالفت کر کے کہاں رہیں گے، اخیر میں ہم اتنا اور بتلائے دیتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ کے یہ تمام آثار اور ان کا بیس رکعات تراویح پر اجماع و اتفاق کرنا یہ سب حضرت ابن عباسؓ کی اس حدیث کی تائید کر رہا ہے جو ابن ابی شیبہ نے مرفوعاً ان سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے،

اب اس حدیث کے صحیح ہونے میں کچھ شک نہیں، کیونکہ حدیث کی صحت کی یہ بھی دلیل ہے کہ امت نے اس کی تلقی بالقبول کی ہو، قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں منتقیٰ کی پہلی ہی حدیث کی شرح میں یہ قاعدہ بیان کیا ہے (ص ۱۵ ج ۱) اور اس سے بڑھ کر تلقی کیا ہوگی کہ خلفائے ثلثہ کے عہد میں صحابہ نے بیس رکعت تراویح پر اجماع و اتفاق کیا، اور ان کے بعد سے اب تک تمام امت کا اس پر اتفاق چلا آرہا ہے، اگر کسی نے بیس پر زیادتی کی ہو تو کی ہو بیس سے کمی کسی نے نہیں کی، سوائے غیر مقلدوں کے اور ہم ان کے تمام دلائل کا ضعیف ہونا اوپر ظاہر کر چکے پس حدیث مرفوع صحیح بالتلقی وحسن بالسند اور آثار کثیرہ و اجماعِ صحابہ کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کو جس کے دل میں خدا کا خوف ہو یہ حق نہیں کہ وہ بیس رکعات تراویح کا انکار کرے، یا اس کو خلافِ سنت کہے، اور گیارہ رکعت کا رواج دے، خدا ایسی سستی اور کاہلی سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے، آمین، وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، ۱۹ رمضان ۱۳۴۶ھ

نماز تراویح میں کسی بھی ایک سورۃ کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا باآواز بلند علاوہ سورۂ نمل مسنون ہے یا واجب؟	**سوال** (۲۱) کیا کسی سورۃ کے اوّل میں ایک مرتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بآواز بلند تراویح میں پڑھنا مسنون یا واجب ہے؟ یعنی علاوہ سورۂ نمل کے (وانہ بسم اللہ

الرحمٰن الرحیم)۔

الجواب؛ ہاں ختم قرآن تراویح میں کسی ایک سورۃ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا جہر کرنا چاہئے، ورنہ ختم ناقص رہیگا، قال فی نور الانوار والاصح انہا ای التسمیۃ من القرآن الخ قال المحشی فالقرآن عبارۃ عن مأۃ واربعۃ عشرۃ سورۃ وآیۃ وھی التسمیۃ فلابد فی ختم القرآن من قراءۃ التسمیۃ مرۃ (ای جھرا) علی صدر آیۃ سورۃ کانت وھذا کلہ عندنا علی المختار وعند الامام الشافعی ھی جزء من کل سورۃ سوی براءۃ فلو ترکت فی صدر سورۃ ما ما حصل الختم ثم ھذا الاختلاف فی غیر البسملۃ التی فی النمل فھی بعض آیۃ اتفاقا اھ (ص ۹) وانما قیدنا قراءتہا بالجھر لان الامام لو قرأھا سرا تم ختمہ دون ختم السامعین واللہ اعلم، ۱۳ ارشوال ۴۶ھ

سوال (۲۲) نابالغ بچے اور اجرت پر قرآن پاک سنانے والے کے پیچھے نماز تراویح کا حکم،

.... ہمارے محلہ میں تین حافظ ہیں، جو محلہ کی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، ایک صاحب بوجہ ضعف عمری تراویح میں کلام پاک سُنانے سے معذوری ظاہر فرماتے ہیں، اور شاید کسی وجہ سے معذور ہوں، دوسرے صاحب بوجہ کریہ الصوت کہے جانے کے سُنانا نہیں چاہتے، البتہ ایک حافظ جو ہنوز بالغ نہیں ہوئے، مگر قریب البلوغ کے ہے، یعنی جس کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہے وہ سنا سکتا ہے؛ اور شہر میں کوئی حافظ نہیں ہے، ایسی صورت میں دوسرے شہر سے مثلاً لکھنؤ، سندیلہ یا بریلی سے اجرت پر حافظ بُلوا کر تراویح سُنی جاوے یا اس نابالغ کے پیچھے سننا مناسب ہے، شریعت کا جو حکم ہو اس سے اطلاع بخشی جاوے جو لوگ نابالغ کے اقتداء کے قائل نہیں وہ احادیث پیش کرتے ہیں، ایک بخاری شریف میں دوسری مشکوٰۃ میں، ان احادیث کا جواب کیا ہے، اشعۃ اللمعات میں حضرت شیخ دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن سلمہؓ کی حدیث پر شافعیہ کا عملدرآمد ہے، ایسی حالت میں جبکہ فرض پر استدلال ہے تو نفل اور سنتِ مؤکدہ پر عدمِ وجوہ بھی رقم فرمائے جائیں، نابالغ حفاظ کے پیچھے کوئی تراویح نہیں سنتا ہے، اس سے وہ کلام پاک

بھولتے جارہے ہیں، اور لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ بچوں کے حفظِ قرآن کرانا ایک فضول چیز ہے، کیا کیا جاوے، اللہ کے واسطے مع دلائل مرحمت فرمائیں، سننے میں آیا ہے کہ علماء فرنگی محل اور علماء ماوراء النہر نے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اس کے موافقین قولِ امام یا حدیث جو اس کے خلاف ہو طلب فرماتے ہیں، اگر ممکن ہو تو بہت ہی اچھا ہے، ورنہ ہم کو تو صرف آپ کا فتویٰ درکار ہے،

الجواب: اس صورت میں یا تو حافظ کریہہ الصوت کا قرآن نماز میں سُن لیا جاوے بشرطیکہ سب اس پر آمادہ ہوں، اور اس حافظ کی خوشامد کرلی جائے، ورنہ حافظ ضعیف العمر کے پیچھے الم ترکیف سے تراویح پڑھ لی جائے، اُجرت پر اور نابالغ حافظ کے پیچھے بھی تراویح نہ پڑھی جائیں گو امام شافعیؒ کے مذہب میں جائز ہے، مگر امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز نہیں، نہ فرائض میں نہ نوافل میں، اور تراویح سال بھر میں ایک دفعہ نصیب ہوتی ہے، ایسی عبادت کو اختلاف ڈالنا سخت محرومی کی بات ہے اور حدیثوں سے شوافع نے استدلال کیا ہے، حنفیہ اور مالکیہ نے ان کے شافی کافی جواب دیدیئے جو مطولاتِ فقہ میں مذکور ہیں، مقلد کو اُن کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں اور محققین کے نزدیک مانعین کے دلائل مجوزین کے دلائل سے اقویٰ ہیں، کما ذکر فی الاعلاء اور نابالغ حافظوں کے قرآن پختہ کرنے کی یہ صورت ہے کہ نوافل میں مغرب کے بعد یا بعد تراویح کے اس نابالغ حافظ کو امام اور دوسرے نابالغ حافظوں کو مقتدی بنا کر اس کا قرآن سُن لیا جائے، اگر سامع نابالغ نہ ملے تو دو چار رکعت میں کوئی بالغ حافظ ہی اس نابالغ کا مقتدی بن کر قرآن سُن لیں، اور گو اس صورت میں بھی ان نوافل کی صحت مقتدی بالغ کے حق میں مختلف فیہ ہوگی، مگر چونکہ یہ رکعتیں سنت مؤکدہ نہیں ہوں گی، بلکہ زائد نفلیں ہوں گی، ان کو اختلاف کی صورت سے ادا کرنے میں بضرورت حفظِ قرآن مضائقہ نہیں، لیکن تراویح جو سنتِ مؤکدہ ہے اور سال بھر میں ایک دفعہ رمضان میں ہی نصیب ہوتی ہے، اختلاف میں ڈالنا سخت بُری بات ہے، علماء ماوراء النہر نے جواز کا فتویٰ نہیں دیا، اور علماء فرنگی محل اور علماء بلخ نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ خروج من الخلاف عبادت میں اہم ہے، واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۷ر شعبان ۴۷ھ

دو مسجدوں میں جماعتِ تراویح کرانے کا حکم،

سوال (۲۳) .... زید ایک مسجد میں بیس رکعت تراویح پڑھانے کے بعد دوسری مسجد میں بھی بیس رکعت پڑھاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس دوسری مسجد میں مقتدیوں کی نماز درست ہی یا نہیں، اگر نہیں ہے تو کوئی صورت جواز کی ہوسکتی ہی؟

الجواب: ہمارے نزدیک دوسری مسجد کے مقتدیوں کی تراویح درست نہیں ہوتی، اور صورتِ جواز نکالنے کی ضرورت کیا ہے، ۱۲ ر رمضان ۴۷ھ

چار رکعت تراویح کی نیت باندھی اور چوتھی رکعت پر بیٹھنا یاد نہ رہا تو اس کو کیا کرنا چاہیئے؟؟؟

سوال (۲۴) .... اگر تراویح چار رکعت شروع کی جاویں، اور چوتھی رکعت پر بیٹھنا یاد نہ رہے، تو اب کیا صورت کی جاوے گی؟

الجواب: تراویح دو دو رکعت ہی سنت ہے، اس کے خلاف کرنا اور چار چار رکعت پڑھنا مکروہ ہے، اور جو شخص چار چار پڑھتا ہو وہ اگر چوتھی رکعت پر بیٹھنا بھول جاوے تو اس کو پانچویں کے سجدہ کے پہلے قعدہ کی طرف لوٹ آنا اور سجدہ سہو کرلینا چاہیئے، اور قعدہ کرکے کھڑا ہوا ہو تو چھ رکعت پوری کرکے سلام پھیر دے، قال فی مراقی الفلاح وھی عشرون بعشر تسلیمات یسلم علی رأس رکعتین فاذا وصلھا وجلس علی کل شفع فالاصح انہ ان تعمد ذلک کرہ وصحت اجزأت عن کلھا اھ (ص ۲۴۴) ۱۲ ر رمضان ۴۷ھ

دو مسجدوں میں جماعتِ تراویح کرانے کا حکم؛؛؛

سوال (۲۵) .... قصبہ ہذا میں کئی مسجدوں پر بوجہ عدم موجودگی حفاظ کئی سال سے ختم قرآن مجید نہیں ہوتا تھا اور وہاں کے مصلیان اس کے ثواب سے محروم رہتے تھے، امسال ایک حافظ صاحب نے قبل رمضان شریف یہاں کی یہ حالت سنکر یہ نیت کیا تھا کہ اگر میں یہاں رمضان شریف میں رہا تو جو مسجدیں خالی رہیں گی اگر وہاں کے مصلی سنیں گے تو بلا معاوضہ ختم سناؤں گا، چنانچہ چاندرات ہی سے دو مسجدوں پر وہاں کے مصلیان کی خواہش سے تراویح بحالہ (یعنی بست رکعت ہر دو مسجد) پڑھانا شروع کردیا، بعض لوگوں نے حافظ صاحب کے اس طرزِ عمل پر اعتراض کیا، حافظ صاحب نے اپنے عمل کے ثبوت جواز

میں فتاویٰ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کی اس تحریر کو پیش کیا، اور خود کو نادر قرار دیا
والتحریر ھذا، جواز التراویح بنیۃ مطلقۃ ونیۃ النفل کما حققہ ابن الھمام
وفی الثانی ھو اداء التراویح من المقتدی خلف من یصلی التطوع الا انہ
لا یخلو عن کراھۃ لمخالفۃ السلف والملخص فی ھذا ان ینذر الامام
الذی صلی التراویح ویوجب علی نفسہ قدر ما یرید ان یؤدیہ مع الجماعۃ
الثانیۃ فیکون ذلک علیہ واجبا ویخرج عن شبھتہ الخ ص ۲۵۲ جلد ۱
مطبوعہ یوسفی، طبع شدہ ۱۳۲۱ھ

(ثبوت ۲) وقال قاضی خان وقال ابوبکر سمعت ابا نصر انہ قال
یجوز لاھل المسجدین جمیعًا الخ ص ۱۱۲ ج اول باب التراویح،

(ثبوت ۳) (حدیث مشکوٰۃ) عن جابر قال کان معاذ بن جبل یصلی مع النبی
صلی اللہ علیہ وسلم ثم یأتی قومہ فیصلی بھم متفق علیہ وعنہ قال کان
معاذ یصلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم العشاء ثم یرجع الی قومہ فیصلی
بھم العشاء وھی لہ نافلۃ، ص ۱۰۳ باب من صلی صلوٰۃ مرتین،

(۱) اب سوال یہ ہے کہ ان مقتدیوں کی اقتداء امام نا ذر مذکورہ صحیح ہوئی یا نہیں،
اور تراویح دوسری مسجد والے مصلیوں کی ادا ہوئی؟ اور سورۂ تراویح سے یہ صورت
ان کے لئے افضل ہے یا نہیں؟

(۲) جناب نے استفتاء سابق میں مولانا عبدالحی صاحب کے فتویٰ محولہ کو تسلیم
کرتے ہوئے عند الضرورۃ کی قید لگائی ہے، یہ قید ان کی کس عبارت سے مفہوم ہوتی ہے،
براہِ کرم نقل فرماویں، اور لفظ "ضرورت" سے جناب کی کس قسم کی ضرورت مراد ہے،
کیا حالات موجودہ مذکورہ بالا ضرورت کے لئے کافی ہو سکتے ہیں؟ ....

بینوا توجروا و برھنوا علی اقوالکم،

الجواب: جن معترضوں نے حافظ صاحب موصوف کے طرزِ عمل پر اعتراض
کیا ہے، اُن کا اعتراض غلط نہیں، کیونکہ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اس کے متعلق
قاضی خاں کا قول نقل فرمایا ہے، "الاصح انہ لا یجوز" اور صدر شہید سے نقل کیا ہے،
امام یصلی التراویح فی مسجدین علی الکمال لا یجوز، اور امام قاسم بن قطلوبغا محدث وفقیہ

الحنفیہ کا قول نقل فرمایا ہے، الاصح انہ لا یصح وھو مکروہ، اور نصاب الفقہ سے نقل کیا ہے لا یجوز لہ ان یفعل لان التراویح سنۃ والسنن لا یتکرر فی الوقت الواحد فاذا فعل ذلک لا یکون سنۃ والفتوی علی ذلک اھ، اور یہ الفاظ وہ ہیں جو لفظ فتویٰ اور راجح سے مؤید ہیں، ان کے خلاف جو قول ہوگا وہ ضعیف ہے، جیسا کہ لفظ قیل، وقال بعضہم و ینبغی ان یقول کے عنوانات اس کے ضعف پر دال ہیں، اور ضعیف روایت پر فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، مگر سخت ضرورت کے وقت مثلاً صورتِ مسئولہ میں کوئی حاکم مسلم اس حافظ کو یہ حکم کرتا کہ دو تین مسجدوں میں علی الکمال تراویح پڑھاؤ، اور مقتدیوں کو سننے کا امر کرتا، اور تخلف میں خطرہ ہوتا تو ہم اس وقت ضعیف روایت کو اخذ کر کے فتویٰ جواز کا دیدیتے، کیونکہ جب تک شریعت میں کچھ بھی وسعت ہو تو مسلمانوں کو خطرہ میں ڈالنا مناسب نہیں، ہاں وسعت نہ ہو تو گنجائش نہ دی جائے گی، بلکہ اس وقت حاکم کو دبایا جائے گا، ونحو ذلک من الضرورات التی یعرفہا العلماء، اور ایسی ہی ضرورت کے وقت اس مخلص سے کام لیا جائے گا، جو مولانا عبدالحی صاحبؒ نے والمخلص فی ہذا ان ینذر الامام میں بیان کیا ہے، اور گو مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اسکو ضرورت سے مقید نہیں کیا، مگر ہم نے اُن کے کلام کو صحیح کرنے کے لئے یہ محمل بیان کر دیا، ورنہ بظاہر ان کا قول صحیح نہیں، کیونکہ وہ خود اوپر عالمگیریہ سے نقل کر چکے ہیں، کہ تراویح مفترض کے پیچھے صحیح نہیں، بوجہ مخالفتِ سلف کے (حالانکہ نافلۂ مطلقہ خلف المفترض صحیح ہے) پھر وہ ناذر کے پیچھے کس دلیل سے تراویح کو جائز کرتے ہیں، کیا اس میں سلف کی مخالفت نہیں ہے، کیا سلف نے کبھی نذر کر کے ایسا کیا ہے، اور اگر ناذر کے پیچھے تراویح بلا کراہت جائز ہے تو مفترض کے پیچھے بھی جائز ہونا چاہئے، غرض مخلص مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے محض اپنی رائے سے بیان فرمایا ہے، جو عالمگیریہ کے جزئیہ کے مصادم ہے، لہذا اگر اس کو کوئی رد کردے تو اس کو حق ہے مگر ہم نے ادباً یہ لکھ دیا تھا کہ وہ ضرورت کے وقت پر محمول ہے، اور صورتِ مسئولہ میں کوئی ضرورت نہیں، اس لئے حافظ صاحب موصوف کو اپنے طرزِ عمل کو اس طرح بدل دینا چاہئے، کہ ایک مسجد میں آٹھ رکعتوں میں یا دس میں سیپارہ سُنا دیں، بقیہ کو وہ لوگ الم ترکیف سے پورا کرلیں، اور دوسری مسجد میں اُن کے جانے تک دس یا آٹھ رکعتیں الم ترکیف سے

پڑھی جائیں، بقیہ کو مع وتر کے سیپارہ کے ساتھ حافظ صاحب پڑھاویں، بلکہ اس طرح حافظ صاحب چاہیں تو پانچ مسجدوں میں ایک ساتھ ختم سنا سکتے ہیں، کہ ایک ایک مسجد میں چار چار رکعتوں میں سیپارہ سنا دیا کریں، اور بقیہ رکعتیں دوسرا شخص چھوٹی چھوٹی سورتیں سے پڑھاوے، اور اگر مولانا عبدالحی صاحبؒ کے مخلص کو ضرورت کے ساتھ مقید نہ کیا گیا بلکہ مطلق رکھا گیا تو اس سے وہ حفاظ بہت زیادہ کام لیلیں گے جو معاوضہ ختم سناتے پھرتے ہیں کہ وہ چالیسؔ رکعتوں میں دسؔ جگہ دسؔ قرآن شروع کرکے معقول رقم جمع کرلیا کریں گے، اس کو مولانا عبدالحی صاحب بھی کبھی جائز نہیں کہہ سکتے تھے معلوم ہوا کہ یہ مخلص عام نہیں،

اور اس کے بعد جو حافظ صاحب نے دوسرا ثبوت قاضی خاں سے دیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قاضی خاں ہی میں اس سے پہلے ابوبکر اسکاف کا قول لایجوز مذکور رہے، اس کے بعد ابوبکر کے واسطے سے ابونصر کا قول نقل کیا گیا ہے، یجوز لاہل المسجدین جمیعا اور قاعدۂ اصولیہ یہ ہے کہ جس روایت کی مخالفت خود راوی کرے وہ روایت قابلِ احتجاج نہیں رہتی، پس ابونصر کا قول قابلِ اخذ نہ رہا، کیونکہ اس کے راوی ابوبکر نے خود اس کی مخالفت کی ہے، (وھذا فیما اذا کان ثبوت قول المروی عنہ موقوفا علی روایۃ الراوی بخلاف ما اذا اشتہر عنہ ولم یکن موقوفا علی روایۃ الراوی کمذھب ابی حنیفۃؒ فانہ معروف بروایۃ الموافق و المخالف فی اکثر المسائل فلا یقدح فیہ مخالفۃ الرواۃ عنہ فی بعض المسائل ۱۲) اور اگر ابونصر سے اس قول کی روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو خود اس روایت کو بوجہ ضعف دلیل کے ضعیف کہا جائے گا، کیونکہ اس کے خلاف جو اقوال ہیں وہ لفظ فتویٰ وغیرہ سے مؤکد و مؤید ہیں، جو اُن کی قوتِ دلیل پر دال ہے،

اور حدیث معاذ کو جو ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، یہ نہایت ہی عجیب ہے، کیونکہ حدیث معاذ تکرار وتراویح کے متعلق نہیں، بلکہ اگر اس کا مطلب وہی مان لیا جائے، جو حافظ موصوف سمجھے ہیں تو اس سے تکرارِ فرض لازم آئے گا، کہ ایک شخص فرض نماز پڑھ کر وہی فرض دوسری جگہ جاکر مقتدیوں کو پڑھاوے، اور اس کو حنفیہ میں سے کسی نے بھی جائز نہیں کیا، نہ متقدمین میں سے نہ متاخرین میں سے، نہ مولانا عبدالحیؒ صاحب نے، پس اس کا حنفیہ کے نزدیک وہ مطلب نہیں جو ظاہراً مفہوم ہوتا ہے، بلکہ اس کا

مطلب یہ ہے کہ حضرت معاذ رضحضور ؐ کے پیچھے نفل کی نیت کرتے اور اپنی مسجد میں فرض کی نیت کرتے تھے اور دوسری روایت جو ھی لہ نافلۃ آیا ہے اس میں تصریح نہیں کہ یہ قول کس کا ہے، حضرت جابر رض کا ہے یا اُن کے نیچے کے راوی کا، اگر نیچے کا راوی کا ہے تو حجت نہیں، اور حضرت جابر رض کا ہے تو اس حالت میں حجت ہے کہ انھوں نے حضرت معاذ رض سے سنکر ایسا فرمایا ہو محض ظن، اور تخمین سے نہ فرمایا ہو، اور اس میں اس قدر احتمالات ہیں تو احتمالات کے ساتھ استدلال ساقط ہے، اور بعد تسلیم کے یہ اُس وقت پر محمول ہے جبکہ تکرار فرض و وتر جائز تھا، بعد میں جب حضور ؐ نے لَا تصلوا بعد صلوٰۃ مثلہا ولا وتران فی لیلۃ فرماکر اس سے منع فرمادیا تو اب یہ صورت ممنوع ہوگئی،

یہ تو دلائل خصم کا جواب ہے، اور حنفیہ کی اصل دلیل جس کی بنا پر وہ بناء قوی علی الضعیف کو جائز نہیں کہتے حدیث الامام ضامن ہے، جو صحیح حدیث ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام مقتدی سے کم نہ ہونا چاہیے، کیونکہ ادنیٰ اعلیٰ کا ضامن نہیں ہوسکتا، واللہ تعالیٰ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ ۱۴ ررمضان ۱۳۴۷ھ، الجواب صحیح، اشرف علی

تتمہ سوال وجواب مندرجہ بالا

(۱) آپ نے فتوی نمبر ۶ میں جس کے سائل احمد مکرم صاحب ہیں اور جس کی نقل ارسالِ خدمت ہے فرمایا ہے کہ اگر جواز سے مراد صحتِ صلوٰۃ ہے تو مسلّم اور اگر صحت بلا کراہت ہے تو مسلم نہیں للدلائل التی قد ذکرناہا اولا، اور اسی فتوی کے سوال نمبر ۴ میں لکھتے ہیں کہ صحتِ صلوٰۃ میں کلام نہیں، بلکہ اس میں کلام ہے کہ صحت مع الکراہت ہے یا بلا کراہت، تو اس سے صحتِ صلوٰۃ تراویح متنازعہ فیہ مراد ہے یا نفل، اگر تراویح مراد ہے تو کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی اور اس مکروہ صورت پر عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں..... ہر جزو کا جواب صاف اور صریح قابلِ عمل دیا جاوے،

(۲) اور اسی فتوے کے سوال نمبر ۶ کے جواب میں آپ نے قاسم بن قطلوبغا کی عبارت کا جو مطلب بیان کیا ہے اسے مدلل ارشاد فرمائیے، مجوزینِ فریق کا خیال ہے کہ یہ جواب بغیر دلیل قابلِ وقعت نہیں، اس لئے اسے جواز ہی پر محمول کیا جاتا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ آپ بادلیل اور بالتشریح صحیح مطلب بیان فرمائیں، اور جائز مع الکراہت کی صورت میں افضلیت ختم قرآن فی التراویح متنازعہ پر رہے

یا صورۃ تراویح کو، اسے بھی ضرور ارقام فرمائیے، اور اس میں قابلِ عمل طریقہ کونسا ہے، یا بالکل اس پر عمل کی اجازت ہی نہیں ہوسکتی،

(۳) اور آپ نے فتویٰ نمبر، پر سائل محمد ایوب اسروی کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ "ہمارے نزدیک دوسری مسجد میں مقتدیوں کی تراویح درست نہیں ہوتی،، اور دوسرا فتویٰ نمبر ۱۵ (جس کا سائل بھی محمد ایوب اسروی ہی ہے) اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ " اور مولانا عبد الحی صاحب نے اس صورت کو مکروہ لکھا ہے وہی صحیح ہے " فتویٰ نمبر، سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تراویح درست ہی نہیں، اور فتویٰ نمبر ۱۵ سے ظاہر ہے کہ جائز مع الکراہۃ ہے، لہٰذا اس تعارض کو رفع فرماکر صحیح اور قابلِ عمل جواب ارقام فرمائیے؛

الجواب: (۱) صحت سے مراد صحتِ صلوٰۃ بطور نفل محض ہے، اور تراویح اس صورت سے ادا نہ ہوگی،

(۲) دلیل اس کی یہ ہے کہ قاضی خاں کا اس صورت (تکرار تراویح) کے متعلق قول یہ ہے، "الاصح انہ لایجوز" اور صدر شہید کا قول ہے "امام یصلی التراویح فی مسجدین علی الکمال لایجوز" اور نصاب الفقہ میں ہے " لایجوز لہ ان یفعل لان التراویح سنۃ والسنن لایتکرر فی الوقت الواحد فاذا فعل ذلک لایکون سنۃ والفتویٰ علیٰ ذلک اھ" اور عالمگیریہ میں ہے " لو صلی التراویح مقتدیا بمن یصلی مکتوبۃ او وترا او نافلۃ الاصح انہ لایصلح الاقتداء بہ لانہ مکروہ ومخالف لعمل السلف ذکر العبارات کلہا مولانا عبد الحی فی فتاواہ صفحہ ۱۱۷ ج ۱ تا ۱۱۹ ج ۱ مع الخلاصہ"

ان عبارات میں تکرار تراویح بمسجدین کا عدمِ جواز وعدمِ صحت مصرّح ہے، اور علامہ قاسم بن قطلوبغا نے بھی اختلاف نقل کرنے کے بعد یہی فرمایا ہے "والاصح انہ لایصح وہو مکروہ "پس اس میں لایصح کے معنی وہی ہیں جو عالمگیری اور نصاب الفقہ اور قاضی خاں وغیرہ کی عبارات میں لایجوز کے معنی ہیں، یعنی کہ تراویح مسنونہ کے طور پر یہ نماز درست اور صحیح نہ ہوگی، ہاں نفلاً صحیح ہے، اور نفل جماعت سے مکروہ ہے، اس لئے یہ نماز نفلاً مکروہ بھی ہے، قال فی جامع المضمرات قوم صلوا التراویح ثم ارادوا ان یصلوھا بعد ذلک یصلون فرادیٰ لانہ تطوع وصلوٰۃ التطوع بجماعۃ لیست بمستحبۃ اھ

فتاویٰ عبدالحی قلت وھو یعم الامام والمقتدی جمیعا فان الجماعۃ فی التطوع یکرہ مطلقا للامام والمقتدی فافھم،

(۳) میں نے مولانا عبدالحی صاحبؒ کے قول کو غیر مقلدوں کے قول کے مقابلہ میں صحیح کہا ہے، اور اس کے اول و آخر میں تصریح کردی ہے کہ مولانا کا قول بھی سلف کے خلاف ہے، سلف نے اس صورت کو غیر جائز اور غیر صحیح لکھتے ہوئے مکروہ فرمایا ہے جس کے معنی وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، کہ تراویح تو درست و صحیح نہیں، ہاں نفل بکراہت صحیح ہے، میرے سب اقوال کو جمع کرنے اور غور کرنے کے بعد یہ مراد واضح ہے مخفی نہیں، اور اس باب میں صاحب نصاب الفقہ کا یہ قول اَنّ التراویح سنۃ والسنن لا یتکرر فی الوقت الواحد فاذا فعل ذلک لا یکون سنۃ" سب سے اقویٰ ہے، تمام فقہاء اس پر متفق ہیں، کہ اگر کوئی شخص سنت فجر کو دوبارہ پڑھے یا سنتِ ظہر و مغرب و عشاء کو مکرر پڑھے تو سنت صرف اوّل ہے ثانی سنت نہیں، بلکہ نفل محض ہے، اور سنتِ مؤکدہ واجب کے قریب ہے تو جب امام تراویح کا تکرار کر رہا ہے اور ثانی سنتِ مؤکدہ نہیں تو اس کے پیچھے قوم کی تراویح ادا نہ ہوگی، ہمارے نزدیک یہی راجح اور صحیح ہے، گو مسئلہ مختلف فیہ ہے، مگر فتویٰ اسی پر ہے اور اصح یہی ہے، اور جن فقہاء نے اسی صورت میں تراویح کو مع الکراہۃ جائز کہا ہے، ان کی مراد کراہت تحریمیہ ہے، کیونکہ اطلاقِ کراہۃ بلا قید اسی کو مقتضی ہے واللہ اعلم، ۲۱ ر ذیقعدہ ۴۷ھ

تراویح میں ختمِ قرآن کا ثبوت

سوال (۲۶) ختم قرآن تراویح رمضان میں یا غیر اس کے نبی آخر الزمان یا زمان شیخان رض (علیہم الصلوٰۃ والرضوان) میں ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ترتیب عثمانی پر یا کسی اور طرح پر؟

الجواب، تراویح میں ختمِ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً ثابت نہیں، اور نہ حضرت صدیق رض سے صراحۃً ثابت ہے، ہاں حضرت عمر رض سے ثابت ہے، کہ انھوں نے حضرت ابی بن کعب رض کو بلایا کہ سب لوگ قرآن نہیں پڑھ سکتے، میں چاہتا ہوں کہ تم سب کو رمضان کی راتوں میں نماز پڑھا دیا کرو، اور ظاہر ہے کہ صحابہ میں کوئی شخص بھی قدر قلیل قرآن سے عاری نہ تھا، پس اس کے معنی سوا اس کے کچھ نہیں کہ حضرت عمر رض کی مراد یہ تھی کہ لوگ پورا قرآن نہیں پڑھ سکتے، نیز حضرت عمر رض و حضرت عثمان رض کے

زمانہ میں تراویح اتنی دیر میں ختم ہوتی تھی کہ بعض لوگ لاٹھی پر سہارا لیتے اور سحری کے فوت ہوجانے کا اندیشہ کرتے تھے، اور بعادتِ غالبہ اتنی دیر جب ہی ہوسکتی ہے کہ امام قرآن ختم کرنا چاہتا ہو، اور حضرت عائشہ رضؓ کا غلام رمضان کی راتوں میں قرآن دیکھ کر نماز پڑھاتا تھا، (یعنی نماز سے پہلے یا نماز کے بعد قرآن دیکھ لیا کرتا تاکہ نماز میں بھول نہ ہو ۱۲) اور یہ بھی جب ہی ہوسکتا ہے جبکہ ختم قرآن کا اہتمام ہو، ورنہ وہی سورتیں پڑھتا جو خوب یاد تھیں، یہ تمام دلائل اس امر کے ہیں کہ صحابہ کو تراویح رمضان میں ختم قرآن کا اہتمام تھا صحابہ کے اس اہتمام سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رمضان میں قرآن ختم کرتے ہوں گے، گو صراحۃً حدیثوں میں اس کا ذکر نہیں، بہر حال مسئلہ ظنیہ میں دلالت ظنیہ بھی کافی ہے، گو معارض پر حجت نہ ہو، خصوص جبکہ اس کے پاس بھی دلائل ہوں، پھر امام ابوحنیفہ رحؒ نے ایک ختم کو سنت فرمایا ہے، اور وہ تابعی ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سلف کو اس کا اہتمام کرتے دیکھا اور سُنا ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم، والبسط فی رسالتنا اعلاء السنن، ۵ رشوال ۴۷ھ

تراویح کی بیس رکعت کا ثبوت

سوال (۲۷) تراویح میں حضورؐ کا ایک دو دفعہ مسجد میں آنا معلوم ہے، اور آٹھ تراویح پڑھانا، ایا باقی تمام رمضان گھر میں گذارا تھا؟ اور بیس کا ثبوت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے یا نہیں؟

الجواب: ہاں حضورؐ نے جماعت کے ساتھ صلوٰۃ تراویح بجز معدودے چند راتوں کے نہیں پڑھیں، اور اس کی وجہ بھی بتلادی کہ یہ نماز اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے، مجھے اس کا التزام کرنے میں اندیشہ ہے کہ یہ فرض نہ ہوجائے، پس ہر شخص اپنے گھر میں پڑھ لیا کرے، اس سے ظاہر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھر میں ضرور پڑھتے ہوں گے، اور ابن عباس رضؓ سے صاف طور سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی راتوں میں بیس رکعات پڑھتے تھے، رواہ ابن ابی شیبہ وسندہ حسن کما ذکرتہ فی الاعلاء، واللہ تعالیٰ اعلم

۵ رشوال ۴۷ھ،

نماز تراویح میں ایک غلطی کا حکم

سوال (۲۸) اگر کوئی شخص دو رکعت نماز تراویح کی نیت باندھے اور بھول کر تین رکعت پڑھ گیا تو اس کو نماز دُہرانی چاہیے؟ ایسی حالت میں کہ سجدۂ سہو بھی نہ کیا ہو اور تین رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا، اور اوّل ارادہ کیا تھا کہ دو پڑھوں گا،

(۲) اگر تین پڑھنے کے بعد یاد آیا کہ پڑھنی تھی دو اور تین پڑھ چکا اور پھر وہ چار پوری کرے تو اس کی چار رکعتیں ہوئیں یا نہیں، مفصّل طریق سے آگاہی بخشیں ....

....

الجواب: (۱) جو شخص تراویح میں بھول کر تین رکعت پڑھ جاوے، اور سجدہ سہو نہ کرے اس کو دوبارہ دو رکعت تراویح کا اعادہ کر لینا چاہیئے،

(۲) اگر دوسری رکعت پر قعدہ کیا تھا تب تو یہ چاروں رکعت تراویح شمار ہوں گی، اور اگر دو رکعت پر قعدہ نہیں تو یہ چاروں رکعت فقط دو رکعت کے قائم مقام ہوں گی، کما فی العالمگیریہ (ص ۵۷ ج ۱) فان اضاف الیھا رکعۃ اخریٰ کانت ھذہ الاربعۃ عن تسلیمۃ واحدۃ وان قعد فی الثانیۃ قدر التشھد اختلفوا فیہ فعلیٰ قول العامۃ یجوز عن تسلیمتین وھو الصحیح ھکذا فی فتاویٰ قاضی خان،

احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ

بشرط ختم قرآن ماہِ رمضان میں نماز پنجگانہ پڑھانے کے لئے امام کے تقرر کا حکم،

سوال (۲۹) ایک صاحب نے ایک مستند عالم سے بذریعۂ تحریر دریافت کیا کہ تراویح ماہ رمضان میں قرآن باجرت پڑھوانا اور سماعت کرنا ایسے قرآن کے متعلق علماء کا کیا حکم ہے، عالم موصوف نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ اجرت پر تراویح میں قرآن پڑھوانا اور سماعت کرنا ناجائز ہے، مگر امام مسجد اجرت پر مقرر کر کے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے، اب اُن صاحب نے جنھوں نے یہ فتویٰ حاصل کیا تھا بمشورۂ دو تین اصحاب کے جن میں سے کوئی شخص عالم نہیں ہے، اپنی رائے سے حسبِ فتویٰ آخر الذکر یعنی تقرر امام کے ایک حافظ کو پچیس روپے اجرت پر صرف ماہِ مبارک کے واسطے یعنی رویتِ ہلال ماہِ رمضان سے رویت ہلال ماہ شوال تک بہ حیثیت امام مقرر کیا کہ وہ پانچوں وقت کی نماز بہ حیثیت امام مسجد پڑھایا کریں، لیکن نماز تراویح میں ایک یا سوا پارہ پڑھا کریں حافظ نے اس شرط کو منظور کر لیا، یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جب تراویح میں قرآن شریف پڑھانا مشروط ہے تو جواز کی گنجائش کس طرح ہو سکتی ہے، اگر یہ شرط نہ ہوتی بلکہ فقط امام مسجد مقرر کرتے اور قرآن شریف اپنی خوشی سے بلا کسی معاوضہ کے پڑھاتے تو جائز ہو سکتا تھا، احقر عبد الکریم عفی عنہ

نوٹ: یہ جواب اس وقت ہے کہ یہ شرط صلب عقدا جارہ میں ہو، اور اگر خارج عقد محض وعدہ ہے تو مضائقہ نہیں، فقط الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۱۵ رمضان ۴۸ھ

تراویح میں تکرار قل ہو اللہ الخ

سوال (۳۰) تراویح میں ایک رکعت میں تین مرتبہ سورہ قل ہو اللہ احد مع بسم اللہ ختم قرآن شریف پر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، تکرار قل ہو اللہ ختم کے وقت فی نفسہ تو مباح ہے، مگر جہاں اس کو لازم سمجھتے ہوں کہ اس کے بغیر ختم کو ناقص سمجھتے ہوں وہاں نہ کرنا چاہئے، ۲۸ ر رمضان ۴۸ھ

فصل فی ادراک الفریضۃ

ادراک فریضہ کے متعلق بہشتی گوہر کے ایک مسئلہ پر شبہ کا جواب۔

سوال (۱) بہشتی گوہر میں جماعت میں شامل ہونے کے مسائل ہیں، اس میں مغرب کے وقت دوسری رکعت کا سجدہ کرلیا ہو تو دو رکعت پہ سلام پھیر دے، مگر عالمگیریہ و درمختار میں لکھا ہے کہ نماز کو پوری کرلے؟

الجواب: صحیح یہی ہے کہ اگر مغرب کی دوسری رکعت کا سجدہ کرچکا ہو تو سلام نہ پھیرے، بلکہ نماز تنہا ہی پوری کرے، اور جماعت میں شامل نہ ہو کما فی الشامی ص ۶۴۵ ج ۱ وان فی غیر رباعی قطع واقتدی مالم یسجد للثانیۃ فان سجد اتم ولم یقتد اھ وھکذا فی العالمگیریۃ، اور بہشتی گوہر میں جو اس کے خلاف ہے وہ دراصل اس کے ماخذ یعنی علم الفقہ کی غلطی ہے، اور سوال میں جو عبارت بہشتی گوہر کی طرف منسوب کی ہے وہ عبارت اس کی نہیں ہے، نقل میں احتیاط لازم ہے، فقط احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ، ۹ ر شوال ۴۳ھ

فصل فی قضاء الفوائت

ایک دن رات اگر بیہوش رہے تو نمازوں کی قضا واجب نہیں

سوال (۱) زید اگر اچھا خاصا کسی وجہ سے ایک دن رات سے زیادہ بیہوش ہوجاوے تو نماز قضا پڑھنا واجب ہے یا نہیں، اور اس بیہوشی کی حالت میں کوئی کام خلاف شریعت ہوجاوے تو زید کو ایسی حالت میں گناہ ہوا یا نہیں؟

الجواب؛ اگر ایک دن رات سے زیادہ بیہوش رہے تو ان نمازوں کی قضا واجب نہ ہوگی، اور بیہوشی کی حالت میں اگر کوئی کام خلافِ شرع ہو جاوے گناہ بھی نہ ہوگا، واللہ اعلم، ۲۶ رجب

حکم قضا نماز سد رسالہ بطریقۂ خاص

سوال (۲) ایک رسالہ میں لکھا ہے جس کی سو سال کی نمازیں قضا ہوگئی ہوں تو پانچ رکعت پڑھے، بعد سورۂ فاتحہ کے سورۂ اخلاص سات بار پڑھے تو نماز اس کی سو سال کی ادا ہو جائے گی، یہ صحیح ہے یا کہ نہیں؟

الجواب، بالکل غلط ہے، ۲۷ رشوال ۴۴ھ

بغیر وصیت کے کوئی وارث اپنے مال سے قضا نمازوں کا فدیہ ادا کرے تو میت کے ذمہ سے نمازیں ساقط ہو جاویں گی یا نہیں؟

سوال (۳) میت کے بغیر وصیت اگر کوئی وارث اپنے مال سے اس کے روزے اور نمازوں کا فدیہ ادا کر دے تو کیا میت کے ذمہ سے وہ ساقط ہو جاوینگے،

الجواب؛ ہاں اللہ تعالیٰ سے امید یہی ہے کہ معاف فرمادیں گے، ۲۴ ر ج ۲ ۴۷ھ

استفتاء متعلق فدیۂ نماز

سوال (۴) زید کا لڑکا عمر وانتقال کر گیا جس کے ذمہ کچھ نمازیں قضا تھیں، اب زید پچیس روپے ان نمازوں کے فدیہ میں دینا چاہتا ہے فدیہ ادا ہو جاویگا یا نہیں، اور اس فدیہ کے دینے کا کیا طریقہ ہوگا، یعنی ایک محتاج کو اگر کل پچیس روپے دیدیئے جاویں جسکو سخت حاجت ہے، تو فدیہ ادا ہو جاوے گا یا نہیں، یا ضروری ہے کہ ایک صاع گیہوں کی قیمت روزانہ ایک فقیر کو یا پچیس روپے میں جتنے صاع بن سکیں، اتنے فقیروں کو ایک ہی روز میں دیا جاوے، غرض کہ ادائیگی کی کیا صورتیں ہوں گی، اور کونسی بہترین صورت ہوگی، بینوا توجروا؟

الجواب؛ اگر پچیس روپے کی رقم کفارہ کی صلوات کے لئے کافی ہے تو اس رقم کو فقراء میں تقسیم کر دیا جاوے، جس میں روایات مختلف ہیں، ایک یہ کہ ایک مسکین کو سب دیدینا بھی جائز ہے، اور ایک یہ کہ ایک مسکین کو نصف صاع سے زائد دینا جائز نہیں، ای لایجزیہ الا عن صوم او صلوٰۃ وحدہما، اسی طرح ایک مسکین کو نصف صاع سے کم دے تو جائز ہے یا نہیں اس میں بھی اختلاف ہے، پس احوط تفریق ہے اور تفریق میں بھی احوط یہ ہے کہ ایک مسکین کو نصف صاع سے کم نہ دے نہ زائد دے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مسکین کو روزانہ ایک صلوٰۃ یا ایک صوم کا فدیہ دیتا رہے، اس طرح وہ مسکین واحد بحکم متعدد ہو جاوے گا،

قال ابن عابدین فی رسائلہ قولہ وبلا تعدد فقیر ای بخلاف نحو کفارۃ الیمین

للنص فیہا علی النعل فلو اعطی ھذا مسکینا صاعا عن یومین جاز لکن فی البحر عن القنیۃ ان عن ابی یوسف فیہ روایتین وعند ابی حنیفۃ لا یجزیہ کما فی کفارۃ الیمین وعن ابی یوسف لو اعطی نصف صاع من بر عن یوم واحد لمساکین یجوز قال الحسن وبہ ناخذ اھ ومثلہ فی القہستانی (ص ۲۱۷)

اور اگر پچیس روپے کفارہ کو کافی نہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ ایک مسکین سے کہا جائے کہ اس رقم میں سے کچھ تم کو بھی دیا جائے گا بشرطیکہ تم اس کل روپے کو فدیہ میں لے کر پھر ہم کو ہبہ کر دو، اور اسی طرح بار بار فدیہ میں لیتے رہو، اور ہبہ کرتے رہو، مگر اس کے لئے فہیم شخص کی ضرورت ہے، جو فدیہ میں لے کر اپنے کو مالک صحیح سمجھ لے، پھر خوشی سے ہبہ کر دے اسی طرح جب وہ ہبہ کرتا ہے اور آپ فدیہ میں دیتے رہیں تو شمار کثیر کے بعد دیکھ لیا جائے کہ مسکین کے پاس بقدر کفارہ رقم پہونچ گئی یا نہیں، جب پہونچ جائے تو پھر اخیر میں اس سے بطور ہبہ کے یہ رقم لے کر بطریق مذکور تقسیم کر دی جائے، فعملنا بالضرورۃ علی احدی الروایتین وعلی الثانیۃ فیما لا ضرورۃ فیہ الی اعطاء الواحد کلہ، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲ ر ذی قعدہ ۴۷ھ

جس کے ذمہ چھ یا اس سے زائد نمازیں ہوں تو اس پر ترتیب واجب نہیں،

سوال (۵) اگر کسے را نماز یکماہ یا زیادہ فوت شود، ترتیب در فوائت ساقط شود یا نہ، یعنی ایں قضاء فوائت در وقت معین نیست بجز اوقات مکروہہ ہر گاہ خواہد در یک روز یا چند روز از ذمہ خود فوائت را قضا کند بلا رعایت تقدیم وتاخیر در فوائت، چنانچہ نوشتہ لیس للقضاء وقت معین بل جمیع اوقات العمر وقت لہ، وبعض گویند از فوائت مذکورہ اولا فجر یکماہ پس ظہر پس عصر پس مغرب پس عشاء، دگر نہ ادا نہ خواہد شد وبعض گویند ہر یکے را از فوائت بوقت ادا کردہ باشد تا دشوار نگردد، حکمش چیست؟

الجواب: صحیح یہی ہے کہ جس کے ذمہ چھ نمازیں یا اس سے زائد قضا ہوں اس کو ان کی قضاء میں تقدیم وتاخیر وغیرہ کا اختیار حاصل ہے، ہاں بہتر یہ ہے کہ ترتیب سے ادا کرے باقی یہ ضرور نہیں کہ ہر نماز کے ساتھ ایک ہی نماز پڑھے، بلکہ اگر سب ایک ہی وقت یا ایک ہی دن میں پڑھ سکے، تو جتنی جلدی فارغ ہو جائے وہی اچھا ہے، ۶ ر رمضان ۴۸ھ

قضا نماز و روزہ کا کفارہ اور فوت شدہ نمازوں کی تعیین کا حکم جبکہ صحیح تعداد معلوم نہ ہو

سوال (۶) میت نے وصیت کی ہے کہ روزہ اور نماز کا کفارہ دیدیا جاوے، مگر تعداد روزہ تو نو معلوم

ہے، قضا نمازوں کی تعداد یاد نہیں، میت کا بیٹوں پر تبرعاً کفارہ دینا چاہئے اور اپنے پاس سے نہ کہ ترکہ متوفی سے کہ ضرورت اجازت ورثاء ہو، عمر میت ۵۴ سال تھی، اب یہ دریافت طلب ہے کہ کس قدر غلہ یا نقد کفارہ میں مساکین کو دیا جاوے، واضح باد کہ مسماۃ تارکِ نماز نہیں تھی مگر کبھی قضا ہو جاتی تھی۔

الجواب: میت نے وصیت کی ہے تو میت کے مال میں سے کفارہ ادا کیا جاوے ترکہ کی تہائی تک تو کفارہ میں بدون کسی وارث کی اجازت کے دے سکتے ہیں، اور تہائی ترکہ میں ادا نہ ہو سکے، تو اس سے زائد بالغ ورثہ کی اجازت سے اُن کے مال میں سے دیویں، نابالغ وارث کے مال میں سے ہرگز نہ دیں، اور مقدار کفارہ کی ہر روزہ کے عوض صدقۂ فطر کے برابر ہے، اور اسی طرح ہر نماز کے لئے صدقۂ فطر کے برابر غلہ وغیرہ دیا جاوے، اور ہر روز کی چھ نمازیں شمار کی جاویں، پانچ فرض اور ایک وتر، اور نمازوں کی تعداد میں ظنِ غالب کا اعتبار کریں۔
احقر عبدالکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ ۱۲ ر صفر ۴۵ھ

میت کی طرف سے قضا نمازیں ادا کرنے کا حکم

سوال (۷) ایک شخص نے ایک بیٹا چھوڑ کر انتقال کیا، اور دس وقت نماز قضا کیں، اب یہ بیٹا نماز پڑھ کر ادا کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: نمازیں قضا کر دینے سے فرض نمازیں میت کے سر سے نہ اتریں گی البتہ فدیہ دیدیا جاوے، یعنی ہر روز کی پانچ نمازوں اور ایک وتر کی بابت تین صاع فدیہ دیدیں تو امید ہے کہ قبول ہو جاوے گا، اور اگر فدیہ کی میت نے وصیت کی ہو تو ثلث ترکہ میں سے جس قدر فدیہ نکل سکے اس کا نکالنا واجب ہے، والسلام کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ ۱۵ ر ج ۲ ۴۵ھ

قضا نماز جماعت سے ہو سکتی ہے یا نہیں

سوال (۸) اگر چند شخصوں کی کوئی نماز قضا ہو جائے تو جماعت سے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: قضا میں بھی جماعت ہو سکتی ہے، اور یہ قضا نماز جہریہ کی ہے تو جہر کرنا ضروری ہے، اور سریہ کی ہے تو قرأت سراً پڑھنا لازم ہے، مثلاً عشاء کی نماز اگر دن کو قضا پڑھے تب بھی امام کو جہر کرنا چاہئے، کما فی العالمگیریہ (ص ۴۵ ج ۱) اذا ترک صلوٰۃ اللیل ناسیا فقضاھا فی النھار وام فیھا وخافت کان علیہ السھو وان ام لیلاً فی صلوٰۃ النھار یخافت ولا یجھر فان جھر ساھیاً کان علیہ السھو کذا فی فتاویٰ قاضی خاں فی سجود السھو، اگر قصداً اس کے خلاف کیا تو نماز کا اعادہ واجب ہے، اور

سہواً کیا تو سجدۂ سہو واجب ہے، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۳ر شعبان ۴۵ھ

فصل فی سجود السّہو

سلام پھیر دینے کے بعد سجدۂ سہو یاد آیا تو کیا کرے؟

سوال (۱) ایک شخص کی نماز میں سہو واقع ہوا، اور اُسے پھر اُس کا خیال نہ رہا اور سلام پھیر دیا، سلام کے بعد ہی پھر اُسے خیال آیا تو اس نے سجدۂ سہو کا اعادہ کیا، اس صورت میں اس کی نماز درست ہوئی یا نہیں، اور نیز اس کا سجدۂ سہو؟

الجواب: اگر سلام کے بعد بات چیت کرنے اور مسجد سے نکلنے سے پہلے سجدۂ سہو کرلیا تو نماز درست ہوگئی، اور اگر مسجد سے نکل کر یا کلام کرکے سجدۂ سہو کیا، تو نماز دوبارہ پڑھنی چاہئے، قال فی الخلاصۃ وان سلم وھو لا یرید ان یسجد لسھوہ لم یکن تسلیمہ ذلک قطعاً حتی لو بدا..... لہ ان یسجد وھو فی مجلسہ ذلک قبل ان یقوم وقبل ان یتکلّم فانہ یسجد سجدتے السھو فان تکلّم او خرج من المسجد لا یاتی بھما (ص ۱۷۳ج ۱) واللہ اعلم، ۶ر جمادی الاولیٰ ۴۰ھ

القول الحری فی مسئلۃ السجود والتحری (بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر اشکال کا جواب)

سوال (۲) ان حکمکم بعدم وجوب سجود السھو علی من تحری عند کثرۃ شکہ فی تعداد الرکعات فعمل بما یوافقہ التحری من الصّواب قد اشتبہ علینا امرہ فان ھذا الحکم مخالف للکتب الموجودۃ عند الفقیر کالمختصر الضروری حاشیۃ القدوری وکنوز الحقائق شرح کنز الدقائق وشرح منیۃ المصلّی المسمّٰی بالکبیری وکتاب الاٰثار وعبارتہ ھکذا محمد قال اخبرنا ابو حنیفۃ عن حماد عن ابراھیم فیمن نسی الفریضۃ فلا یدری اربعاً صلّٰی ام ثلثا قال ان کان اوّل نسیانہ اعاد الصلوٰۃ وان کان یکثرۃ النسیان یتحری الصواب وان کان اکبر رایہ انہ اتم الصلوٰۃ سجد سجدتی السھو وان کان اکبر رایہ انہ صلّٰی ثلثا اضاف الیھا واحدۃ ثم سجد سجدتی السھو قال محمد وبہ ناخذ وھو قول ابی حنیفۃ وھکذا عبارۃ بذل المجھود فی حل ابی داؤد وناطقۃ بوجوب السجود علی من یعمل بالظن ولم انقل عبارتہ لضیق

المقام ومعنیٰ اان العمل با لظن عند عروض الشك النقص من العمل بالیقین عند عدم عروضه والنقصان فی الفرائض والواجبات موجب لسجود السهو فان الواجب علینا ان نخرج عن عهدة الفرض والواجب علیٰ سبیل التیقن حتی الامکان والا مصیر نا الیٰ جابر یمکن فما وجه قولکم بعدم وجوب السجود علیٰ من یعمل بالظن فی بهشتی زیور وعبارته هکذا،

"اگر شک کرنے کی عادت ہو اور اکثر ایسا شبہ پڑ جاتا ہے تو دل میں سوچ کر دیکھے کہ دل زیادہ کدھر جاتا ہے، اگر زیادہ گمان تین رکعات پڑھنے کا ہو تو ایک اور پڑھ لے اور سجدۂ سہو واجب نہیں، الی آخرہ فالمرجو من الحضرة العالیة ان تمن بالجواب الشافی والوجہ الکافی،

الجواب المجمل : بہشتی زیور میں جو عمل بالتحری کی حالت میں عدم وجوب سجدۂ سہو مذکور ہے، اس کی دلیل شامی (ص ۷۰۹ ج ۱) باب سجود السہو کے اخیر میں اور بدائع (ص ۱۶۴ و ۱۶۵ ج ۱) و بحر (ص ۱۱۱ ج ۲) اور عالمگیری مصطفائی (ص ۸۴ ج ۱ سطر ۶) میں مسطور ہے، اس صورت میں اس کو حکم سے تعبیر کرنا جور محض ہے جس سے احتیاط لازم ہے، ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل بالتحری مطلقاً موجب سجود سہو نہیں بلکہ جب بقدر اداء رکن تاخیر کو مستلزم ہو جائے، اس وقت موجب سہو ہے اور اس قدر تاخیر کی صورت میں سجدۂ سہو کا واجب ہونا بحالت تحری بہشتی زیور میں بھی باب سجدۂ سہو مسئلہ عاشرہ میں مذکور ہے، اور بذل المجہود میں بھی (ص ۹۴ ج ۲) کے اندر بدائع سے یہی نقل کیا ہے اگو اولاً نووی وغیرہ سے اطلاق نقل کیا ہے، اور کبیری و کتاب الآثار میں جو عمل بالتحری کو مطلقاً موجب سہو لکھا ہے، اس کا مبنیٰ یہ ہے کہ عروض شک کے بعد تحری کرنا عادۃً تاخیر قدر رکن کو موجب ہو ہی جاتا ہے، یہ مطلب نہیں کہ اگر تاخیر نہ ہو جب بھی سجدۂ سہو واجب ہی، کیونکہ فکرِ قلیل سے احتراز غیر ممکن ہے، تو دفع حرج کے لئے فکرِ قلیل کا عفو ہونا لازم ہے، ۲۹ ربیع الاول ۴۵ھ

الجواب المفصّل : (اقول وباللہ التوفیق) قال فی الدر واعلم انه اذا شغله ذلك الشك فتفکر قدر اداء رکن ولم یشتغل حالة الشك بقراءة و لا تسبیح وجب علیه سجود السهو فی جمیع صور الشك سواء عمل بالتحری

اوبنی علی الاقل فتح لکن فی السراج انہ یسجد للسہو فی اخذ الاقل مطلقاً (ای سواء تفکر قدر رکن اولا ۱۲ شامی) وفی غلبۃ الظن ان تفکر قدر رکن اھ، قال الشامی قولہ لکن فی السراج الخ استدراک علی ما فی الفتح من لزوم السجود فی الصورتین وھذا التفصیل ھو الظاھر لان غلبۃ الظن بمنزلۃ الیقین فاذا تحری (...........) وغلب علی ظنہ شیٔ لزمہ الاخذ بہ ولا یظھر وجہ لایجاب السجود علیہ الا اذا طال تفکرہ علی التفصیل المار بخلاف ما اذا بنی علی الاقل لان فیہ احتمال الزیادۃ کما افادہ فی البحر اھ (ص ۴۹۶ ج ۱) وتعقب علیہ فی التحریر المختار بان کلام الفتح فی وجوب سجود السہو للتفکر قدر اداء رکن ولا شک انہ فی جمیع صور الشک، وان کان یجب السجود اذا بنی علی الاقل مطلقا لا لخصوص الشغل بل لہ ان وجد ولاحتمال الزیادۃ اھ (ص ۱۰۳ ج ۱) قلت کون کلام الفتح مقید الیقید التفکر قدر اداء رکن انما یظھر من کلام الدر واما کلامہ فی فتح القدیر فمطلق عنہ ونصہ قالوا اذا شک فی الفجر ان التی ھو فیھا اولی او ثانیۃ تحری فان وقع تحریہ علی شیٔ اتم الصلوٰۃ علیہ وسجد للسہو وکذا فی جمیع صور الشک اذا عمل بالتحری او بنی علی الاقل یسجد اھ (ص ۳۵۳ ج ۱) ولذا قال فی البحر ولم یذکر المصنف سجود السہو فی مسائل الشک تبعا لما فی الھدایۃ وھو مما لا ینبغی اغفالہ فانہ یجب السجود فی جمیع صور الشک سواء عمل بالتحری او بنی علی الاقل کذا فی فتح القدیر وترک المحقق قیدا لابد منہ مما لا ینبغی اغفالہ وھو ان یشغلہ الشک قدر اداء رکن ولم یشتغل حالۃ الشک بقراءۃ ولا تسبیح کما قدمناہ اول الباب لکن ذکر فی السراج ان فی فصل البناء علی الاقل یسجد للسہو (مطلقا) وکانہ فی فصل البناء علی الاقل حصل النقص مطلقاً باحتمال الزیادۃ فلابد من جابر وفی الفصل الثانی النقصان بطول التفکر لا بمطلقہ اھ ملخصاً (ص ۱۱۱ ج ۲) والعجب من مؤلف العالمگیریۃ انہ کیف نقل عن البحر کلام الفتح وترک القید الذی نبہ علیہ مؤلف البحر وزادہ علی کلام الفتح مع انہ نقل عن

عہ ای التحری والبناء علی الاقل ۱۲

المحیط بعد ذلک ما یفید اعتبار ھذا القید و نصہ و اذا شک فی صلوٰتہ فلم یدر اثلاثا صلی ام اربعا و تفکر فی ذلک کثیرا ثم استیقن انہ صلی ثلث رکعات فان لم یکن تفکرہ شغل عن اداء رکن بان یصلی و یتفکر فلیس علیہ سجود السہو وان طال تفکرہ حتی شغلہ عن رکعۃ او سجدۃ او یکون فی رکوع و سجود فیطول تفکرہ فی ذلک و تغیر عن حالہ بالتفکر فعلیہ سجود السہو استحسانا ھکذا فی المحیط اھ (ص ۱۲۸ ج ۱) وھذا کلہ یدل علی ان التحری لا یوجب السجود ما لم یطل التفکر، فان التحری ای غلبۃ الظن لہ حکم الیقین فی العملیات و علیہ بناء وجوب العمل بخبر الواحد المفید للظن و بالقیاس فیما لا نص فیہ و ھذا ظاھر لمن نظر فی الاصول فاندحض بہ قول السائل ان العمل بالظن عند عروض الشک انقص من العمل بالیقین عند عدم عروضہ والنقصان فی الفرائض والواجبات موجب لسجود السہو الخ فانا لا نسلم ان مطلق النقصان موجب لسجود السہو والا فلا شک ان الصلوٰۃ الخالیۃ عن الوساوس والخطرات اکمل مما اشتمل علیہا فھل یجب سجود السہو من عروض الوسوسۃ والخطرۃ فی الصلوٰۃ لکونہا انقص مما لا تشتمل علیہا کلا، بل النقصان الموجب لہ ما کان من جنس ترک الواجب او تاخیرہ عن محلہ و لیس فی العمل بالظن ترک الواجب ولا تاخیرہ ولا یجب علینا ان نخرج عن عھدۃ الفرض والواجب علی سبیل التیقن فانہ لا سبیل الی ذلک اصلاً بل غلبۃ الظن بہ کاف فان التیقن بطھارۃ الماء الذی یتوضأ بہ والمکان الذی یصلی فیہ والثوب الذی یستر بہ البدن متعذر عسیر جداً وکذا التیقن بصحۃ صلوٰۃ ادیناھا قبل الصلوٰۃ التی نحن فیہا لا یتیسر اصلاً وصحۃ البعدیۃ متوقفۃ علی صحۃ القبلیۃ فلو کان الخروج عن عھدۃ الفرض علی سبیل التیقن واجباً لم نقدر علی اداء صلوٰۃ اصلا فالواجب انما ھو الخروج عن العھدۃ علی سبیل الظن الراجح لاغیر،

وبعد ذلک فنقول ان مسئلۃ بہشتی زیور متأیدۃ بقول الدر والشامی (ص ۶۹۰ ج ۱) وبقول البحر (ص ۱۱۱ ج ۲) و بما ذکر فی العالمگیریۃ عن المحیط

(ص ۴۸۴ ج ۱) ففی هذه الاقوال کلها تصریح بعدم ایجاب التحری السجود الا اذا طال التفکر فیه وقد صرح بذلک ای وجوب السجود فی التحری اذا طال لتفکر فی بہشتی زیور ایضا فی المسئلۃ العاشرۃ من باب سجود السهو ونصّہ،

اگر بالکل اخیر رکعت میں التحیات اور درود پڑھنے کے بعد شبہ ہوا کہ میں نے تین رکعتیں پڑھی یا چار اسی سوچ میں خاموش بیٹھی رہی اور سلام پھیرنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ اتنی دیر میں تین دفعہ سبحان اللہ کہہ سکتی ہے، پھر یاد آ گیا کہ میں نے چاروں رکعتیں پڑھ لی ہیں، تو اس صورت میں بھی سجدہ سہو کرنا واجب ہے (ص ۲۷۵ طحطاوی علی مراقی الفلاح)

ومعنی قول بہشتی زیور فی مسئلۃ الحادیۃ والعشرین، اگر زیادہ گمان تین رکعت پڑھنے کا ہو تو ایک رکعت اور پڑھ لے اور سجدۂ سہو واجب نہیں ہے، اور اگر زیادہ گمان یہی ہے کہ میں نے چاروں رکعتیں پڑھ لی ہیں تو اور رکعت نہ پڑھے اور سجدۂ سہو بھی نہ کرے، اھ یعنی جبکہ اس سوچنے میں بقدر تین مرتبہ سبحان اللہ کے دیر نہ ہو، جس کی دلیل مسئلہ عاشر ہے کہ وہاں اتنی مقدار تفکر کو موجب سجدۂ سہو صراحۃً کہدیا گیا ہے، تو مسئلہ نمبر ۲۱ میں سجدۂ سہو کا واجب نہ ہونا اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ تفکر میں بقدر تین مرتبہ سبحان اللہ کے دیر نہ ہو، اور اس صورت میں تحری کا موجب سجود نہ ہونا، درمختار و شامی و تحریر مختار و بحر و عالمگیری کی تصریح سے ثابت ہو چکا، کما مر وهذا القدر کاف لصحۃ المسئلۃ المذکورۃ فیه لان المؤلف انما التزم فیه کون المسئلۃ منقولۃ عن کتاب معتبر من کتب الفقۃ لا غیر، واما ان ذلک معارضٌ بما فی المعتصر الضروری حاشیۃ القدوری وکنوز الحقائق شرح کنز الدقائق وبذل المجهود فالجواب عنه ان هذه لیست من کتب الفتاوی المعوّل علیها فی الافتاء کما لا یخفی مع ان بذل المجهود فیه تصریح بعدم ایجاب التحری سجود السهو الا اذا طال التفکر فیه ونقل عن البدائع (ص ۱۴۹ ج ۲) ونص البدائع واما بیان سبب الوجوب فسبب وجوبه ترک الواجب الاصلی فی الصلوٰۃ او تغییرہ او تغییر فرض منها عن محله الاصلی ساهیًا لان کل ذلک یوجب نقصانا فی الصلوٰۃ فیجب جبرہ بالسجود ویخرج علی هذا الاصل مسائل الی ان قال وعلی هذا اذا شک فی شیٔ من صلاته فتفکر فی ذلک حتی استیقن وهو علی وجهین اما ان طال تفکرہ بان کان مقدار

ما یمکنہ ان یؤدی فیہ رکنا من ارکان الصلوٰۃ کالرکوع والسجود ولم یطل فان لم یطل تفکرہ فلا سہو علیہ لانہ اذا لم یطل لم یوجد سبب الوجوب الاصلی وھو ترک الواجب او تغییر فرض او واجب عن وقتہ الاصلی ولان الفکر القلیل مما لا یمکن الاحتراز عنہ فکان عفوا دفعا للحرج وان طال تفکرہ فکذلک فی القیاس وفی الاستحسان علیہ السہو وجہ القیاس ان الموجب للسہو تمکن النقصان فی الصلوٰۃ ولم یوجد لان الکلام فیما اذا تذکر انہ اداھا فبقی مجرد الفکر وانہ لا یوجب السہو کالفکر القلیل وجہ الاستحسان ان الفکر الطویل مما یؤخر الارکان عن اوقاتھا فیوجب تمکن النقصان فی الصلوٰۃ فلا بد من جبرہ بسجدتی السہو بخلاف الفکر القصیر اھ ملخصا (ص ۱۶۴ و ۱۶۵ ج ۱)

قلت وھذا النص صریح فی ان التفکر والعمل بالظن الغالب لا یوجب سجود السہو کما فی بہشتی زیور الا اذا طال التفکر قدر ما یمکن فیہ اداء رکن قال سیدی الخلیل دام علاہ فی بذل المجھود والحدیث (ای حدیث ابی سعید وابن مسعود عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا کنت فی صلوٰۃ فشککت فی ثلاث او اربع واکبر ظنک علی اربع تشھدت ثم سجدت سجدتین وانت جالس قبل ان تسلم ثم تشھدت ایضا ثم تسلم) وان کان مطلقا لکنہ مخصوص ببعض الصور وقد ثبت عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ لبس الخمیصۃ التی لھا اعلام فقال اذھبوا بھا الی ابی جھم وأتونی بانبجانیتہ فانھا الھتنی وفی بعض الروایات شغلتنی عن صلوٰتی وروی عن عمر بن الخطابؓ عند البیہقی انی لاحسب جزیۃ البحرین وانا قائم فی الصلوٰۃ (وعلق عنہ البخاری اجھز جیشی وانا فی الصلوٰۃ ۱۲) فوقع التفکر فی ھذہ الصور ولم یثبت انھما سجدا فدل ذلک علی ان مطلق التفکر لا یوجب السجود اھ بمعناہ (ص ۱۴۹ ج ۲) وحاصلہ ان ما ورد فی الحدیث من الامر بسجود السہو عند العمل باکبر رأیہ مطلقا لیس علی اطلاقہ بل مقید بطول التفکر فیہ لتعذر الاحتراز عن قلیلہ والحرج مدفوع بالنص ولعل وجہ ورود الحدیث علی صیغۃ الاطلاق ان عروض الشک فی مقدار الرکعات وتحری الصواب فیہ

لایخلو فی العادة الغالبة عن طول التفکر قدر ما یؤدی فیه رکن وقصره نادر و النادر کالمعدوم فبنی الکلام علی العادة الغالبة وامر بالسجود وعند التحری مطلقا لاسیما اذا نظرنا الی الاختلاف الواقع بین الائمة فی تحدید ادنی زمان یمکن فیه اداء رکن فعند الامام مقدر بسبحان الله مرة لکونه قد رأیة قصیرة وهی ثم نظر قال الطحطاوی علی الدر قوله قدر اداء رکن ظاهره ولو بلا سنة وهو مقدر بسبحان الله اھ (ص ۳۰۵ ج ۱)

وقال الطحطاوی ایضا فی حاشیته علی مراقی الفلاح قوله زمن یسع اداء رکن والمراد انه یسعه بسنته وهو قدر ثلث تسبیحات وهذا مذهب الثانی و هو المختار کما فی الدر اھ (ص ۱۹۶) ولا یخفی ان الشك وتحری الصواب فیه لا یخلو عن التفکر بقدر سبحان الله مرة غالبًا فیجب السجود عند الامام و علیه یحمل ما فی کتاب الآثار والطحاوی والکبیری من ایجاب السجود عند العمل بالتحری مطلقا لکونه لا یخلو عن التفکر والاشتغال بقدر سبحان الله ولکن لما کان هذا القدر قلیلا لا یمکن التحرز عنه عادة والحرج مدفوع بالنص لم یأخذ به المشایخ واختاروا فی تقدیر الرکن قول ابی یوسف وهو قدر ثلث تسبیحات وتفصیل ذلك فی الضمیمة الثالثة للجلد الثانی لبهشتی زیور المطبوعة آخرا فلیراجع والله اعلم، ۲۹ ربیع الاول ۴۵ھ

سجدۂ سہو میں تسبیح پڑھنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

سوال (۳) سجدۂ سہو میں تسبیح سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب صاف طور سے تحریر فرمادیں،

الجواب: سجدۂ سہو میں بھی سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنا چاہئے، اور سجدوں کی طرح اس میں بھی تسبیح مذکور سنت ہے، واللہ اعلم، ۵ ربیع الثانی ۴۵ھ

قعدۂ اخیرہ میں تکرار تشہد اور رکعت اولیٰ وثالثہ میں جلسۂ خفیفہ سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے یا نہیں

سوال (۴) تکرار تشہد فی القعدة الاخیرة کا مسئلہ مزید اطمینان کے لئے مئو[1] جا کر دوسری کتابوں میں دیکھا، عالمگیری میں تبیین سے منقول ہے، لاسہو علیہ بحر الرائق میں بھی تصریح موجود ہے کہ سجدۂ سہو واجب نہیں، ونیز بحر میں لکھا ہے کہ طحاوی کے نزدیک دونوں قعدہ میں تکرار تشہد موجب سہو نہیں، مگر قعدۂ اُولیٰ کے باب میں طحاوی کے قول پر اعتماد نہیں

[1] ایک شہر کا نام ہے ۱۲

نہ فتویٰ ہی، فتویٰ وجوب پر ہے، اور قعدۂ ثانیہ کے باب میں اختلاف منقول نہیں، اول اگر ہوا بھی تو اس پر اعتماد نہیں، احقر نے اور برادر مولوی عبدالغفار صاحب نے بھی تحقیق کی، مسئلہ عدم سہو صحیح تھا، احقر کو بھی اطمینان ہو گیا محض اطلاعاً گذارش کیا گیا، حضور نے تو پہلے ہی اطمینان فرما لیا، اور جلوس بمقدار جلسۂ استراحت فی الرکعۃ الاولیٰ او الثالثۃ کے باب میں حضور نے تحریر فرمایا "میں بمجرد جلوس سجدۂ سہو کرتا ہوں۔ لا لانہ ترک السنۃ بل لان فیہ التاخیر من القیام" اس میں غور کیجئے، غور کرنے سے قلب میں یہ بات آئی کہ حضرت امام ابوحنیفہ قعدۂ اولیٰ میں درود شریف بمقدار اللّٰھم صل علی محمدؐ کو موجب سہو فرماتے ہیں، اس کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے، یعنی لالان الصلوٰۃ علی النبی یوجب السہو بل لان فیہ التاخیر من القیام، واقعی فرق تو معلوم ہوتا ہے، لیکن غالباً صاحب رد المحتار نے تاخیر کے دو درجہ قائم کئے، ایک بمقدار جلسۂ استراحت اتنی تاخیر عند الحنفیہ خلاف سنۃ ہے، نہ خلاف واجب، اور دوسرا درجہ بمقدار اللّٰھم صل علی محمدؐ اتنی تاخیر خلاف واجب اور موجب سہو ہے، یا یوں کہا جاوے کہ نہوض علی القدمین عند الحنفیۃ سنت ہے، نہ واجب فمن جلس مقدار جلسۃ الاستراحۃ ولم ینہض علی قدمیہ خالف السنۃ عندنا ولا سہو علی من ترک السنۃ، اب کی مرتبہ انشاء اللہ متوجہ ہو کر فتح القدیر اور بحر الرائق وغیرہ دیکھونگا جو ہوگا انشاء اللہ عرض خدمت عالی کروں گا، پھر جو حضور فرما دیں گے اس پر عمل کروں گا، یوں تو تقلیداً اب بھی عمل کر سکتا ہوں، لیکن تحقیق کے بعد اور اچھا ہوگا غالباً،

الجواب: اقول وباللہ التوفیق، رکعت اول وثالثہ میں شامی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بمجرد جلوس بمقدار جلسۂ خفیفہ سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، بلکہ جلسۂ طویلہ سے واجب ہوتا ہے، ونصہ۔ وکذا القعدۃ فی اخر الرکعۃ الاولیٰ او الثالثۃ فیجب ترکھا ویلزم من فعلھا ایضاً تاخیر القیام الی الثانیۃ والرابعۃ عن محلہ وھذا اذا کانت القعدۃ طویلۃ اما الجلسۃ الخفیفۃ التی استحبھا الشافعی فترکھا غیر واجب عندنا بل ھو الافضل کما سیاتی اھ (ص ۴۸۹ ج ۱) وقال فی الدر ویکبر للنہوض علی صدور قدمیہ بلا اعتماد وقعود استراحۃ ولو فعل لاباس بہ اھ قال الشامی قال فی الکفایۃ اشار بہ الی خلاف الشافعی فی موضعین احدھما یعتمد بیدیہ علی رکبتیہ عندنا وعندہ علی الارض والثانی الجلسۃ

الخفیفۃ قال شمس الائمۃ الحلوانی الخلاف فی الافضل حتی لوفعل کما ھو مذھبنا لاباس بہ عند الشافعی ولوفعل کما ھو مذھبہ لاباس بہ عندنا کذا فی المحیط قال فی الحلیہ والاشبہ انہ سنۃ او مستحب عند عدم العذر فیکرہ فعلہ تنزیھا لمن لیس بہ عذر اھ وتبعہ فی البحر والیہ یشیر قولھم لاباس فانہ یغلب فیما ترکہ اولی اقول ولاینا فی ھذا ما قدمہ الشارح فی الواجبات حیث ذکر منہا ترک قعود قبل ثانیۃ ورابعۃ لان ذاک محمول علی القعود الطویل ولذا قیدت الجلسۃ ھنا بالخفیفۃ تامل اھ (ص ۵۳۸ / ۱ج)

ھذا واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۳ر شعبان ۱۳۴۳ھ

واما مسئلۃ تکرار التشھد فتحقیق السائل فیہ صحیح انہ یجب سجدۃ السہو لوکررہ فی القعدۃ الاولیٰ ولاتجب لو فی الاخیرۃ قال فی شرح المنیۃ لو قرأ التشھد مرتین فی القعدۃ الاخیرۃ اوتشھد قائما ای فی الاخریین او فی الاولی قبل الفاتحۃ ۱۲) اوراکعا او ساجدا لاسھو علیہ کذا فی المختار ولو زاد فی التشھد فی القعدۃ الاولیٰ علی التشھد شیئا یجب علیہ سجود السہو وان المعتبر مقدار ما یؤدی فیہ رکن اھ ملخصا (ص ۴۳۴) واللہ اعلم

۲۸ر شعبان ۱۳۴۳ھ

مغرب کی نماز میں امام کا بھول کر چوتھی رکعت کے لئے قیام کرنا،

سوال (۵) .... امام نے مغرب کی تینوں رکعتیں پڑھیں، اور قعدۂ اخیرہ بھی کرلیا، مگر بھول کرکے امام نے یہ سمجھا کہ دو رکعتیں ہوئی ہیں، اب امام پھر چوتھی رکعت کے لئے کھڑا ہوگیا، اور نہ کسی مقتدی نے بتلایا، اور سب مقتدی بھی امام کے ہمراہ کھڑے ہوگئے، مگر ایک مقتدی امام کے ساتھ نہیں کھڑا ہوا بلکہ قعدہ ہی میں بیٹھا رہا، جب امام نے چوتھی پڑھ لی اور سجدۂ سہو بھی کرلیا، اب امام کے ساتھ اس آدمی نے بھی سلام پھیرا، جو چوتھی رکعت کے واسطے نہیں کھڑا ہوا تھا، اب اس صورت میں اس آدمی کی نماز ہوجاوے گی یا نہیں؟ کیونکہ اس نے امام کے ساتھ چوتھی رکعت میں اتباع نہیں کی ہے، فقط بینوا توجروا؟

الجواب، فی الدر المختار (وان قعد فی الرابعۃ) مثلا قدر التشھد

(ثم قام عاد وسلّم) ولو سلّم قائماً صح ثم الاصح ان القوم ینتظرونه فان عاد تبعوه (وان سجد للخامسة سلّموا) لانه تم فرضه اذ لم یبق علیه الا السلام وقال الشامی (قوله مثلا) ای قعد فی ثالثة الثلاثی او فی ثانیة الثنائی ح (قوله ثم الاصح الخ) لانه لا اتباع فی البدعة وقیل یتبعونه مطلقاً عاد اولا (قوله فان عاد) ای قبل ان یقید الخامسة بسجدة تبعوه ای فی السلام (ص ۷۸۲ ج ۱) وھکذا فی مراقی الفلاح مع الطحطاوی (ص ۲۷۲)

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ حالت مذکورہ فی السوال میں اصح یہی ہے کہ امام کی اتباع چوتھی رکعت میں نہ کی جاوے، بلکہ منتظر بیٹھا رہے، اگر امام چوتھی رکعت کا سجدہ کرنے سے پیشتر بیٹھ کر سلام پھیرے تو مقتدی اس کے ہمراہ سلام پھیرے ورنہ جب امام چوتھی رکعت کا سجدہ کرے اس وقت مقتدی خود سلام پھیردے، پس اس بیٹھنے والے شخص نے یہ تو ٹھیک کیا کہ چوتھی رکعت میں امام کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا، لیکن چوتھی رکعت میں سجدہ کرنے کے بعد امام کے سلام کا انتظار نہ کرنا چاہئے تھا، لیکن اس تاخیر سے نماز فاسد نہیں ہوئی، غایت مافی الباب قول اصح پر تاخیر سے سجدۂ سہو آتا، مگر چونکہ اس نے بعد میں سلام میں امام کا اتباع کیا ہے اس لئے اس کا وہی حکم ہے جو وجوب سجدۂ سہو بر مقتدی کا حکم ہے، اور جن لوگوں نے امام کے ساتھ چوتھی رکعت پڑھی ان کی نماز قول ثانی پر جو اصح کا مقابل ہے صحیح ہوگئی بشرطیکہ امام نے سجدۂ سہو کرلیا ہو، اور گو یہ روایت اصح نہیں مگر اس وقت عموم جہل وبلویٰ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دینا مناسب ہے، ورنہ بہت لوگوں کی نمازیں باطل ہوں گی، واللہ اعلم، ۲۲ جمادی الثانی ۴۴ھ

امام نے بدون وجوب کے سجدۂ سہو کیا تو نماز فاسد ہوجائے گی یا نہیں،

سوال (۶) جس حالت میں سجدۂ سہو لازم نہ آوے اور سجدۂ سہو کرلیا گیا تو پھر نماز میں کچھ خلل تو نہیں آتا؟

الجواب: نماز ہوجاتی ہے، لیکن اگر امام نے ایسا کیا کہ وجوب سجدۂ سہو کے گمان پر سجدۂ سہو کرلیا اور بعد میں معلوم ہوگیا کہ سجدۂ سہو واجب نہ تھا، تو اس صورت میں مسبوق کی نماز میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مسبوق پر اعادہ ہے، جبکہ اس نے سجدۂ سہو میں متابعت کی ہو، اور بعض کے نزدیک اعادہ نہیں، اور اعادہ واجب نہ ہونے پر فتویٰ ہے، اذا ظن الامام ان علیه سهوا فسجد للسهو وتابعه المسبوق فی ذلك

ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سہو فیہ روایتان واختلف المشایخ لاختلاف الروایتین واشھرھما ان صلوٰۃ المسبوق یفسد وقال الامام ابوحفص الکبیر لا یفسد والصدر الشھید اخذ بہ فی واقعاتہ وان لم یعلم ان لیس علیہ سہو لم یفسد صلوٰۃ المسبوق عندھم جمیعاً خلاصۃ الفتاوی (ص ۱۶۴ ج ۱)

الجواب صحیح ، ظفر احمد عفاعنہ ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

تشہد میں سہواً بسم اللہ پڑھ لی تو سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا

سوال (۷) مغرب کی دوسری رکعت میں التحیات سے پہلے بسم اللہ شریف سہواً پڑھ جانے سے سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: تشہد ابن مسعودؓ واجب نہیں بلکہ اَولیٰ ہے، پس اگر تشہد دوسرے طرق مرویہ کے موافق پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے، اور بعض طرق میں بسم اللہ کی زیادت بھی ہے، لہٰذا سجدۂ سہو تو نہ ہوگا، مگر ایسا کرنا اچھا نہیں، اب اگر محض بسم اللہ زیادہ کیا تو یہ تو جائز ہے، "لکونہ وارداً" اور اگر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" زیادہ کیا تو اس میں کراہت تنزیہی ہوگی "لکونہ غیر وارد" اور سجدۂ سہو نہ ہوگا، لکونہ زیادۃ فی التشہد لاعلی التشہد واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ الجواب صحیح ، ظفر احمد عفاعنہ ۵ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

تکرار اکثر فاتحہ اور اعادۂ تشہد سے سجدۂ سہو کا واجب ہونا

سوال (۸) نماز میں اوّل یا ثانی رکعت میں سورۂ فاتحہ میں کوئی کلمہ غلطی سے پڑھا گیا یا شک ہوا اس کلمہ میں غلط پڑھنے کے بعد قرأت کثیر سورۂ فاتحہ کا اعادہ کیا، قرأت کے ما قبل کلمہ مذکورہ سے واسطے تصحیح کلمۂ مذکورہ کے جس سے تکرار کثیر سورۂ فاتحہ کا لازم آیا کیا یہ تکرار جو واسطے تصحیح کلمۂ مذکورہ کے ہے عذر واسطے رفع کراہت تکرار کثیر سورۂ فاتحہ کے ہو سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں ہو سکتا تو ہر نماز کا اعادہ واجب ہوگا یا سجدہ سہو کا؟

اسی طرح قعدۂ اولیٰ میں تشہد کا کوئی کلمہ غیر صحیح پڑھا گیا یا شک ہوا کہ غیر صحیح پڑھا گیا، پھر چند کلمات کے ساتھ اس کلمہ کو تصحیح کے لئے اعادہ کیا، ما قبل اس کلمہ کے، کیا یہ اعادہ زیادتی فی التشہد کے حکم میں ہے یا نہیں، اگر ہے تو پھر اعادۂ نماز ہوگا یا سجدۂ سہو؟

الجواب: فی العالمگیریۃ (ص ۸۰ ج ۱) ولو کررھا فی الاولیین یجب علیہ سجود السہو بخلاف ما لو اعادھا بعد السورۃ او کررھا فی الاخریین

کذا فی التبیین، ولو قرأ الفاتحۃ الاحرفا او قرأ اکثرها ثم اعادها ساهیا فهو بمنزلۃ ما لو قرأها مرتین کذا فی الظهیریۃ (۲) وفی الطحطاوی علی المراقی ص ۲۷۵ ولو شک فی تکبیرۃ الافتتاح فاعاد… التکبیر والثناء ثم تذکر کان علیه السهو ولا یکون الثانیۃ استقبالا وقطعا للاولی، (۳) وفی العالمگیریۃ (ص ۸۱ ج ۱) ولو کرر التشهد فی القعدۃ الاولی فعلیه السهو،

روایت اولی سے معلوم ہوا کہ اگر سورۃ سے قبل فاتحہ کا تکرار کیا جاوے تو موجب سہو ہے، اور بعد سورۃ کے اعادہ فاتحہ کا موجب سہو نہیں، ونیز یہ معلوم ہوا کہ اگر اکثر فاتحہ پڑھ کر اعادہ کیا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، اور اگر اکثر حصہ نہیں پڑھا تھا تو اعادہ سے سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا، باقی رہی یہ بات کہ سورۂ فاتحہ کل یا اکثر پڑھنے کے بعد کتنی فاتحہ کے اعادہ سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے، سو اس کی تصریح نہیں ملی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بعض اقل فاتحہ پڑھ کر اس کا اعادہ موجب سہو نہیں، اسی طرح اکثر یا کل پڑھ کر بھی اقل کا اعادہ موجب سہو نہ ہوگا، لیکن جزئیہ نہیں ملا، لیکن طحطاوی علی مراقی الفلاح کی اس عبارت سے متبادر یہ ہے کہ مطلقاً بعض فاتحہ کا تکرار بھی مثل کل فاتحہ کے تکرار کے موجب سہو ہے، لیکن اس بعض مطلق کو آیۃ واحدہ کے ساتھ مقید کیا جاوے گا، کیونکہ اس سے قلیل تو غیر معتبر ہے قال ولو کرر الفاتحۃ او بعضها فی احدی الاولیین قبل السورۃ سجد للسهو اھ (ص ۲۶۷ ج ۱) وفی الدر فی بیان واجبات الصلوٰۃ وهی قرأۃ فاتحۃ الکتٰب فیسجد للسهو بترک اکثرها لا اقلها لکن فی المجتبیٰ یسجد بترک اٰیۃ منها وهو اولی قلت وعلیه فکل اٰیۃ واجبۃ ککل تکبیرۃ عید واتیان کل وترک تکریر کل اھ (ص ۴۷۷ ج ۱) قلت فلما کان کل اٰیۃ منها واجبا فتکرار اٰیۃ منها یوجب سجود السهو لکونه تاخیرا فی الواجب الثانی ای تاخیر للاٰیۃ الثانیۃ عن محلها واللّٰہ اعلم وفی شرح المنیۃ وکذا لو قرأ الفاتحۃ الاحرفا ثم اعادها لا سهو علیه کذا فی الخلاصۃ (ص ۴۳۳) قال الشیخ وهذا ارجح عندی ویمکن ارجاع کلام الطحطاوی الیه قلت ولکن لم ینشرح[عه] به صدری بعد ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک امرًا، واللّٰہ اعلم ۱۲ ظ

عہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ،

اور روایت ثانیہ سے معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے اعادہ کی صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر یاد آجاوے کہ پہلے صحیح پڑھا تھا تو وہ تکرار موجب سہو ہے ورنہ نہیں،

اور روایت ثالثہ سے تشہد کے اعادہ کا بھی موجب سہو ہونا معلوم ہوا، اور فاتحہ پر قیاس کر کے یہاں تفصیل مذکور ہوگی، ہر حال میں اعادہ موجب سہو نہ ہوگا، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ جب مقدار رکن کا اعادہ ہو جائے تو سجدۂ سہو ہوگا، واللہ اعلم، عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد، عفا عنہ ۱۲ ر رمضان ۴۷ھ

منفرد سجدۂ سہو کے لئے ایک طرف سلام پھیرے یا دونوں طرف؟

سوال (۹)........... منفرد کو سجدۂ سہو لازم ہوا، تو ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرے یا دونوں طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرے، اس میں صحیح قول کونسا ہے، معلوم کرا دیں، کیونکہ در مختار کی عبارت سے دوسرے سلام کے بعد سجدۂ سہو نہ کرنے معلوم ہوتا ہے کہ دو سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو ساقط ہو جاتا ہے، نماز پھر ..... پڑھنے کو کہا جاتا ہے، اس واسطے آپکو تکلیف دی جا رہی ہے، برائے کرم مہربانی فرما کر جواب جلد عنایت فرمایئے گا،

الجواب: در مختار میں ایک قول کی بنا پر یہ کہا ہے، کہ سجدۂ سہو کے لئے اگر دونوں طرف سلام پھیر دے تو پھر سجدۂ سہو ساقط ہے، مگر فتویٰ اس پر نہیں، بلکہ فتویٰ اس پر ہے کہ سجدۂ سہو کے لئے سلام تو ایک ہی طرف پھیرے، لیکن اگر دونوں طرف سلام پھیر دے تب بھی سجدۂ سہو ساقط نہیں ہوا بلکہ وہ سجدۂ سہو دونوں طرف

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ؎ ووجہ عدم الانشراح کون مافی الظہیریۃ مخالفالہ صریحا کما مر ذکرہ فانہ اوجب السہو فی اعادۃ الفاتحۃ بغیر قرأۃ اکثرہا وشارح المنیۃ لایوجبہ ولو قرأ کلہا الا حرفا ولاشک ان الاحتیاط فی ایجاب السہو والذی یظہر لی ان مافی الظہیریۃ ایضاً لایوافق قول الامام بل ہو مبنی علی قولہما فان الواجب عندہما اکثر الفاتحۃ وعند الامام کل آیۃ منہا واجبۃ کما ذکرہ فی الدر فینبغی ایجاب السہو بتکرار آیۃ منہا کما یدل علیہ کلام الطحطاوی المار قد جعلت الشافعیۃ ترتیب آیات الفاتحۃ والموالاۃ بینہما شرطاً وعدوا کل آیۃ منہا رکناً فالاحوط ما قالہ فی الدر ان کل آیۃ منہا واجبۃ واذا کان کذلک فتکرار آیۃ منہا یوجب التاخیر فی الثانیۃ وہی واجبۃ فیجب السہو لتاخیر الواجب ۱۲ ظ

سلام کے بعد بھی کرسکتا ہے اور اعادہ واجب نہیں، ووجهه مافی رد المحتار وقیل یأتی بتسلیمتین وھو اختیار شمس الائمة وصدر الاسلام اخی فخر الاسلام وصححه فی الهدایة والظهیریة والمفید والینابیع وکذا فی شرح المنیة قال فی البحر وعزاه ای الثانی فی البدائع الی عامتهم فقد تعارض النقل عن الجمهور اھ (ص ۷۷۲ ج ۱) فاذا کان مختار ھؤلاء الاعلام ان یأتی بسجود السهو بعد تسلیمتین لزم عدم سقوط السجود بهما ولکن الاحوط الاحتراز عن التسلیمتین خروجا من الخلاف فقد قال بعض من قال بتسلیمة واحدة فقط بسقوطه بهما قال الشامی قلتُ وعلیه فیجب ترک التسلیمة الثانیة اھ (ص مذکور) قلت ووجه جوازا لتسلیمتین اطلاق قوله صلی اللہ علیه وسلم سجدتا السهو بعد السلام وھو حسن واطلاق ما فی الصحیح انه صلی اللہ علیه وسلم سها فلما قضی صلوته سلم ثم سجد وسلم والمطلق ینصرف الی المعهود منه والبسط فی الاعلاء، واللہ اعلم، ۳ رجمادی الثانی ۴۶ھ

شبہ ترکِ واجب پر سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟

سوال (۱۰) نماز میں ترک واجب کے شبہ پر ترک واجب نہ ہونے کا ظن غالب ہوتے ہوئے احتیاطاً سجدۂ سہو کرلینا جائز ہے یا نہیں، جبکہ ایسے شبہات اکثر ہوتے ہوں؟

الجواب: جب ظن غالب عدمِ ترکِ واجب کا ہے تو سجدۂ سہو کی ضرورت نہیں، لیکن اگر احتیاطاً کرلے تو منفرد کے لئے تو حرج نہیں، لیکن امام کو بلاضرورت احتیاطی سجدہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے مسبوق کی نماز پر فساد لازم آئے گا علی قول البعض والخروج من الخلاف اسلم، ۲۶ رشعبان ۴۶ھ

فرض اور نفل کے قعدۂ اخیرہ میں تکرار تشہد پر وجوبِ سجدۂ سہو کے متعلق بہشتی زیور اور الامداد کی عبارتوں میں اختلاف کی تطبیق

سوال (۱۱) الامداد بابت ذی الحجہ ۴۳ھ کے صفحہ ۴ میں بعنوان تصحیح مسئلہ حاشیہ پر یوں درج ہے، "الامداد بابت ذیقعدہ صفحہ ۱۸، س ۱۱ تا ۱۸ میں جو ایک سوال کے جواب میں لکھا ہوا ہے کہ التحیات کے مکرر پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم ہوگا طحطاوی

شرح مراقی الفلاح سے یہ جواب غلط ثابت ہوا ہے، اس جواب سے رجوع کرتا ہوں، صحیح جواب یہ ہے "قعدۂ اولیٰ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم ہے، اور قعدۂ اخیرہ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم نہیں"، تمام ہوئی یہ عبارت، بہشتی زیور جدید حصہ دوم صفحہ ۵۴ میں آخری مسئلہ ہے، نفل نماز میں دو رکعت نماز پڑھ کر التحیات کے ساتھ درود شریف بھی پڑھنا جائز ہے، اس لئے کہ نفل ہے، درود شریف کے پڑھنے سے سجدۂ سہو نہیں ہوتا، البتہ اگر دو دفعہ التحیات پڑھ جاوے تو نفل میں بھی سجدۂ سہو واجب ہے، تمام ہوئی عبارت بہشتی زیور کی،

وجہ تطبیق دونوں مسئلوں کی کس طرح ہے، وجہ اشتباہ یوں ہے کہ بہشتی زیور کی عبارت سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ دو رکعت کے بعد التحیات کو مکرر پڑھ جانے سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے، اور نفل کی ہر دو رکعت کا قعدہ حکم میں مثل اخیری قعدہ کے ہے اور الامداد کی عبارت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم نہیں، حالانکہ تاخیرِ سلام سے بھی سہو کا سجدہ واجب ہے،

اس لئے دونوں کی وجہ تحریر فرمائی جاوے، تاکہ مسئلہ خوب ذہن نشین ہوجاوے۔۔۔۔

- -

الجواب: قعدۂ اخیرہ میں تکرار تشہد سے سجدۂ سہو واجب نہ ہونا، جیسا کہ حاشیہ الامداد میں طحطاوی سے لکھا ہے، عالمگیریہ اور منیہ میں بھی موجود ہے، بلکہ طحطاوی نے منیہ ہی سے نقل کیا ہے، باقی رہا یہ شبہ کہ تاخیر سلام سے سجدۂ سہو واجب کیوں نہیں ہوا اس کا جواب بھی طحطاوی سے معلوم ہوتا ہے، ونصہ ھکذا وان قرأ بعد التشہد فان کان فی الاول فعلیہ السہو لتاخیر الواجب وھو وصل القیام بالفراغ من التشہد وان کان فی الاخیر فلا سہو علیہ لعدم ترک واجب لانہ موضع لہ فی الدعاء والثناء بعدہ فیہ والقرأۃ تشتمل علیھما ولو قرأ التشہد مرتین فی القعدۃ الاخیرۃ او تشہد قائما او راکعا او ساجدا لا سہو علیہ۔ منیۃ المصلی طحطاوی (ص ۲۶۷)، اس سے معلوم ہوا کہ قعدۂ اخیرہ میں تشہد کے بعد قرأت سے سجدۂ سہو واجب نہ ہونے کی وجہ قرأت کا ثناء ودعاء پر مشتمل ہونا ہے، اور تشہد ثناء ودعاء پر مشتمل ہے، اس لئے اس سے بھی سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا، چنانچہ منیہ کی عبارت مذکورہ

قرار التشہد الخ کے تحت میں شارح منیہ کبیری میں لکھتے ہیں واما التشہد فلانہ ثناء والقیام والرکوع والسجود محل الثناء، پس تاخیر سلام موجب سہو وہ ہی جو بغیر الدعاء والثناء ہو، سوال کے ایک جزو کا جواب تو ہو چکا، اب دوسرے جزو کا جواب معروض ہے، وہ یہ کہ بہشتی زیور میں جو نفل کے قعدۂ اولیٰ میں تکرار تشہد سے وجوب سجدۂ سہو لکھا ہے، اس کو خاکسار نے بہت تلاش کیا، مطبوعہ جدید میں جو حوالہ لکھا گیا ہے اس کو بھی دیکھا، اس جزء کے متعلق اس مقام پر کچھ نہیں ملا، غالباً فرض پر قیاس کرکے اس کو لکھ دیا گیا اور اس پر جو آپ نے محذور بیان فرمایا ہے، وہ تو متوجہ نہیں ہوتا، کیونکہ نفل میں قعدہ فرض ہے، جس پر نماز ختم کی جاوے، جیسا کہ درمختار میں ہے (او) صلیٰ اربعًا فاکثر و (لم یقعد بینہما) استحسانًا لانہ بقیامہ جعلہا صلوٰۃ واحدۃ فتبقی واجبۃ والخاتمۃ ھی الفریضۃ (شامی، ص ۲۸، ج ۱) لیکن یہ شبہ ہے کہ نفل کے قعدۂ اولیٰ میں جب درود شریف کی اجازت ہے، تو تکرار تشہد کو فرض پر قیاس کرکے وجوب سجدہ کس طرح ہوگا، اس لئے جب تک کوئی صریح جزئیہ نہ مل جاوے تکرار تشہد سے نوافل کے قعدۂ اولیٰ میں سجدۂ سہو کو ذاتہٗ جب کہا جاویگا واللہ اعلم۔ کتبہ احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۶ ار صفر ۴۵ھ

احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو حوالہ جات میں نے لکھے ہیں اپنے مسودہ کو اس مقام پر میں نے دیکھا تو وہاں تصریح موجود ہے، کہ نفل کے قعدۂ اولیٰ میں تکرار تشہد سے وجوب سجدۂ سہو کا جزئیہ ہماری نظر سے نہیں گذرا، اور بظاہر یہ قواعد کے بھی خلاف ہے، کیونکہ نوافل میں ہر شفعہ مستقل نماز ہے، اور اس کا قعدۂ اولیٰ بحکم قعدۂ اخیرہ ہے، البتہ سنن مؤکدہ اور وتر کا حکم مثل فرائض کے ہے لہٰ نہ معلوم کیا غلطی ہوئی کہ میری اس تحریر کے بعد بھی بہشتی زیور کے مسئلہ میں ترمیم نہ ہوئی نہ میری عبارت لکھی گئی، صرف حوالہ جات ہی لکھ دیئے گئے، النور میں اس غلطی کی اطلاع کر دی جاوے گی، اور آئندہ طبع میں انشاء اللہ اصلاح بھی ہو جاوے گی، فقط ۱۹ ار صفر ۴۵ھ از تھانہ بھون،

مسبوق نے نماز مغرب میں درمیانی قعدہ ترک کر دیا تو اس پر سجدۂ سہو ہے یا نہیں؟

سوال (۱۲) مغرب کی ایک رکعت امام کے ساتھ ملی، دو رکعت پوری کرنے میں درمیان کا قعدہ رہ گیا، تو سجدۂ سہو کرے یا نہیں، اگر قصداً قعدہ چھوڑ دے تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ قعدہ قول معتمد پر واجب ہے اس کو قصداً ترک نہ کیا جاوے، البتہ اگر سہواً رہ گیا تو سجدۂ سہو واجب نہیں، فی الشامی (ص ۶۲۴ ج ۱) قال فی شرح المنیۃ ولو لم یقعد جاز استحسانا لا قیاسا ولم یلزمہ سجود السہو لکون الرکعۃ اولی من وجہ، ۱۵ / رمضان ۴۸ھ

امام دعاء قنوت چھوڑ کر رکوع کو جائے تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟

سوال (۱۳) اگر وتر کی جماعت میں امام بجائے تکبیر کے رکوع میں چلا جائے یعنی دعاء قنوت سے قبل والی تکبیر اور دعاء قنوت دونوں بھول گیا، رکوع میں چلا گیا، تو امام کو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب، اس وقت رکوع کو پورا کرے، اور پھر سجدہ وغیرہ کرکے بعد سجدۂ سہو کرے، رکوع سے کھڑا ہو کر قنوت نہ پڑھے، احقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۵ / شوال ۴۸ھ

وتر میں سہو کی ایک صورت کا حکم

سوال (۱۴) نماز وتر میں ایک دفعہ اس طرح سہو ہوا کہ دو رکعت کے بعد قعدہ میں خیال ہوا کہ شاید تیسری رکعت کے قیام میں دعاء قنوت نہیں پڑھی تھی، اس لئے سجدۂ سہو کر لیا، مگر پھر یاد آ گیا کہ ابھی تک ایک رکعت باقی ہے، پھر سلام پھیرنے سے پہلے تیسری رکعت پوری کر لی، اور دو سجدۂ سہو کر کے سلام پھیرا گیا اس طرح یہ نماز درست ہو گئی، کیا سجدۂ سہو کے بعد پھر سہو ہو جاوے تو اس کے لئے دوسرا سجدۂ سہو کر لینا درست ہے،

الجواب، ہاں نماز درست ہو گئی، اور اس حالت میں سجدۂ سہو دوبارہ کرنا ضروری ہے، پہلا سجدہ جو کیا تھا وہ بے موقع تھا، فی الدر المختار (واذا صلی رکعتین وسہا فیہما فسجد لہ بعد السلام ثم اراد بناء شفع علیہ لم یکن لہ ذلک) البناء ای لہ تحریما لئلا یبطل سجودہ بلا ضرورۃ (بخلاف المسافر) اذا نوی الاقامۃ لانہ لو لم یبن بطلت (ولو فعل ما لیس لہ) من البناء (صح) بناءہ لبقاء التحریمۃ ویعید) ہو والمسافر (سجود السہو علی المختار) لبطلانہ بوقوعہ فی خلال الصلوٰۃ وفی الشامی (قولہ بخلاف المسافر الخ) ای لو کان مسافرا فسجد للسہو ثم نوی الاقامۃ فلہ ذلک لانہ لو لم یبن وقد لزم الاتمام بنیۃ الاقامۃ بطلت صلاتہ و فی البناء نقض لجزء وہو ادنی فیتحمل دفعا للاعلی (بحر، ص ۶۴۳) قلت والصورۃ

المسئولۃ نظیر صلوٰۃ المسافر کما لا یخفیٰ وفی الشامیۃ ایضاً ص۵۸ عن التتارخانیۃ ان السهو ان وقع فی اصل الصلوٰۃ اوجب فسادها وان فی وصفها فلا فالاول کما اذا سلم علی الرکعتین علی ظن انه فی الفجر او الجمعۃ او السفر والثانی اذا سلم علیهما علی ظن انها رابعۃ اھ، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۱ شوال ۴۷ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

سوال (۱۵) اگر قعدۂ اُولیٰ یا ثانیہ میں تشہد سے پہلے یا بعد میں فاتحہ قرآن کی ایک آیت یا دو آیت پڑھ جائے تو سجدۂ سہو لازم ہے یا نہیں؟

| قعدۂ اُولیٰ یا ثانیہ میں قبل تشہد یا اس کے بعد فاتحہ وغیرہ پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم آئے گا یا نہیں؟ |

الجواب: قعدۂ اُولیٰ میں بہرحال لازم ہے، اور ثانیہ میں تشہد سے پہلے پڑھے تو واجب ہے ورنہ نہیں، قال الطحطاوی فی حاشیۃ مراقی الفلاح ولو قرأ آیۃ فی الرکوع او السجود او القومۃ فعلیه السهو (وفی البحر عن المبتغیٰ لا سجود علیه قال صاحب البحر ولکن ما فی الظهیریۃ ان علیه السهو اولیٰ) ولو قرأ فی القعود ان قرأ قبل التشهد فعلیه السهو لترک الواجب وهو الابتداء بالتشهد اول الجلوس وان قرأ بعد التشهد فان کان فی الاول فعلیه السهو لتاخیر الواجب وهو وصل القیام بالفراغ من التشهد وان کان فی الاخیر فلا سهو علیه لعدم ترک واجب لانه موسع له فی الدعاء والثناء بعده فیه والقراءۃ تشتمل علیهما اھ ص ۲۶۷ واللہ اعلم ۱۲ شوال ۵۸ھ

فصل فی سجود التلاوۃ

سوال (۱) سجدۂ تلاوت کی بجائے نماز میں رکوع کافی ہے؟ اور سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد بلا کچھ آگے قرأت کئے ہوئے رکوع جائز ہے؟

| نماز میں سجدۂ تلاوت کے بجائے رکوع کا کافی ہوجانا اور اس کی شرائط، |

الجواب: نماز میں سجدۂ تلاوت کے بجائے رکوع کافی ہے بشرطیکہ رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت بھی کرلے، اور سجدۂ نماز میں بدون نیت کے بھی کافی ہے، مگر رکوع و سجود صلوٰۃ اسی وقت سجدۂ تلاوت کے بجائے کافی ہیں جبکہ آیتِ سجدہ کے بعد فوراً یا ایک دو آیت پڑھ کر رکوع کرلے، اگر سجدہ کی آیت کے بعد تین آیتیں پڑھ کر رکوع کیا تو سجدۂ

تلاوت ادا نہ ہوگا، اور سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد بدون کچھ آگے قرأت کئے رکوع کردینا مکروہ ہے، اور ظاہر کراہت تحریمیہ ہے، قال فی مراقی الفلاح ویجزی عنہا ای عن سجدۃ التلاوۃ رکوع الصّلوۃ ان نواھا ای توی اداءھا فیہ نص علیہ محمد رای علی اشتراط النیۃ ط) ویجزی عنہا ایضا سجودھا ای سجود الصلوٰۃ وان لم ینوھا ای التلاوۃ اذا لم ینقطع فور التلاوۃ (مرتبط فی الرکوع والسجود جمیعا ط) وانقطاعہ بان یقرأ اکثر من آیتین بعد آیۃ سجدۃ التلاوۃ بالاجماع وقال شمس الائمۃ الحلوانی لا ینقطع الفور ما لم یقرأ اکثر من ثلاث آیات قال الکمال ان قول شمس الائمۃ ھو الروایۃ (وقال ط والاول اصح من جہۃ الدرایۃ لانہ احوط کما ذکرہ المؤلف ۱۲) اھ وفیہ ایضا واذا کانت آیۃ السجدۃ) آخر تلاوتہ ینبغی ان یقرأ ولو آیتین، من سورۃ اخری بعد قیامہ منہا حتی لا یصیر بانیا الرکوع علی السجود ولو رکع بمجرد قیامہ منہا کرہ اھ قال ط اطلق فی الکراھۃ وظاھرہ التحریم ویحرر اھ (ص ۲۸۲ مع الطحطاوی) ۲۴ شعبان ۴۲ھ

تحقیق محلِ سجدہ سورۂ صٓ

سوال (۲) سورۂ صٓ میں سجدہ أنَابَ پر ہے یا مَاٰبْ پر؟

الجواب؛ سورۂ صٓ میں سجدہ حُسن مآب پر ہے، کذا فی مراقی الفلاح وقال ھو الاولیٰ مما قالہ الزیلعی یجب عند قولہ تعالیٰ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ، الخ (ص ۲۷۹ مع الطحطاوی)

نماز میں سجدۂ تلاوت کو مقام سے مؤخر کرنیکا حکم

سوال (۳) اگر نماز میں آیتِ سجدہ پڑھکر سجدہ نہ کرے، بلکہ ایک دو آیت بعد کرے تو نماز میں نقصان آئے گا یا نہیں؟

الجواب؛ نماز میں سجدۂ تلاوت کو مقامِ تلاوت سے مؤخر کرنے میں اقوال مختلف ہیں، بعض نے مکروہ لکھا ہے، اور بعض نے بلا کراہت جائز کہا ہے، بشرطیکہ نماز ہی میں سجدہ ادا کرلے، اور اشبہ بالصواب احقر کے نزدیک یہ ہے کہ جتنی تاخیر سے فوریت منقطع نہ ہو (وہو قدر آیتین او ثلاث کما سیاتی) اتنی تاخیر کا مضائقہ نہیں، اور جس تاخیر سے فوریت منقطع ہوجائے وہ مکروہ ہے، قال فی نور الایضاح وشرحہ وھو واجب علی التراخی ان لم تکن وجبت بتلاوتہ فی الصلاۃ لانہا صارت جزءًا من

الصلوٰۃ لا یقتضی خارجہا فتجب فوریۃ فیہا وفی غیرہا تجب موسعا اھ (ص ۲۷۸)
قال الطحطاوی حتیٰ لو اطال التلاوۃ تصیر قضاء ویاثم فیکرہ تحریما
تاخیر الصلاتیۃ عن وقت القراءۃ افادہ فی الشرح وھذا ینافی ما ابداہ
فی حاشیۃ الدر من قولہ ویجوز ان یقال تجب الصلاتیہ موسعا بالنسبۃ
لمحلہا کما لو تلاھا فی اول صلوٰتہ وسجدھا فی آخرھا اھ،
وفی نور الایضاح ایضاح الشرح ویجزی عنہا ای عن سجدۃ
التلاوۃ رکوع الصلوٰۃ ان نواھا وسجودھا وان لم ینوھا اذا لم ینقطع فور التلاوۃ
وانقطاعہ بان یقرأ اکثر من آیتین بعد آیۃ السجدۃ بالاجماع وقال
شمس الائمۃ الحلوانی لا ینقطع الفور ما لم یقرأ اکثر من ثلث آیات وقال
الکمال قول شمس الائمۃ الحلوانی ھو الروایۃ اھ قال الطحاوی والحاصل
ان الفور لا ینقطع بآیۃ وآیتین اتفاقا وینقطع باربع اتفاقاً واختلف فی الثلاث
فقیل ینقطع واختارہ خواھر زادہ وقیل لا واختارہ الحلوانی وھو اصح من
جہۃ الروایۃ کما فی الحلبی والاول اصح من جہۃ الدرایۃ لانہ احوط
اھ (ص ۲۸۲) قلت وانما کان التاخیر مکروھا لوجوب السجدۃ فوریۃ
فیہا فاذا لم ینقطع الفور بآیۃ وآیتین اتفاقاً وبثلث اختلافا لم یوجد
علۃ الکراھۃ واللہ اعلم ثم رأیت الشامی صرح بما فہمتہ نقلا عن الحلیۃ
بما لفظہ فان کانت صلوٰتیۃ فعلی الفور ح ثم تفسیر الفور عدم طول المدۃ بین
التلاوۃ والسجدۃ بقراءۃ اکثر من آیتین او ثلث کما سیأتی حلیۃ اھ (ص
۸۰۶ ج ۱) پس سجدۂ تلاوت کو قیامِ سجدہ سے بقدر ایک دو آیت کے مؤخر کرنے سے نماز میں
نقصان نہ آئے گا، اور بقدر تین آیت کے مؤخر کرنے کی بھی گنجائش ہے گو خلاف احتیاط
ہے، اور بقدر چار آیت یا زائد کے مؤخر کر دیا، تو اگر عمداً کیا تو اس سے توبہ کرے اور نماز
میں نقصان رہا اور نماز کا اعادہ اس لئے واجب نہیں، کہ اس واجب فوت شدہ
کی تلافی نہیں ہو سکتی، اور اگر سہواً اتنی تاخیر ہوئی تو اخیر میں سجدۂ سہو لازم ہے، صرح
بوجوبہا الشامی، فی (ص ۷۷۴ ج ۱، باب سجود السہو، نقلاً عن الخلاصۃ قال وصححہ فی
الولو الجیۃ ایضاً، ۱۸ رمضان ۴۲ھ،

اقترب للناس کے دوسرے سجدۂ تلاوت پر سجدہ کرنے کا حکم

سوال (۴) نماز تراویح میں اقترب للناس کے دوسرے سجدۂ تلاوت پر جو امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک واجب ہے سجدہ کیا تو نماز میں کوئی نقص تو نہیں آیا،

الجواب: کچھ نقص نہیں آیا، اگر یہ سجدہ کرنے والا عالم ہو اور اس کو دلیل سے امام شافعی کے قول کی قوت معلوم ہوگئی ہو، اور اگر یہ بات نہ ہو تو پھر اس سجدہ سے اس شخص پر سجدۂ سہو لازم آوے گا، کیونکہ اس کے امام کے نزدیک اس جگہ سجدہ نہیں تو اس نے نماز میں بلا ضرورت ایک سجدہ بڑھا دیا، جس سے تاخیر رکن لازم آئی، جو موجب سجدۂ سہو ہے، ۱۸؍ ذیقعدہ ۴۵ھ

حکم سجدۂ تلاوت بغیر تلاوت آیت سجدہ

سوال (۵) نماز تراویح میں سورۂ انشقاق شروع کی اور فما لہم لایؤمنون پر ختم کر کے سجدہ کر لیا، پھر سجدے سے اٹھ کر سجدہ کی آیت چھوڑ کر بقیہ سورۃ ختم کر کے رکعت پوری کر لی، یعنی سجدۂ تلاوت ہوا اور سجدہ کی آیت تلاوت نہیں ہوئی، ایسی حالت میں نماز صحیح رہی یا نہیں، یہ غلطی سہواً ہوئی ہے؟

الجواب: اس صورت میں سجدۂ سہو لازم تھا، سجدۂ تلاوت جو بدون آیت سجدہ کے کیا گیا ہے، عمل زائد ہوا جس سے واجب میں تاخیر ہوئی، ۱۸؍ ذیقعدہ ۴۵ھ

نماز عیدین میں دوسری رکعت میں قرأت آیت سجدہ پر ختم ہوگئی، تو رکوع یا سجدہ میں سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا یا تکبیرات رکعت ثانیہ کا فصل مانع ہے؟

سوال (۶) سجدۂ تلاوتِ صلاتیہ کا مسئلہ ہدایہ میں تو ہے نہیں، مگر مجھے یہ یاد ہے کہ ختم آیت سجدہ پر اگر نیت کرے تو رکوع میں تداخل ہو جاتا ہے، اور بلا نیت کے سجدۂ صلوٰۃ میں تداخل ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ آیتِ سجدہ کے متصل ہی رکوع کرلے، اگر آیتِ سجدہ کے بعد کچھ اور پڑھ گیا، تو تداخل درست نہ ہوگا، بلکہ سجدۂ تلاوت علیحدہ ادا کرنا ہوگا، اس میں یہ دریافت طلب ہے کہ صلوٰۃ عیدین میں اگر رکعت ثانیہ میں آیتِ سجدہ پر قرأت ختم کرلے تو سجدہ کا تداخل (بہ نیت) رکوع میں اور (بلا نیت) سجدۂ صلوٰۃ میں ہو جائے گا یا نہیں؟ وجہ شبہ یہ ہے کہ آیتِ سجدہ اور رکوع میں تکبیرات زوائد نے فاصلہ کر دیا ہے،

الجواب؛ قال فی مراقی الفلاح و یجزئ عنہا رکوع الصلوٰۃ ان نواھا و ینبغی ذلک للامام حال کثرۃ القوم و یجزئ عنہا سجودھا ایضا وان لم ینوھا اذا لم ینقطع فور التلاوۃ وانقطاعہ بان یقرأ اکثر من آیتین وقال الحلوانی مالم یقرأ اکثر من ثلث آیات قال الکمال وھو الروایۃ اھ (ص ۲۸۲ ملخصا)

اس سے معلوم ہوا کہ بقدر آیتین یا ثلث آیات کے .... فصل سے فور منقطع نہیں ہوتا،، اور تکبیرات ثلث عید آیتین کے برابر اور تین آیات سے کم ہیں، اس لئے صلوٰۃ عید کی رکعت ثانیہ میں بھی آیت سجدہ پر قرأت ختم کر کے رکوع یا سجدہ میں سجدۂ تلاوت ادا ہو جائیگا، ۲۲ شعبان ۴۶ھ

احکام سجدۂ تلاوت بر تالی و سامع

سوال (۷) ایک طالب علم بغرض حفظ آیت سجدہ کو ایک ہی جلسہ میں بار بار تلاوت کرتا ہے، اس کا استاد جو اسی مجلس میں بیٹھا سنتا ہے اس پر ایک ہی سجدہ ہوگا یا متعدد؟

(۲) قرأت سکھانے میں ایک مرتبہ قاری آیت سجدہ پڑھتا ہے اور دوبارہ متعلم بغرض مشق اس کا اعادہ کرتا ہے، جلسہ ایک ہی رہتا ہے تو ایک سجدہ کرنا ہوگا یا دو؟

(۳) تالی بغرض حفظ ایک ہی مجلس میں بار بار ایک ہی آیت سجدہ پڑھتا ہے، اور سامع اسے دور سے دوسری مجلس میں سن رہا ہے تو اس سامع پر کتنے سجدے واجب ہونگے؟

(۴) تالی تو ایک ہی مجلس میں اعادہ و تکرار آیت سجدہ کر رہا ہے، مگر سامع کی مجلس بدلتی رہی تو اُسے کتنے سجدے کرنے ہوں گے؟

(۵) دو یا چند طالب علم ہم سبق ایک ہی آیت سجدہ کو پڑھتے ہیں تو سامع کو ایک سجدہ کرنا ہوگا یا دو، مجلس ایک ہی رہی؟

الجواب (۱ و ۲) ان صورتوں میں طالب علم اور استاد دونوں پر ایک ہی سجدہ واجب ہے،

(۳) سامع کی مجلس اگرچہ مجلس تالی سے متحد نہ ہو مگر جب کہ سامع کا سماع متحد رہی، بوجہ اتحاد آیت و اتحاد مکان سماع کے تو اس پر ایک ہی سجدہ واجب ہوگا،

(۴) اس صورت میں قول مفتی بہ پر سامع کے ذمہ سجدات متعددہ ہوں گے،

(۵) اس صورت میں سامع پر ایک ہی سجدہ ہوگا،

الدلائل؛ قال فی الدر ولو کررھا فی مجلسین تکررت وفی مجلس واحد لا بل کفتہ واحدۃ

والاصل ان مبناها على التداخل دفعاً للحرج بشرط اتحاد المكان والآية اھ
قال الشامی ای بان يكون المكرر آية واحدة فی مجلس احد فلو تلا آيتين
فی مجلس واحد او آية واحدة فی مجلسين فلا تداخل، ولم يشترط اتحاد
السماع لانه انما يكون باتحاد المسموع فيغنى عنه اشتراط اتحاد الآية
واشار الى انه متى اتحدت الآية والمجلس لا يتكرر الوجوب وان اجتمع
التلاوة والسماع ولو من جماعة ففی البدائع لا يتكرر ولو اجتمع سببا
للوجوب وهما التلاوة والسماع بان تلاها ثم سمعها او بالعكس او تكرر
احدهما اھ وفی البزازية سمعها من آخر ومن آخر ايضا وقرأها ايضا
كفت سجدة واحدة فی الاصح لاتحاد الآية والمكان اھ وفيه ايضاً
قبله لو تلا سجدات القرآن كلها او سمعها فی مجلس او مجالس وجبت
كلها اھ (ص ۸۱۱ و ۸۱۲ ج ۱) ای لاختلاف التلاوة والسماع باختلاف
المتلو والمسموع، قال فی الدر كما تتكرر لو تبدل مجلس سامع دون تال
كما لو كررها راكباً يصلی وغلامه يمشی تتكرر على الغلام لا الراكب ولا
تتكرر ای على السامع ۱۲ شامی فی عكسه وهو تبدل مجلس التالی دون السامع
على المفتى به اھ (ص ۸۱۴)
تنبیہ: يختلف المكان حقيقة بالانتقال منه الى آخر باكثر
من خطوتين كما فی كثير من الكتب او باكثر من ثلاث كما فی المحيط ما
لم يكن للمكانين حكم الواحد كالمسجد والبيت والسفينة ولو جارية
والصحراء بالنسبة للتالی فی الصلوٰة راكباً (فان الصلاة تجمع المتفرق
فكان الصحراء كله مكاناً واحداً للمصلی راكباً) وحكما وذلك بما شرعٍ عمل
يعد فی العرف قطعاً لما قبله والمسجد ولو كبيرا مكان واحد وكذا البيت
الا اذا كانت الدار كبيرة كدار السلطان اھ حليه وظاهره ان الدار
التی دونها لها حكم البيت وان اشتملت على بيوت ثم قال فی الحلية
ثم الاصل على ما فی الخانية والخلاصة ان كل موضع يصح الاقتداء
فيه بمن يصلی فی طرف منه يجعل كمكان واحد ولا يتكرر الوجوب

فیہ وما لا فلا اھ شامی (ص ۸۱۳ ج ۱) قلت فلینظر السائل فی الجواب الرابع ھل اختلف مجلسہ بمثل ھذا الاختلاف الذی لا یصح فیہ الاقتداء بمن یسن فی طرف منہ ام لا واللہ اعلم، ۲۶ محرم ۴۷ھ

آیت سجدہ کا ترجمہ پڑھنے سے وجوب سجدۂ کا حکم

سوال (۸) رسالہ النور بابت ماہ جمادی الاول صفحہ ۴ ومن آیاتہ اللیل الخ پر سرخی دے کر حاشیہ میں لکھا ہے، یہ سجدہ کی آیت ہے، اس کو پڑھ کر ناظرین پر سجدہ واجب ہو جاوے گا بشرطیکہ آیت یا ترجمہ کو زبان سے پڑھیں، اور صرف دیکھ لینے سے سجدہ واجب نہ ہوگا ۱۲ مدیر (سوال) آیت سجدہ کا ترجمہ زبان سے پڑھنے سے سجدہ واجب ہوگا یا نہیں، محقق قول کونسا ہے؟

الجواب: جو النور میں لکھا ہے کہ آیت یا ترجمہ کو زبان سے پڑھیں تو سجدۂ تلاوت واجب ہے، یہ صحیح ہے کما فی العالمگیریۃ (ص ۸۵ ج ۱) واذا قرأ اٰیۃ السجدۃ بالفارسیۃ فعلیہ وعلی من سمعھا السجدۃ فھم السامع اولا اذا اخبر السامع انہ قرأ اٰیۃ السجدۃ وعندھما ان کان السامع یعلم انہ یقرء القراٰن یلزمہ والا فلا کذا فی الخلاصۃ وقیل تجب بالاجماع وھو الصحیح، کذا فی محیط السرخسی، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۸ صفر ۴۵ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۹ صفر ۴۵ھ

نماز میں سورۂ انشقاق پڑھی جاوے توسجدۂ تلاوت ضروری ہے یا نہیں؟

سوال (۹) فرضوں میں سورۂ اقرأ، سورۂ انشقاق یعنی سجدہ والی سورۃ ارادۃً پڑھنی کیسی ہے اور انکے پڑھنے سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں،

الجواب: سورۂ انشقاق میں آیت سجدہ پڑھنے کے بعد سجدہ کیا جاوے اور بعد سجدہ کے سورۃ پوری کر کے رکوع کریں، البتہ اگر آیتِ سجدہ پر قراءۃ ختم کر دی جاوے تو تلاوت کا سجدہ مستقلاً کرنا ضروری نہیں، بلکہ نماز کا سجدہ ہی اس کی طرف سے کافی ہو جاوے گا، مگر ایسا کرنا بہتر نہیں ہے، کیونکہ سورۃ کو درمیان میں چھوڑ دینا خلاف اولیٰ ہے، ہاں اگر سورۂ علق وغیرہ (جن کے بالکل اخیر میں آیتِ سجدہ ہے یا آیت سجدہ کے بعد ایک یا دو ہی آیت ہوں) پڑھ کر اگر سجدۂ تلاوت نہ کیا جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں نماز کا سجدہ کرنے سے سجدۂ تلاوت خود بخود ادا ہو جاوے گا،

تنبیہ: اس صورت اخیرہ میں اگر رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرلے کہ اس سجدۂ تلاوت کی طرف سے بھی یہ رکوع کرتا ہوں، تب بھی سجدۂ تلاوت ادا ہو جاتا ہے، لیکن امام کو ایسا نہ کرنا

کیونکہ اگر اس نے رکوع میں نیت کرلی اور مقتدیوں کو پتہ نہ لگا، اس واسطے انھوں نے نیت نہ کی تو ان کے ذمہ سجدۂ تلاوت باقی رہ جاوے گا، واللہ اعلم احقر عبدالکریم، ۱۴ ربیع ۲ سنہ ۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

فصل فی صلوٰۃ المریض والمسافر

زوجہ کے وطن میں قصر کرے یا نہیں؟ **سوال (۱)** .... زید مع اہل وعیال سسرال میں آیا جو مقدار مسافت قصر پر ہے، زید اور اس کی بیوی قصر کرے یا نہیں؟

دیگر زید نے وطن اصلی چھوڑ کر دوسرا وطن اصلی بنالیا ہے، جہاں پر اس کی زمینات ہیں اور اس کی نگرانی دوسرے قرابت داروں کے ماتحت کیا ہے، کیا قدیم وطن اصلی کو جہاں زمینات اور دیگر قرابت دار ہیں جیسے ہمشیرہ واخ وبہنوئی آوے تو قصر پڑھے یا نہیں؟

الجواب: جس شہر میں انسان اپنا نکاح کرے وہ بھی مثل وطن کے ہو جاتا ہے، لہذا شوہر کو سسرال میں قصر نہ کرنا چاہئے، نماز پوری پڑھے، اسی طرح عورت بھی، قال فی الدر الوطن الاصلی ہو موطن ولادتہ اوتاھلہ اوتوطنہ اھ ص ۸۲۹ ج ۱ قلت وھذا لایعم مطلقا بل فیہ تفصیل کما سیأتی،

(۲) دوسری صورت میں دونوں وطن اصلی ہیں، قدیم وطن میں جب جاوے نماز پوری پڑھے، قال فی العالمگیریۃ ولو انتقل باھلہ ومتاعہ الی بلد وبقی لہ دور وعقار فی الاول قیل بقی الاول وطنا لہ والیہ اشار محمدؒ فی الکتاب کذا فی الزاھدی اھ ص ۹۱ ج ۱، واللہ اعلم، ۲۲ ربیع الاول سنہ ۳۰ھ

وطن اصلی کے متعدد ہونے اور وطن زوجہ کا وطن اصلی ہونے کی تحقیق ،،، **سوال (۲)** کبیری شرح منیہ ص ۵۹۲ میں ہے، لوتزوج المسافر ببلد ولم ینو الاقامۃ بہ فقیل لایصیر مقیما وقیل یصیر مقیما وھو الاوجہ لما مر من حدیث عثمانؓ روی الامام احمد وابوبکر بن ابی شیبۃ وابوعمر بن عبدالبر والطحاوی ان عثمانؓ صلی بمنیٰ اربع رکعات فانکر الناس علیہ فقال ایھا الناس انی تاھلت بمکۃ منذ قدمت وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من تاھل فی بلد فلیصل صلوٰۃ المقیم) ولو کان لہ اھل ببلدتین فایتھما دخلھا صار مقیما وان ماتت زوجتہ فی احدھما

وبقی له فیها دور وعقار قیل لاتبقی وطنا له اذ المعتبر الاهل دون الدار کما لو تاهل ببلدة واستقرت سکنی له ولیس له فیها دور وقیل تبقی اھ۔

حافظ عبد اللطیف صاحب نے فرمایا ہے کہ اگر زوجہ مستقل قیام (جیسا کہ نکاح سے پیشتر تھا) اپنے والدین کے وطن میں رکھے، جب تو خاوند کے لئے سسرالی وطن بن جاوے گا اور اگر (ہمارے دیار کی طرح) مستقل قیام خاوند کے وطن میں کرلیوے، اور والدین کے ہاں محض ملاقات کو آیا کرے تو خاوند سسرال میں مسافر رہے گا، (بلکہ عورت بھی اس حالت میں قصر کرے گی، کما ہو مصرح فی بہشتی زیور) احقر کی فہم ناقص میں یہ آتا ہے کہ عورت کا جس جگہ مستقل قیام ہو وہ خاوند کا وطن اصلی قرار دیا جاوے گا، اور اذ المعتبر الاہل دون الدار الخ سے یہی مفہوم ہوتا ہے، اور اس توجیہ پر خاوند کا تابع للزوجہ ہونے کا اشکال بھی نہیں ہوتا، البتہ یہ سوال ہوگا کہ وطن قدیم وطن رہے گا یا نہیں، اگر نہیں جب تو کچھ اشکال نہیں، اور اگر وہ بھی وطن رہے گا تو دو وطن ہو جائیں گے، حالانکہ الوطن الاصلی یبطل بمثلہ کے موافق وطن اصلی متعدد نہیں ہو سکتے، اور متعدد اہلیہ ہونے کی صورت میں بھی یہی اشکال ہے مسئلہ کی تحقیق فرما کر حدیث کا محمل بھی بیان فرما دیجئے، یعنی اگر قصر در سسرال علی الاطلاق نہیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا استدلال کس طرح صحیح ہوگا؟ عبد الکریم گمتھلوی

الجواب: قال فی البحر والوطن الاصلی هو وطن الانسان فی بلدته او بلدة اخری اتخذها دارا وتوطن بها مع اهله وولده ولیس من قصده الارتحال عنها بل التعیش بها وهذا الوطن یبطل بمثله لا غیر وهو ان یتوطن فی بلدة اخری وینقل الاهل الیها فیخرج الاول من ان یکون وطنا اصلیا حتی لو دخله مسافرا لایتم قیدنا بکونه انتقل عن الاول باهله لانه لو لم ینتقل بهم ولکنه استحدث اهلا فی بلدة اخری فان الاول لم یبطل ویتم فیهما، وفی المحیط ولو کان له اهل بالکوفة واهل بالبصرة فمات اهله بالبصرة وبقی له دور وعقار بالبصرة قیل البصرة لاتبقی وطنا له لانها انما کانت وطنا بالاهل لا بالعقار الاتری انه لو تأهل ببلدة لم یکن له فیها عقار صارت وطنا له وقیل تبقی وطنا له لانها کانت وطنا له بالاهل والدار جمیعا فبزوال احدهما لایرتفع الوطن کوطن الاقامة یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر اھ (ص ۱۶۳ ج ۲) ۱۲

وفی المجتبی نقل القولین فیما اذا نقل اهله ومتاعه وبقی له دور وعقار ثم قال وهذا جواب واقعة ابتلینا بها وکثیر من المسلمین المتوطنین فی البلاد ولهم دور وعقار فی القری البعیدة منها یصیفون بها باهلهم ومتاعهم فلابد من حفظها انهما وطنان له لایبطل احدهما بالآخر اھ بحر، ص ۱۳۶ ج ۲ وفی البدائع ثم الوطن الاصلی یجوز ان یکون واحدا او اکثر من ذلك بان کان له اهل ودار فی بلدتین او اکثر ولم یکن من نیة اهله الخروج منها وان کان هو ینتقل من اهل الی اهل فی السنة حتی انه لو خرج مسافرا من بلدة فیها اهله ودخل فی ای بلدة من البلاد التی فیها اهل فیصیر مقیما من غیر نیة الاقامة اھ، ص ۱۰۴ ج ۱

وفی مراقی الفلاح واذا لم ینقل اهله بل استحدث اهلاً ایضا ببلدة اخری فلا یبطل وطنه الاول وکل منهما وطن اصلی له اھ قال الطحطاوی وکذا لو استحدث اهلا فی ثلاث مواضع فالحکم واحد فیما یظهر اھ، ص ۲۴۹ وفی فتح القدیر وطن اصلی وهو مولد الانسان او موضع تاهل به ومن قصده التعیش به لا الارتحال ولو تزوج المسافر فی بلد لم ینو الاقامة فیه قیل یصیر مقیما وقیل لا اھ، ص ۱۶ ج ۲ وفی الکفایة ولو کان له اهل ببلدة واستحدث فی بلدة اخری اهلا آخر کان کل واحد منهما وطنا اصلیا له روی انه کان لعثمانؓ اهل بمکة واهل بالمدینة وکان یتم الصلوٰة بهما جمیعا اھ ص ۱۷ ج ۲،

وفی الخلاصة المسافر اذا جاوز عمران مصره فلما سار بعض الطریق تذکر شیئا فی وطنه فعزم الرجوع الی الوطن لذلك ان کان ذلك وطنا اصلیاً بان کان مولده فیه اولم یکن مولده لکن تاهل فیه وجعله دارا یصیر مقیما بمجرد العزم الی الوطن اھ ص ۱۹۸ ج ۱ وفیه ایضًا ص ۱۹۹ ج ۱ ما نصه وانما یصیر المسافر مقیما اما بدخول مصر اله فیه اهل او بان بداله لعوده الیه الخ وفی الفتاوی السراجیة اذا دخل المسافر بلدة له فیها اهل صار مقیما نوی الاقامة اولا اھ ص ۶۲ ج ۱،

ان نصوص فقہیہ سے چند امور مستنبط ہوئے :- (۱) وطن اصلی وہ ہے جس میں تعیش مع الاہل ہو، اور وہاں سے ارتحال ونقلِ اہل کا قصد نہ ہو (۲) جب کسی دوسرے مقام میں

توطن کا ارادہ ہو تو بدونِ نقلِ اہل کے پہلا وطن باطل نہ ہوگا، (۳) وطن اصلی متعدد ہو سکتے ہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص چار نکاح چار شہروں میں کرے اور ہر بیوی کو اسی کے شہر میں رکھے تو اس شخص کے چار وطن اصلی ہو جائیں گے، (۴) جس شہر میں کسی شخص کے اہل وعیال کا مستقل قیام ہو خواہ کرایہ کے مکان میں یا ذاتی مکان میں وہاں جب مسافر ہو کر پہنچے گا تو قصر باقی نہ رہے گا، بلکہ اتمام ضروری ہوگا جیساکہ بعض ملازمانِ سرکاری اپنے اہل وعیال کو جائے ملازمت میں مستقل طور پر رکھتے ہیں، پھر وہاں سے مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہیں، یہ لوگ جب اپنے اہل وعیال کی قیام گاہ پر پہونچیں گے مقیم ہو جاویں گے، یدل علیہ جزئیۃ السراجیۃ والمجتبیٰ، (۵) کسی شہر میں محض نکاح کر لینے سے وہ وطن اصلی نہیں ہو جاتا، بلکہ اہل کا وہاں رکھنا، اور وہاں سے منتقل نہ کرنا شرط ہے، چنانچہ عبارتِ بحر میں وتوطن بہا مع اہلہ ولیس من قصدہٖ الارتحال عنہا بل التعیش بہا، اور عبارت فتح میں اوموضع تاہل بہ ومن قصدہ التعیش بہ لا الارتحال، اور عبارتِ خلاصہ میں اولم یکن مولدہٗ ولکن تاہل فیہ وجعلہ دارًا، تاہل کے ساتھ قصد تعیش وجعل دار کی قید صاف مذکور ہے، اور حضرت عثمانؓ کے قصہ میں بھی اُن کے اتمام کا سبب محض تزوج نہ تھا، بلکہ تزوّج کے بعد اہل کا مکہ میں رکھنا اس کا سبب تھا، چنانچہ کفایہ کی عبارت میں اس کی تصریح ہے روی انہ کان لعثمانؓ اہل بالمدینۃ واہل بمکۃ وکان یتم بہما جمیعًا اھ، اور حدیث من تاہل ببلدۃ فلیصل فیہا صلوٰۃ المقیم کا بھی یہی محمل ہے، یعنی من تاہل ببلدۃ واسکن اہلہ فیہا ولم ینقلہا عنہا، کیونکہ اگر مطلق تزوج ببلدۃ موجبِ قصر ہو جاوے خواہ زوجہ کو وہاں رکھے یا نہ رکھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں قصر نہ کرنا چاہئے تھا، کیونکہ آپؐ نے حضرت سودہ بنت زمعہؓ سے مکہ میں نکاح کیا تھا، اور حضرت سودہ کے باپ کا گھر وہاں موجود تھا، اُن کے بھائی وغیرہ بھی وہاں موجود تھے، نیز حضرت میمونہؓ نے آپؐ سے مکہ ہی میں نکاح کیا تھا، اور ان کا خاندان مکہ میں تھا، مگر صحیحین سے ثابت ہے کہ آپؐ نے مکہ میں قصر کیا ہے، اور بعد نماز کے فرماتے تھے یَا اَھْلَ مَکَّۃَ اَتِمُّوْا صَلٰوتَکُمْ فَاِنَّا قَوْمٌ سُفْرٌ، وفی الفتح ص ۴۷۰ ج ۲ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یسافر بزوجاتہ وقصر، اور یہ بھی صحاح میں ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں تمام ازواج کو ساتھ لائے تھے، جن میں بعض کا پہلا وطن مکہ میں تھا، لیکن بایں ہمہ حضورؐ نے قصر کیا ہے،

پس صورتِ مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں نکاح کر کے زوجہ کو وہاں

نہ رکھے بلکہ اپنے شہر میں لے آئے تو زوجہ کا وطن شوہر کا وطن اصلی نہ ہوگا، شوہر جب وہاں مسافر ہو کر گذرے تو قصر کرے گا، اور اگر زوجہ کو اسی کے وطن میں رکھے تو اس کا وطن زوج کا وطن ہو جائے گا، خواہ زوج کا مستقل قیام اپنے وطن میں رہتا ہو یا دونوں جگہ رہتا ہو، اس پر غالباً سائل کو کبیری کے اس جزئیہ سے اشکال پیش آئے گا، لو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الاقامۃ فقیل لایصیر مقیما وقیل یصیر مقیما وھو الاوجہ لما مر من حدیث عثمان اھ یہی جزئیہ فتح القدیر میں بھی ہے کما مر، مگر موجب اشکال کچھ نہیں، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسافر نے ایک شہر میں نکاح کیا، اور اس کا ارادہ بنفسہ وہاں قیام کرنے کا نہیں (لیکن زوجہ کو وہیں رکھنے کا ارادہ ہے) تو اوجہ یہ ہے کہ وہ مقیم ہو جائے گا، جیسا کہ حدیث عثمان رضؓ سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت عثمانؓ باوجودیکہ مکہ میں مقیم نہ تھے، اور نہ اُن کو مکہ میں اقامت جائز تھی، قال فی الفتح ان الاقامۃ بمکۃ علی المہاجرین حرام کما سیأتی، اھ، ص ۴۰۰، ج ۲، لیکن پھر بھی انھوں نے قصر نہ کیا، کیونکہ ان کی ایک اھل مستقل طور پر مکہ میں مقیم تھی، اس سے معلوم ہوا کہ شوہر کا مستقل قیام گو اپنے وطن میں ہو لیکن جب اس کی بیوی کا مستقل قیام دوسری جگہ ہوگا تو شوہر وہاں جا کر مقیم ہو جائے گا، کما مر عن السراجیۃ اذا دخل المسافر بلدۃ لہ فیہا اھل (ای مقیمۃ) صار مقیما نوی الاقامۃ اولا، اور جن قائلین نے اس صورت میں شوہر کو مقیم نہیں مانا، جیسا کہ کبیری میں دوسرا قول مذکور ہے، انھوں نے اس پر نظر کی ہے، کہ جب شوہر کا قیام زوجہ کے بلد میں نہیں رہتا اور نہ وہ اقامت کا وہاں قصد کرتا ہے تو پھر اس کو مقیم نہ کہنا چاہیے مسافر ہی ماننا چاہیے، اور حدیث عثمانؓ کو نیت اقامۃ پر حمل کرتے ہیں، مگر اس کا جواب یہ ہے کہ مرد کا زوجہ کو مستقلاً کسی مقام پر رکھنا یہ عملاً اقامت ہے، لانہ لایخلو عن نوع تعیش بہ وتاہل، لہٰذا اس صورت میں نیت عدم اقامت کا اعتبار نہ ہوگا، لاسیما وقد تأید بحدیث عثمان وانہ اتم بمکۃ مستدلا بہ مع انہ لم یقم بہا البتۃ فافہم،

فائدہ: حدیثِ عثمان رضؓ جس سے کبیری میں احتجاج کیا ہے محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، قال الحافظ فی الفتح والاول وان کان نقل واخرجہ احمد والبیہقی من حدیث عثمان انہ لما صلیٰ بمنیٰ اربع رکعات انکر الناس علیہ فقال انی تاھلت بمکۃ لما قدمت وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من تاھل ببلدۃ فانہ یصلی صلوۃ مقیم فہذا الحدیث لایصح لانہ منقطع

وفی روایۃ من لا یحتج بہ اھ ص ۴۷۰ ج ۲ وفی عمدۃ القاری قلت ھذا منقطع اخرجہ البیہقی من حدیث عکرمۃ بن ابراھیم وھو ضعیف عن ابن ابی ذباب عن ابیہ اھ ص ۵۳۳ ج ۳ قلت لم ینسبہ احد الی الکذب قال النسائی ضعیف وقال العقیلی فی حدیثہ اضطراب وقال النسائی فی التمییز لیس بثقۃ وقال یعقوب بن سفیان منکر الحدیث وقال البزار لین الحدیث وقال ابو حامد الحاکم لیس بالقوی اھ لسان المیزان ص ۱۸۱ و ۱۸۲ ج ۴ ویظھر من التقریب وشرحہ التدریب ان قولھم لین الحدیث من ادنی مراتب الجرح وھو قریب من التعدیل وقولھم لیس بالقوی یکتب حدیثہ ایضاً ولا یطرح بل یعتبر بہ ص ۱۲۶ و ۱۲۷ فعکرمۃ ھذا لیس ممن یترک حدیثہ وقال السیوطی فی خطبۃ کنز العمال وکل ما کان فی مسند احمد فھو مقبول فان الضعیف الذی فیہ یقرب من الحسن اھ والحدیث رواہ احمد فی مسندہٖ ص ۶۲ ج ۱ وعلۃ الانقطاع لا تضر عندنا واللہ اعلم، ۲۷ رج ۲ ۱۳۴۱ھ

معذور کیلئے استقبالِ قبلہ کی شرط کا ساقط ہوجانا

سوال (۳) ....

جو شخص ایسا مجبور ہو کہ رُو بقبلہ ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا، نہ اس طریق سے نماز پڑھ سکا جو طریق صاحبِ فراش کے لئے فقہاء نے تحریر فرمایا ہے ایسی مجبوری میں جس طریق سے اور جس پہلو سے نماز ادا ہو سکے پڑھ لی، اکثر نمازیں مجبوراً مشرق کو مُنہ کر کے چارپائی پر پڑے پڑے ادا کی گئی ہیں، آیا یہ نمازیں صحیح اور درست ہیں یا قابلِ اعادہ ہیں، اور جو شخص بمجبوری قبلہ کو مُنہ کر کے نماز نہ پڑھ سکے، اس کو غیر قبلہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنا چاہیئے، یا وقت مجبوری تک نماز موقوف رکھنا چاہیئے یا اس کو مجبوری کی حالت میں جس طرح بن پڑے ادا کرے، پھر بعد مجبوری ان نمازوں کو ادا کریں، مسئلۂ شرعی بیان فرما کر اجر اللہ سبحانہ سے حاصل فرماویں،

الجواب: قال فی مراقی الفلاح وقد منا جواز التوجہ لما قدر علیہ بلا عسر وسقوط التوجہ الی القبلۃ بعذر المرض ونحوہ اھ ص ۲۵۱ وفی العالمگیریۃ فان کان یعرف القبلۃ ولکن لا یستطیع ان یتوجہ الی القبلۃ ولم یجد احدا یحولہ الی القبلۃ فی ظاھر الروایۃ انہ یصلی کذلک ولا یعید فان وجد احدا یحولہ الی القبلۃ ینبغی ان یامرہ حتی یحولہ فان لم یامرہ وصلی علی غیر القبلۃ لا یجوز

اھ، ص ۸۸ ج ۱، اس سے معلوم ہوا کہ جب مریض استقبالِ قبلہ پر قادر نہ ہوا اور نہ کوئی قبلہ کی طرف متوجہ کرنے والا موجود ہو تو اس کو غیر قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھنی چاہئے اور نماز کو مؤخر نہ کرے، اور ان نمازوں کا اعادہ بھی نہیں، لیکن اگر قبلہ کی طرف متوجہ کرنے والا موجود تھا اور اس سے بدون کہے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی، تو نماز صحیح نہ ہوگی، اور اگر کہا لیکن اس نے کہنے پر عمل نہ کیا تو نماز درست ہوگئی، واللہ اعلم، ۲۲ رجب سنہ ۴۱ھ

اس سفر کا حکم جس کے درمیان میں وطنِ اقامت واقع ہو،

سوال (۴) ایک شخص تھانہ بھون میں مقیم ہے اور سہارنپور کسی غرض سے آیا، اور سہارنپور سے دہلی جانے کا قصد کرکے تھانہ بھون سے گذرا، اور اسباب وغیرہ اس کا تھانہ بھون ہی میں موجود ہے، پس ایسی حالت میں وہ تھانہ بھون میں قصر کرے گا یا اتمام اور اسباب عام ہے، یا ضروریہ کی تخصیص ہے؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں یہ شخص جب سہارنپور سے بہ نیت سفر دہلی چل کر تھانہ بھون میں داخل ہوگا تو تھانہ بھون میں اتمام کرے گا، کیونکہ اس صورت میں انشاء سفر من وطن الاقامۃ نہیں ہوا، بلکہ انشاء سفر من موضع غیرہ ہوا ہے، اور جب انشاء سفر موضع اقامت سے نہ ہو، بلکہ دوسرے موضع سے ہو تو وطن اقامت کے باطل ہونے کی شرط یہ ہے، کہ انشاء سفر میں اس پر مرور نہ ہو، یا اگر مرور ہو تو بعد مسافت ثلٰثہ ایام قطع کر چکنے کے بعد مرور ہو، اگر مسافت ثلٰثہ ایام قطع کرنے سے پہلے وطنِ اقامۃ پر گذر ہوا (یعنی اس میں داخل ہوا) تو اتمام کریگا بلکہ اس صورت میں وہ سہارنپور سے چل کر مسافر ہی نہیں ہوا جبکہ اس کا ارادہ درمیان میں وطنِ اقامۃ میں داخل ہونے کا ہے، قال العلامۃ الشامی والحاصل ان انشاء السفر یبطل وطن الاقامۃ اذا کان منہ اما لو انشاءہ من غیرہ فان لم یکن فیہ مرور علیٰ وطن الاقامۃ اوکان ولکن بعد سیر ثلثۃ ایام فکذلک ولوقبلہ لم یبطل الوطن بل یبطل السفر لان قیام الوطن مانع من صحتہ واللہ اعلم اھ وفیہ ایضا قال فی الفتح ان السفر الناقض لوطن الاقامۃ ما لیس فیہ مرور علیٰ وطن الاقامۃ اوما یکون فیہ المرور بہ بعد سیر مدۃ السفر اھ، ص ۸۳۰ ج ۱،

اب یہ صورت باقی رہی کہ اگر کوئی شخص مسافۃ ثلٰثہ ایام قطع کرنے کے بعد وطن اقامۃ پر گذرا، مگر وہاں قیام کا ارادہ نہیں، بلکہ آگے جانے کا ارادہ ہے، اور وطنِ اقامۃ میں اس کا اسباب وغیرہ موجود ہے، اس صورت میں یہ شخص وطنِ اقامۃ میں قصر کرے یا اتمام؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب مسافتِ سفر قطع کرنے کے بعد وہ وطن اقامت میں داخل ہوا، اور اس کے بعد بھی مسافتِ سفر کا ارادہ ہے تو اب یہ اس کا وطن اقامۃ باقی نہیں رہا، سفر سے اس کی وطنیت باطل ہوگئی، اور اسباب کا باقی رہنا بطلانِ وطنیت بالسفر کو مانع نہیں، ہاں اگر وطنِ اقامۃ سے منتقل ہو کر دوسری جگہ وطنِ اقامۃ بنانا چاہے اور ان دونوں کے درمیان مدتِ سفر نہ ہو تو پہلا وطن محض انتقال سے باطل نہ ہوگا، بلکہ انتقال بنفسہ و انتقال بالمتاع کے مجموعہ سے باطل ہوگا حتیٰ کہ اگر دوسرے موضع میں نیت اقامۃ کرے اور موضع اوّل میں اس کا اسباب باقی ہے اور متاع سے مراد متاع ضروری ہے، الذی یعد الرجل ببقائہ مقیما عرفا کاثاث البیت الذی لابد منہ والدار والعقار، پس بقاء متاع انشاء سفر کی صورت میں مانع بطلانِ وطنیت نہیں بلکہ نیت اقامۃ بموضع آخر کی صورت میں بقاءِ متاع بطلان وطنیت موضع اوّل کے لئے مانع ہے قال فی البحر کوطن الاقامۃ یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر اھ ص ۱۳۶ ج ۲ وفی العالمگیریۃ ووطن الاقامۃ ووطن الاقامۃ یبطل بوطن الاقامۃ وبانشاء السفر وبالوطن الاصلی ھکذا فی التبیین وفی الکفایۃ ومن حکم وطن السفر انہ ینتقض بالوطن الاصلی لانہ فوقہ وینتقض بوطن الاقامۃ لانہ مثلہ وینتقض بانشاء السفر لانہ ضدہ اھ ص ۱۷۱ ج ۲) البتہ اگر وطن اقامۃ میں اس شخص کے اہل وعیال کا مستقل قیام ہو تو وہاں جا کر یہ شخص معاً مقیم ہو جاوے گا، گو نیتِ اقامت نہ ہو، کما قدمنا فی السوال السابق عن السراجیۃ مسافر دخل بلدۃ فیھا اھلہ یصیر مقیماً وان لم ینو الاقامۃ اھ

ایک صورت اور باقی ہے وہ یہ کہ کسی شخص نے وطن اقامۃ سے سفر کا قصد نہیں کیا، بلکہ وہاں سے کسی دوسری جگہ گیا، اور وہاں سے سفر کا قصد کیا، اور مسافتِ سفر قطع کر کے وطن اقامۃ میں داخل ہوا مگر نیتِ قیام نہیں، آگے جانے کا ارادہ ہے، لیکن آگے جس جگہ جانے کا ارادہ ہے وہ موضعِ وطنِ اقامت سے مدتِ سفر پر نہیں ہے، اس صورت میں وطنِ اقامت پر پہونچ کر اس شخص کو اتمام کرنا چاہئے، فی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح وبقی ما اذا خرج منہ علی نیۃ السفر الاولی ثم جاوزہ بمدۃ سفر منہ او من الاصلی ولم یقم فی غیرہ ثم مر بہ ھل تیم وظاھر کلامھم نعم لانہ لم یدخل الاصلی ولم یقم فی غیرہ ولم ینشیٔ سفرا بعدہ وحررہ اھ ص ۲۴۹،

خلاصہ یہ ہوا کہ وطنِ اقامت سے اگر انشاءِ سفر کا قصد کیا جاوے، اس صورت میں تو خروج من العمران کے بعد ہی وطنِ اقامت باطل ہو جائے گا، قال الشامی وافاد قولہ و اما المکی الخ ان انشاء السفر من وطن الاقامۃ مبطل لہ وان عاد الیہ ولذا قال فی البدائع لو اقام خراسانی بالکوفۃ نصف شہر ثم خرج منھا الی مکۃ، فقبل ان یسیر ثلاثۃ ایام عاد الی الکوفۃ لحاجۃ فانہ یقصر لان وطنہ قد بطل بالسفر اھ ص ۸۳۰ ج ۱، اور اگر انشاءِ سفر وطنِ اقامت سے نہ ہو تو بطلانِ وطنِ اقامت کی شرط یہ ہے کہ اثناءِ سفر میں وطنِ اقامت میں دخول نہ ہو، یا اگر دخول ہو تو بعد قطعِ مسافت ثلاثہ ایام ہو اور آگے جس جگہ کا ارادہ ہے وہ بھی وطنِ اقامت سے مسافتِ سفر پر ہو، اگر قطعِ مسافتِ سفر کے بعد وطنِ اقامت میں داخل ہوا اور آگے جہاں جانے کا قصد ہے وہ وطنِ اقامت سے مسافتِ قصر پر نہیں تو وطنِ اقامت باطل نہ ہوگا، اور اس شخص کو اتمام کرنا لازم ہوگا، واللہ اعلم، ۲ر شعبان ۱۳۴۱ھ

بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے لئے رکوع کرنے کا طریقہ

سوال (۵) اگر آدمی معذور ہو اور بیٹھ کر نماز پڑھے تو رکوع کے وقت سُرین اٹھاوے یا نہیں؟

الجواب: قال فی مراقی الفلاح وفی الحموی فان رکع جالسا ینبغی ان تحاذی جبھتہ رکبتیہ لیحصل الرکوع اھ ولعل مرادہ انحناء الظھر عملا بالحقیقۃ لانہ یبالغ فیہ حتی یکون قریبا من السجود اھ، ص ۱۳۲،

اس سے معلوم ہوا کہ بحالتِ جلوس رکوع کرتے ہوئے صرف اتنا ضروری ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کر دیا جائے، اس سے زیادہ جھکنے کی ضرورت نہیں، نہ سُرین اٹھانے کی ضرورت ہے، واللہ اعلم، ۱۸ر شوال ۱۳۴۱ھ

کشتی اور جہاز کے ملاحوں کے لئے نمازِ قصر پڑھنے کی تحقیق، نیز فناءِ مصر کی تعریف، اور بندرگاہ پر نیتِ اقامت کا حکم

سوال (۶) تمہید مسائل ذیل: رسالہ الامداد ۱۳۳۴ھ کے جمادی الاولیٰ کے نمبر میں ایک فتویٰ محررہ حکیم الامۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب دام مجدہم، متعلق مسافر سفینہ کے شائع ہوا تھا، ایک صاحب نے رنگون سے اس پر کچھ شبہات معہ اپنی تحقیق کے لکھ کر بھیجے، یہاں سے ان شبہات کا جواب اور اس تحقیق پر تنقید لکھی گئی، جو ذیل میں اس ترتیب سے منقول ہیں، اوّل خط، ثانیاً

وہ تحقیق بصورتِ فتویٰ، ثالثاً وہ تنقید،

خط آمدہ از رنگون؛۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حضرت والا آپ کا فتویٰ مندرجہ رسالہ الامداد ماہ جمادی الاول ۱۳۳۱ھ احقر کی نظر سے گذرا، آپ نے جو جواب ارقام فرمایا ہے اس کے متعلق عاجز کے ذہن میں چند شبہات پیدا ہوگئے ہیں، امید کہ آپ تشفی فرما کر ممنون فرمائیں گے،

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "خلاصہ جواب یہ ہوا کہ کشتی و جہاز میں اقامت کی نیت معتبر نہیں ہے، جب تک کہ اس کے کھڑے ہونے کی جگہ موقع آبادی سے متصل نہ ہو" یہ تو آپ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ کشتی و جہاز میں اقامت کی نیت معتبر نہیں ہے، لیکن جب کشتی آبادی کے متصل کھڑی ہو تو نیتِ اقامت درست فرماتے ہیں، اب گذارش یہ ہے کہ آپ نے یہ حکم کہاں سے اخذ کیا ہے، (۱) اگر آپ نے فِناءِ مصر پر قیاس کیا ہے تو قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فناءِ مصر محلِ اقامت ہے، لہذا اس کو مصر کے ساتھ ملحق کر دیا گیا، لیکن جب کشتی و جہاز اقامت کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور دریا محلِ اقامت نہیں ہے تو آبادی کے قرب کی وجہ سے اُن میں کیونکر صلاحیت پیدا ہوگی؟

(۲) اگر آپ نے فقہاء کی تصریح اس بارہ میں دیکھی ہے تو اس سے مطلع فرمائیے تاکہ دفعِ خلجان ہو،

(۳) اس بارے میں آپ نے جو عباراتِ فقہیہ تحریر فرمائی ہیں ان سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ جب کشتی آبادی کے متصل ہو تو نیتِ اقامت درست ہی، ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہی کہ دریا کا کنارہ جبکہ سلسلہ آبادی کا وہاں تک متصل چلا گیا ہو فناءِ مصر میں داخل ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دریا بھی فناءِ مصر میں داخل ہے،

(۴) جب مصر اور فناءِ مصر کے درمیان کوئی باغ یا بڑا میدان یا جنگل حائل ہو اس وقت وہ مصر کے حکم سے خارج ہوجاتا ہے، تو جہاز اور کشتی جو دریا میں لنگر انداز ہوتی ہے اس میں بہ تبعیتِ مصر کیونکر اقامت درست ہوسکتی ہے، حالانکہ فناءِ مصر اور باغ اور میدان وجنگل کے درمیان قطع مسافت ہی، کوئی شئی مانع نہیں ہے، اور جہاز اور خشکی کے مابین پانی کا حصّہ آمد و رفت سے مانع ہے، اور بغیر حیلہ وعلاج کے عبور عادۃً ناممکن ہے،

(۵) جب یہ قاعدہ کلیہ ہو کہ بحر و کشتی محلِ اقامت نہیں ہو تو جب تک اس کے خلاف فقہاء کی کوئی تصریح نہ ملے اس کے خلاف حکم دینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

(۶) عالمگیری سے بحوالہ عتابیہ آپ نے جو عبارت نقل کی ہے وہ تو اس شخص کے حق میں ہے کہ جو اپنے وطنِ اصلی سے سفر کرتا ہو، ظاہر ہے کہ کشتی لوٹنے کے بعد وہ اپنے وطن اصلی میں پہنچ گیا ہے، پس اس کی اقامت بسبب وطن اصلی کے ہو فقط، فی الحقیقت یہاں ان لوگوں کے متعلق بحث ہو جو مسافتِ بعیدہ سے آکر یہاں کام کرتے ہیں، جو دریا کے متصل کسی قریہ یا آبادی میں مقیم نہ ہوں، ان لوگوں کے متعلق نہیں ہے، جو کسی مصر یا قریہ میں مقیم ہونے کے بعد جہاز میں ملازم ہوئے ہوں، کیونکہ ان کی اقامت کی صحت وطن اصلی یا وطنِ اقامت کی وجہ سے ہے جس کی تفصیل فتویٰ میں جو اس کے ساتھ منسلک ہے موجود ہے،

(۷) دریا فناء مصر میں شامل ہے کہ نہیں؟

(۸) بحرالرائق کی اس عبارت (لان نیۃ الاقامۃ لا تصح فی غیرہما فلا تصح فی مفازۃ ولا جزیرۃ ولا سفینۃ اھ) سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر اور کشتی محلِ اقامت نہیں، شامی وغیرہ کی عبارت میں بھی بحر کو سفینہ پر عطف کیا گیا ہے جس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ کشتی اگرچہ کنارہ پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تو بھی اس میں اقامت درست نہیں ہے، بحر پر سفینہ کا عطف اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں سے دو چیزیں مراد ہوں، کیونکہ بحر میں بجز کشتی کے اقامت کی کوئی صورت نہیں، پس اس پر سفینہ کو عطف کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سفینہ سے یہ مراد ہو کہ جب وہ کنارہ پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تو بھی اس میں اقامت درست نہیں ہو حقیقت سے مجاز کی طرف رجوع کرنا بدون قرینۂ صارفہ کے صحیح نہیں ہے، فی الجملہ فقہاء کی تصریحات سے مترشح ہوتا ہے کہ بحر اور سفینہ محلِ اقامت نہیں ہے، پس اس کے حکم کے خلاف حکم دینے کے لئے صریح دلیل کی ضرورت ہے، دست بستہ عرض ہے کہ ان شبہات کے دفعیہ کی طرف توجہ مبذول فرمادیں، جناب کا وہ فتویٰ جو رسالہ الامداد ماہ جمادی الاول ۳۴ھ میں مندرج ہے دستیاب ہونے سے قبل میں نے یہ فتویٰ لکھا تھا، اگر قبل اس کے آپ کا فتویٰ ملتا تو بغیر جواب تحریر کئے محض شبہات کو آپکی خدمت میں بھیجدیتا، اب گذارش ہو کہ از راہِ نوازش جواب تحریر فرما کر تسکین فرمائیں،

تحقیق صاحب خط کیا فرماتے ہیں علمائے دین رحمکم اللہ تعالیٰ، ان جہاز رانوں اور کشتی بانوں کے حق میں کہ جن کے جہاز اور کشتی اپنے بنادر اور قرارگاہوں سے کہیں دور دراز فاصلہ اور مسافتِ طویلہ میں جاتے ہیں جس سے مقدارِ مدّتِ سفر قائم نہیں ہوتی، بلکہ اکثر مقاماتِ قریبہ ومضافاتِ غیر بعیدہ میں روزانہ دورہ کرتے رہتے ہیں، اور عموماً ارات کو بعد اختتامِ کام حسبِ معمول اپنی اپنی قرارگاہ میں آکر لنگر انداز ہوتے ہیں، مندرجہ بالا جہاز اور کشتی کے ملازمین واہل کار جو غیر ممالک کے باشندے ہوتے ہیں انھیں جہاز اور کشتیوں میں رہتے ہیں، ان کا کھانا پینا، سونا ودیگر حوائج ضروریہ کے لئے پورا انتظام جہاز اور کشتی ہی میں ہوتا ہے، تتبع واستقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ سابق الذکر جہاز اور کشتی کے ملازمین واہل کار تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ کہ اپنے وطن سے آکر شہر یا گاؤں میں اوّلاً کوئی جگہ اقامت کی نیت کر کے مقیم ہوجاتے ہیں، پھر کچھ دنوں کوشش وتلاش کے بعد کسی جہاز یا کشتی میں ملازم ہوجاتے ہیں، دوسرے وہ کہ وطن سے آکر بحیثیت ملازم قدیم براہِ راست اپنی منصب پر مامور ہوجاتے ہیں اور انھیں کسی غیر جگہ پر اقامت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، تیسرے وہ کہ بجستجوئے ملازمت کسی شہر یا گاؤں پر بلانیت اقامت تاحصولِ ملازمت ٹھہر جاتے ہیں اور بعدہٗ ملازم ہوکر کسی جہاز یا کشتی میں جاکر اپنے کام میں مصروف ہوجاتے ہیں، پس ایسے لوگوں کو پوری نماز پڑھنی چاہیے یا قصر؟ اس بارے میں حکم شرع کیا ہے؟

الجواب واللہ الموفق للصواب اوّل الذکر لوگوں کو پوری نماز ادا کرنی ہوگی، کیونکہ بوجہ نیت اقامت وعدم موانع حکم سفر ان کا باطل ہوگیا، اور وہ لوگ مقیم ہوگئے لما فی الکبیری ثم لایزال المسافر علی حکم السفر حتی ید خل وطنہ او ینوی اقامۃ خمسۃ عشر یوما بموضع واحد من مصر او قریۃ وفی البحر عن المجتبیٰ لایبطل السفر الابنیۃ الاقامۃ او دخول الوطن او الرجوع قبل الثلاثۃ اھ، اگرچہ یہ لوگ جہاز ہی میں رہتے ہیں، اور دوسرے کسی مسکن سے تعلق نہیں رکھتے ہیں، مگر بسبب اس کے کہ اقامۃ ان کی صحیح اور ثابت ہوگئی ہے، تاوقتیکہ مدتِ سفر کی مسافت میں نہ جائیں اقامت اُن کی باطل نہ ہوگی وہ ہمیشہ مقیم کہلائیں گے، ہاں اگر کبھی تین دن یا اس سے زیادہ کی مسافت میں سفر کریں تو وطنِ اقامت اُن کا باطل ہوجائیگا پھر بعد مراجعت بدون نیتِ اقامت کے مقیم نہیں ہوسکتے ہیں، عالمگیری میں ہے ووطن الاقامۃ

یبطل بوطن الاقامۃ بانشاء السفر وبالوطن الاصلی الخ، وفی شرح الوقایۃ واما وطن الاقامۃ فانہ یبطل بوطن الاقامۃ الی قولہ لم یبق الموضع الاول وطن الاقامۃ حتی لو دخلہ لایصیر مقیما الا بالنیۃ وکذا ان سافر عنہ الخ فی الجملہ ان کا مقیم کہلانا از جہت صحت اقامت فی السفن کے نہیں ہے بلکہ بسبب اس اقامت ثابتہ کے ہے جو قبل ملازمت کسی شہر یا گاؤں میں جولبِ دریا آباد ہیں، وقوع میں آئی ہے، کما یدل علیہ ما فی العالمگیریۃ ولا یصیر مقیما بنیۃ الاقامۃ فیہا وکذلک صاحب السفینۃ والملاح الا ان تکون السفینۃ بقرب من بلدتہ او قریتہ فح یکون مقیما باقامتہ الاصلیۃ، اھ،

دوسرے اور تیسرے قسم کے لوگوں کو تا بقائے قیام فی السفن نماز قصر کرنی ہوگی، کیونکہ قبل اس کے کہ وہ لوگ کسی جہاز یا کشتی میں ملازم ہوں شہر یا گاؤں میں کسی جگہ مقیم نہیں ہوئے اس لئے مسافرت ان کی باطل نہیں ہوئی، جب تک نیتِ اقامت بمحل صالح اقامت ان سے وقوع میں نہ آئے، حکم سفر اُن پر ہمیشہ جاری رہیگا، کمافی الوقایۃ ولو رخص تن وم وان کان عاصیا فی سفرہ حتی یدخل بلدہ او ینوی اقامۃ نصف شہر ببلدۃ او قریۃ اھ وفی الھدایۃ ولایزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامۃ فی بلدۃ او قریۃ خمسۃ عشر یوما الخ، جہاز اور کشتی موضع صالح اقامت نہیں ہے، جو شرط ہے صحتِ اقامت کے لئے، لہٰذا اس میں نیتِ اقامت کرنے سے بھی اقامتِ شرعی ثابت نہیں ہوتی،

بنا برین متذکرہ بالا تین قسم کے لوگوں میں سے قسم دوم وسوم کے ملازمین کا شمار ہمیشہ مسافرت ہی میں رہے گا، اس لئے اُن کے حق میں صلوٰۃ رباعیہ میں قصر واجب ہے، درمختار میں ہے والحاصل ان شروط الاتمام ستۃ، النیۃ والمدۃ واستقلال الرائی وترک السیر واتحاد الموضع وصلاحیتہ اھ، وفی العالمگیریۃ ونیۃ الاقامۃ انما تؤثر بخمس شرائط ترک السیر حتی لو نوی الاقامۃ وھو یسیر لم تصح وصلاحیۃ الموضع حتی لو نوی الاقامۃ فی بر او بحر او جزیرۃ لم تصح والمدۃ واتحاد الموضع والاستقلال بالرائ اھ

مندرجہ بالا دلائل سے ثابت وروشن ہے کہ جہاز اور کشتی قابلِ اقامت اور صالح سکونت نہیں ہے، اس لئے نیت اقامۃ شرعاً اس میں صحیح نہیں ہے، پس اگر کوئی شخص

معہ اپنے اثاث البیت اور اہل وعیال کے جہاز یا کشتی میں سکونت اختیار کرے تو بھی وہ شخص شرعاً مقیم نہیں ہوسکتا ہے بہ سبب نیت اقامت کے کما فی الطحطاوی علی مراقی الفلاح (قولہ لاتصح نیۃ الاقامۃ فی مفازۃ) مثلہا الجزیرۃ والبحر والسفینۃ والملاح مسافر وسفینتہ لیست بوطن الاعند الحسن الخ وکما فی رد المحتار قال فی المجتبیٰ والملاح مسافر الاعند الحسن وسفینتہ ایضاً لیست بوطن اھ بحر وظاہرہ ولوکان مالہ واھلہ معہ فیہا ثم رأیتہ صریحاً فی المعراج اھ (فی البحر وقید بالبلد والقریۃ لان نیۃ الاقامۃ لاتصح فی مفازۃ ولاجزیرۃ ولا بحر ولا سفینۃ اھ

نوٹ: وہ لوگ جو قبل ملازمت جہاز کے کسی گاؤں یا شہر میں مقیم ہوجاتے ہیں اور اقامت کی نیت کرلیتے ہیں، اور بعد قیام ملازمتِ جہاز اختیار کرکے تین روز سے کم کی مسافت میں سفر کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کو نماز پوری پڑھنی ہوگی، خواہ وہ جہاز ہی میں رہتے ہوں البتہ اگر کبھی تین روز یا اس سے زیادہ کی مسافت میں سفر کریں تو وطن اقامت ان کا باطل ہوجائے گا، بعد مراجعت بدون نیت اقامت کے مقیم نہیں ہوسکتے، جب تک جہاز میں رہیں نماز... قصر کرنی ہوگی، جو لوگ وطن سے آکر سیدھے جہاز میں قیام کرتے ہوں یا پندرہ یوم سے کم کسی گاؤں یا شہر میں بغیر نیت اقامت ٹھہر کر جہاز میں نوکری اختیار کرلیتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے قصر واجب ہے، واللہ اعلم وعلمہ احکم، نمقہ محمد یعقوب غفرلہ

الکلام علی الجواب المذکور اجمالاً من جامع امداد الاحکام

سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جہاز رانوں اور ملاحوں کے لئے بنادر اور قرارگاہیں متعین ہیں، جہاں وہ رات کو عموماً دورہ ختم کرکے لنگر انداز ہوتے ہیں، پس یہ بنادر ان لوگوں کے حق میں ایسے ہیں جیسے ملازمانِ ریلوے کے لئے اسٹیشن، تو اگر یہ بنادر کسی شہر یا قریہ کے متصل ہیں، یا متصل نہیں، مگر حوائج بلد یا قریہ کا تعلق اس سے ہے تب تو یہ بمنزلہ فناءِ مصر یا متعلقاتِ قریہ ہونے کے موضعِ اقامت ہونے کے قابل ہیں، اور اگر کسی مصر یا قریہ کے متصل نہیں، نہ اُن کے حوائج کا بنادر سے تعلق ہے، تو چونکہ اہل جہاز کے مصالح ان بنادر سے متعلق ہیں، اس لئے یہ اُن کے حق بمنزلہ صحراء کے ہیں رعاۃ کے لئے، لہٰذا بنادر

کو ان کے لئے موضعِ اقامت کہنا صحیح ہے، بشرطیکہ بنادر پر انھوں نے خیمے اور جھونپڑے وغیرہ قائم کرلئے ہوں، یا کوئی عمارت اُن کی ضروریات کے واسطے بنی ہوئی ہو، پس یہ جہاز راں اور ملّاح جس وقت بنادر پر پہونچیں گے مقیم ہوں گے، اور جب بنادر سے انتقال کریں گے تو اگر تین دن کی مسافت یا زیادہ کا قصد کریں تو وقتِ سیر سے مسافر ہو جائیں گے، (یعنی جبکہ اپنے بندر کی حد سے نکل جائیں) اور جب بندر پر واپس ہونگے مقیم ہو جائیں گے، اس حکم میں تینوں قسم کے آدمی برابر ہیں جن کا ذکر سوال میں ہے، اور ان لوگوں کا کشتی میں رہنا مانع عن الاقامۃ نہیں، کیونکہ فقہاء کے کلام سے یہ بات صراحۃً مفہوم ہوتی ہے کہ سفینہ جب موضع اقامت میں پہونچے تو راکب سفینہ مقیم ہو جائے گا، اور یہ جو فقہاء نے فرمایا ہے کہ سفینہ صالح للاقامۃ نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ سفینۂ سائرہ محلِ اقامۃ نہیں، یعنی سفینۂ سائرہ میں ۱۵، ۲۰ دن یا زیادہ قیام کی نیت سے راکب مقیم نہ ہوگا، قال فی العالمگیریۃ ولا یصیر مقیمًا بنیۃ الاقامۃ فیہا وکذلک صاحب السفینۃ والملاح الّا ان تکون السفینۃ بقرب من بلدتہ اوقریتہ فح یکون مقیما باقامۃ الاصلیۃ کذا فی المحیط وفی الولوالجیۃ افتتح الصلوٰۃ فی السفینۃ حال اقامتہ فی طرف البحر فنقلہا الریح وھو فی السفینۃ فنوی السفر تیم صلوٰۃ المقیم عند ابی یوسفؒ وفی الحجۃ الفتوی علی قولہ احتیاطًا وفی العتابیۃ ولو کان مسافرًا وشرع فی الصلوٰۃ فی السفینۃ خارج المصر فجرت السفینۃ حتی دخل المصر تیم اربعًا اھ ص ۹۲ ج ۱۔

واللہ اعلم، ۱۱ رجب ۴۲ھ

الکلام علیہ تفصیلًا

تنبیہ: اس جگہ چند امور محتاجِ دلیل ہیں:- (۱) یہ کہ جب بندر وساحل بحر متصل کسی شہر یا قریہ کے ہو تو وہاں نیتِ اقامت جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ موضع صالح للاقامۃ ہے یا نہیں؟ (۲) کشتی اور جہاز جب بندر پر کھڑا ہو اور بندر قریب شہر یا قریہ کے ہے تو اس حالت میں خود کشتی یا جہاز موضعِ اقامۃ ہے یا نہیں؟ (۳) اگر بندر متصل شہر وقریہ کے نہیں اس حالت میں اس کا صالح للاقامۃ ہونا کس دلیل سے ثابت ہے، اور کیا وہ مطلقًا صالح للاقامۃ ہی یا بندر پر خیمے اور جھونپڑے

وغیرہ نصب کرنا بھی شرط ہے،

جواب اول: بندر جب متصل شہر و قریہ کے ہو اس طرح کہ آبادی کا سلسلہ وہاں تک ممتد ہو یا متصل نہ ہو مگر آبادی والے وہاں کپڑے وغیرہ دھوتے ہوں یا ان کے اور حوائج بندر سے متعلق ہوں اس صورت میں وہ بحکم فناء مصر و فناء قریہ کے ہے، اور فناء مصر و فناء قریہ کا حکم وہی ہے جو خود مصر و قریہ کا حکم ہے، اس لئے وہاں اقامت کی نیت درست ہوگی،

قال فی الدر او فنائہ وھو ما حولہ اتصل بہ اولا لاجل مصالحہ اھ قال الشامی نص الائمۃ علی ان الفناء ما اعد لدفن الموتی وحوائج المصر کرکض الخیل و الدواب وجمع العساکر والخروج للرمی وغیر ذلک وای موضع یحد بمسافۃ یسع عساکر مصر ویصلح میدانا للخیل والفرسان ورمی النبل والبندق والبارود واختبار المدافع وھذا یزید علی فراسخ اھ وفیہ ایضا اعتبر بعضھم (فی تعریف الفناء) الاتصال وقد خطأہ صاحب الذخیرۃ قائلا فعلی قول ھذا القائل لا تجوز اقامۃ الجمعۃ ببخاری فی مصلی العید لان بین المصلی وبین المصر مزارع ووقعت ھذہ المسئلۃ مرۃ وافتی بعض مشایخ زماننا بعدم الجواز ولکن ھذا لیس بصواب فان احدا لم ینکر جواز صلوٰۃ العید فی مصلی العید ببخاری لا من المتقدمین ولا من المتأخرین وکان المصر او فناؤہ شرطا لجواز الجمعۃ فھو شرط جواز صلوٰۃ العید اھ، (ص ۷۸۳ ج ۱) غرض فناء کے لئے اتصال آبادی بھی شرط نہیں، بلکہ اس کے متعلقات بلد وحوائج مصر ہونا کافی ہے، اسی طرح قریہ کے متصلات میں شمار ہونا بس ہے، اور یقیناً جب فناء بحکم مصر و قریہ ہے تو ان کی طرح یہ بھی ضرور صالح للاقامت ہوگا، کیونکہ جمعہ اسی موضع میں جائز ہے جو صالح للاقامت ہو، مفازہ وبریہ میں اتفاقاً جمعہ صحیح نہیں باقی جواز قصر کے لئے مجاوزت فناء کا شرط نہ ہونا دوسری وجہ سے ہے، اس کا مبنی یہ نہیں کہ فناء صالح للاقامت نہیں، قال فی الکفایۃ فان قیل فناء المصر فی حکم المصر فی حق صلوٰۃ الجمعۃ و العیدین حتی جازت الصلوٰۃ فیہ مع کون المصر شرطا لجواز ھذہ الصلوٰۃ فکیف اعطی الفناء حکم غیر المصر فی حق القصر للمسافر قلنا فناء المصر انما یلحق بالمصر فیما کان من حوائج اھل المصر وصلوٰۃ الجمعۃ والعیدین من حوائج اھل المصر فاما قصر الصلوٰۃ فلیس من حوائج اھل المصر فلا یلحق

الفناء بالمصر فی حق ھذا الحکم اھ (ص ۱۹۵ ج ۱)
پس صلاحیتِ نیت اقامت کے لئے فناء کی وہ تعریف لی جائے گی، جو صحت صلوٰۃ جمعہ کے لئے فناءِ مصر کی تعریف عند الحنفیہ ہے، یا فناء قریہ کی تعریف عند الشافعیہ ہے کیونکہ دونوں کے نزدیک صحتِ جمعہ کے لئے اس کا موضع صالح للاقامت ہونا شرط ہے، اور وہ معنی فناء کے نہ لئے جائیں گے جس کی مجاوزت سے قصر صحیح ہو جاتا ہے، فافہم،

وفی الاملاء عن ابی یوسفؒ ان نزلوا (عسکر المسلمین) بساتینھم واکنافھم (ای البغاۃ) وللمسلمین منعۃ صحت اقامتھم ولا یصح اذا نزلوا علیھم فی خیاھھم (بنایہ ص ۹۶۸ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بساتین بلد وجوانب بلد محل اقامت ہیں حالانکہ مسافر کو قصر کے لئے مجاوزت بساتین شرط نہیں، پس جب بندر سے مصالح مصر وقریہ کا تعلق ہو گو اتصال نہ ہو وہ موضع صالح للاقامت ضرور ہوگا،

جوابِ شقِ دوم، جب کشتی یا جہاز بندر پر کھڑا ہو، اور بندر فناءِ شہر یا قریہ ہو تو اس صورت میں کشتی یا جہاز کا بھی وہی حکم ہے جو ساحل بحر کا حکم ہے، جس طرح ساحل بحر موضع صالح للاقامۃ ہے اسی طرح کشتی یا جہاز واقف ومشدود بالساحل بھی صالح للاقامۃ ہے، قال فی الدر والمربوطۃ فی الشط کالشط فی الاصح اھ قال الشامی و ان کان الامام فی سفینۃ واقفۃ والمقتدون علی الشط فان بینھما طریق او قدر نھر عظیم لم یصح بحر اھ (ص ۷۹۸ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ اگر درمیان میں طریق وقدر نہر عظیم نہ ہو تو اقتداء صحیح ہے، اور یقیناً اقتداء کے لئے اتحاد موضع امام ومقتدی شرط ہے، معلوم ہوا کہ سفینہ واقفہ کا حکم مثل ساحل کے ہے، لہٰذا اگر ساحل موضع صالح للاقامت ہو تو سفینہ واقفہ مشدودہ بھی محلِ اقامت ضرور ہے، لاتحادہ بالساحل فافہم،

وفی العتابیۃ ولو کان مسافراً شرع فی الصلوٰۃ فی السفینۃ خارج المصر فجرت السفینۃ حتی دخل المصر تیمما ربعا اھ عالمگیری (ص ۹۲ ج ۱) قلت ومعناہ فجرت السفینۃ حتی دخل المصر وھو فیھا، کیونکہ صورتِ مفروضہ یہ ہے کہ وہ شخص نماز شروع کرنے کے وقت مسافر تھا، اور نماز شروع کرنے کے بعد اثناءِ صلوٰۃ میں کشتی مصر میں پہونچ گئی، تو یہ شخص کشتی کے اندر ہی مقیم ہو گیا، پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ وہ کشتی سے اتر کر شہر میں داخل ہو جائے تو مقیم ہوگا، کیونکہ اثناءِ صلوٰۃ میں اس عمل کثیر کی

کوئی گنجائش نہیں، پس ثابت ہوا کہ دریا کا وہ حصہ جو متصل بلد یا داخل بلد ہو وہ حکم بلد میں ہے، اور کشتی کا اس موضع میں پہونچ جانا اقامت کے لئے سبب ہو سکتا ہے، پس اسی طرح جو لوگ بندر پر مقیم ہیں اور بندر بوجہ فناء مصر یا فناء قریہ ہونے کے صالح للاقامۃ ہے تو جب وہ لوگ کشتی کے اندر بیٹھے ہوئے بندر پر پہونچ جائیں اور کشتی یا جہاز بندر پر لنگر انداز ہو جائے تو یہ لوگ مقیم ہو جائیں گے، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سفینہ مشدودہ بالشط بحکم شط ہے، قال فی العالمگیریۃ واذا وقف علی الاطلال یقتدی بالامام فی السفینۃ صح اقتداءہ الا ان یکون امام الامام کذا فی المحیط اھ (ص ۱۹۲ ج ۱)

الغرض سفینہ کی چار حالتیں ہیں، واقف علی الشط، واقف فی لجۃ البحر، سائر لقرب الشط، سائر فی لجۃ البحر (یعنی بعیدا عن الشط) پس واقف علی الشط بحکم شط ہے، اور جب شط صالح للاقامۃ ہو سفینہ بھی صالح للاقامۃ ہے، اور واقف فی لجۃ البحر بحکم بحر ہے، وہ صالح لنیۃ الاقامۃ نہیں، یعنی انشاء اقامت کا محل نہیں، گو بقاء اقامۃ کا محل ہو سکتا ہے مثلاً پہلے سے شہر یا قریہ میں مقیم ہے، اور کشتی میں سوار ہو کر نہ سفر کی نیت کی، نہ تین دن کی مسافت قطع کی، یہ شخص سفینہ واقفہ فی لجۃ البحر باقامۃ سابقہ مقیم رہیگا، اور سائر لقرب الشط یا بعیداً عن الشط بھی موضع انشاء اقامت نہیں، البتہ جو شخص پہلے سے مقیم علی الشط ہو وہ کشتی میں بہ نیت سفر سوار ہو کر اس وقت مسافر ہوگا جبکہ سفینہ اس کے بندر کی حد سے نکل جاوے، قال فی البنایہ وان کان فی سفینۃ فحین یرکبہا رای یصیر مسافرا برکوبہا) الا ان یکون فی وسط المصر فیعتبر ان یجاوز البیوت اھ (ص ۹۶۳ ج ۱) قلت فلما کان سیر السفینۃ فی المصر لا یکفی لابتداء سفر اھلہ بدون المجاوزۃ عن البیوت فکذا سیرھا علی الشط لا یکفی لابتداء السفر لاھل الشط حتی یجاوز حدودہ فافھم ۱۲

پس فقہاء کا یہ قول فلا تصح نیۃ الاقامۃ فی مفازۃ ولا بحر ولا سفینۃ اھ اس میں اقامۃ فی البحر سے اقامت فی السفینۃ الواقفۃ فی لجۃ البحر مراد ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ بحر میں بجز سفینہ کے اقامت ممکن نہیں، اور اقامت فی السفینہ سے مراد اقامت فی السفینۃ السائرۃ ہے، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سفینہ واقفہ علی الشط فقہاء کے نزدیک بحکم الشط ہے، پس اس سے مطلقاً یہ سمجھنا کہ سفینہ کسی حال میں محل اقامت نہیں، غلط ہے،

علاوہ ازیں ہم کو یہ بھی تسلیم نہیں کہ اقامت فی البحر بدون اقامت فی السفینہ کے مقصود نہیں بلکہ کرامت کے طور پر اقامت فی البحر بدون سفینہ کے ہو سکتی ہے، لان بعض الاولیاء یمشی علی وجہ الماء، ویقیم فی البحر ایاما، اور فقہاء صور بعیدہ کا حکم بھی بیان فرمادیا کرتے ہیں، کما لایخفی، پس مجیب سلمہ کا یہ استدلال کہ عطف بحر علی السفینۃ تغایر پر دلالت کرتا ہے، اور بحر میں بجز سفینہ کے اقامۃ کی کوئی صورت نہیں، پس سفینہ سے مراد یہ ہے کہ جب وہ کنارے پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تب بھی اس میں اقامت درست نہیں الخ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، دوسرے سفینہ سے سفینہ واقفہ علی الشط مراد لینا کیا یہ حقیقت کے موافق ہے، یقیناً یہ بھی مجاز ہے، تو اس مجاز کا کیا قرینہ ہے، بخلاف اس کے کہ سفینہ سے سفینہ سائرہ اگر مراد لیا جائے تو یہ حقیقت کے قریب ہی کیونکہ متبادر اطلاق لفظ سفینہ سے باب مسافر میں یہی ہے، فافہم حق الفہم،

جواب شق سوم ؛ اگر بندر فناء شہر و قریہ نہیں ہے اس صورت میں ظاہر روایت پر وہ صالح للاقامۃ نہیں، مگر ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک صالح للاقامۃ ان لوگوں کے حق میں معلوم ہوتا ہے، جن کے حوائج و کاروبار بندر سے متعلق ہیں، پس اگر جہاز راں و ملاح وغیرہ کسی ایسے بندر پر جو فناء شہر و قریہ نہیں ہے خیمے یا جھوپڑے ڈال لیں، اور اس کو اپنی قرارگاہ و مرکز متعین کرلیں تو وہ ان کے لئے محل اقامت ہو جائے گا، اور اگر خیمے و جھونپڑے کچھ نہیں ڈالے، اس صورت میں کسی کے نزدیک انشاء اقامت کے لئے صالح نہ ہوگا، یعنی جو سفر کرکے وہاں پہونچے وہ اس حالت میں نیتِ اقامت سے مقیم نہ ہوگا، اور جو پہلے سے مقیم ہو وہ باقامتِ سابقہ مقیم رہیگا جب تک نیتِ سفر یا قطعِ مسافتِ سفر سے اقامتِ سابقہ باطل نہ ہو قال فی الکفایۃ قولہ حتی ینوی الاقامۃ فی بلدۃ او قریۃ الی قولہ وھو الظاھر ای الظاھر من الروایۃ وھذا احتراز عما روی عن ابی یوسف رح ان الرعاۃ اذا نزلوا موضعا کثیرا لکلاء و الماء واتخذوا المخابز والمعالف والاواری وضربوا الخیام ونووا الاقامۃ خمسۃ عشر یوما والکلاء والماء یکفیھم لتلک المدۃ صاروا مقیمین وکذا الترکمۃ و الاعراب اھ (ص ۱۹۵ ج ۱) ترکمہ و اعراب جو کہ اہل خباء ہیں جن کا مسکن کوئی متعین ہی نہیں ہوتا، ان کا حکم تو ظاہر ہے، مگر ابو یوسف رح کے نزدیک رُعاۃ کا بھی یہی حکم ہے، اگر وہ جنگل میں خیمے ڈال کر قیام کرلیں، اور ظاہر ہے کہ رُعاۃ کا مسکن کسی بلد یا قریہ میں متعین ہوتا ہے، مگر چونکہ بوجہ شغل رعی کے ان کے حوائج صحراء سے بہت متعلق ہوتے ہیں اس لئے

ان کے حق میں بھی نیت اقامت فی الصحراء وہی حکم رکھتی ہے جو اہل خباء کے حق میں، پس اسی طرح گو وہ بندر جو فناءِ مصر و قریہ نہ ہو، عام لوگوں کے لئے محلِ اقامت نہیں، مگر ملازمانِ جہاز وسفینہ و ملاحین کے لئے محلِ اقامت ہوگا، اگر وہ وہاں خیمے وغیرہ قائم کرلیں ورنہ نہیں، اور چونکہ اہلِ خباء کے مسئلہ میں قول ابو یوسفؒ مفتی بہ ہے پس احوط یہ ہے کہ مسئلہ رعاۃ میں بھی ان کا ہی قول لیا جائے مگر ایسے ملازمانِ جہاز و ملاح جو ان بندروں پر مدتِ سفر سے آئے ہیں، اور یہاں نیتِ اقامت کرنے سے مقیم ہوئے ہیں، ایسے لوگوں کے امام نہ بنیں جو اقامتِ سابقہ فی بلد یا اقامۃ فی قریہ کی وجہ سے مقیم ہیں، (یا بندر ہی پر مقیم ہیں) مگر ان کا وطن اصلی وہاں سے نزدیک ہے، مدتِ سفر کی مسافت پر نہیں، کیونکہ یہ خلافِ احتیاط ہے، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، ۱۴ رجب ۱۳۴۲ھ

کشتی میں نماز پڑھنے کے متعلق عربی زبان میں ایک سوال اور اس کا جواب

سوال (۷) مایقول العلماء الکرام والفضلاء العظام فی الصلوٰۃ فی السفینۃ ھل یجوز مطلقاً ام فیہ تفصیل بینوا توجروا؟

الجواب: اقول ان ھذہ المسئلۃ علیٰ وجوہ فنذکرھا مع احکامہ، الوجہ الاول ان تکون السفینۃ مربوطۃ فی الشط فان کانت مستقرۃ علی الارض بحیث اتصل اسفلہا بہا فالصلوٰۃ فیہا جائزۃ قائما لا قاعداً لانہا فی حکم السریر علیٰ ھذا التقدیر والصلوٰۃ علی السریر انما تجوز قائما لا قاعدا فکذا ھذا وان کانت غیر مستقرۃ علی الارض فان امکنہ الخروج منہا یجب علیہ الخروج للصلوٰۃ لکونہا فی حکم الدابۃ علیٰ ھذا التقدیر وان لم یکن الخروج یصلی فیہا قائما لان الصلوٰۃ فیہا علیٰ ھذا التقدیر کالصلوٰۃ علی الشط والصلوٰۃ علی الشط لابد لہا من القیام فکذا ھذا، الوجہ الثانی ان تکون مربوطۃ فی الوسط فان استقرت علی الارض فہی فی حکم السریر یصلی فیہا قائما وان لم تستقر فان امکنہ الخروج وھی ساکنۃ غیر متحرکۃ بالریح یصلی فیہا قائما لانہا فی ھذہ الصورۃ کالواقفۃ علی الشط وقد مر حکمہا وان کانت متحرکۃ بالریح حرکۃ شدیدۃ تجوز الصلوٰۃ فیہا قاعدا ایضا وان لم یحصل لہ دوران الرأس بالقیام عند ابی حنیفۃ رح لکن علی الاساءۃ وعندہما لایجوز قاعداً وان حصل دوران الرأس فیجوز قاعداً بالاتفاق من غیر اساءۃ لانہا فی

هذه الصورة فی حکم السفینة السائرة الآتی حکمها، والوجه الثالث ان
ان تکون سائرة فی البحر فان امکنه الخروج منها بوجه یجب علیه الخروج
وان لم یمکنه الخروج تجوز فیها الصلوٰة فان حصل له دوران الرأس عند
القیام یجوز قاعدا بالاتفاق من غیر اساءة وان لم یحصل دوران الرأس فعندهما
یجب علیه القیام وعنده یجوز مع القعود ایضا مع الاساءة، فی الدر المختار
صلی الفرض فی فلک جار قاعدا بلا عذر صح لغلبة العجز واساء وقالا لایصح
الا بعذر وهو الاظهر برهان والمربوطة فی الشط کالشط فی الاصح والمربوطة
بلجة البحر ان کان الریح یحرکها شدیدا فکالسائرة والا فکالواقفة ویلزم
استقبال القبلة عند الافتتاح وکلما دارت انتهی بلفظه قال فی رد المحتار
قوله والمربوطة فی الشط کالشط فلا تجوز الصلوٰة فیها قاعدا اتفاقا وظاهر
ما فی الهدایة وغیرها الجواز قائما مطلقا ای استقرت علی الارض اولا
وصرح فی الایضاح بمنعه فی الثانی حیث امکنه الخروج الحاقا لها بالدابة
نهر واختاره فی المحیط والبدائع، بحر وعزاه فی الامداد ایضا الی مجمع الروایات
عن المصفی وجزم به فی نور الایضاح وعلی هذا ینبغی ان لا تجوز الصلوٰة فیها
مع امکان الخروج الی البر وهذه المسئلة الناس عنها غافلون شرح المنیة
انتهی بعبارته فقد علم بذلک ان ما یفعله کثیر من الناس حتی بعض الخواص
ایضا من ینتسبون الی العلماء انهم یصلون فی السفن المربوطة فی الشط مع
انها غیر مستقرة علی الارض وهم قادرون علی الخروج منها وکذا یصلون
فی السفن الجاریة حالة السیر وهم یستطعون الخروج منها غلط عظیم
نشاء من عدم تتبع کتب الفقه لابد لهم ان یخرجوا منها وان استثقلوا
الخروج فعلیهم ان یوقفوها فی موضع تستقر علی الارض ثم یصلون
قائمین فقط، والله اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب، حرره العبد
الضعیف فیض الله عفی عنه ، الجواب صحیح عزیز الرحمٰن مفتی دار العلوم دیوبند ۱۶ شعبان ۱۳۴۱ھ
الجواب صحیح محمد اعزاز علی غفرلہ ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
تنبیہ: اما اتصال سفلها بالارض فلیس بشرط اتصال طرف منها بها یکفی کما یظهر من نور الایضاح

وحاشیۃ للطحطاوی ونصہ فان صلی فی المربوطۃ بالشط قائما وکان شئ من السفینۃ علی تراب الارض صحت الصلوٰۃ بمنزلۃ الصلوٰۃ علی السریر اھ (ص ۲۳۸) فقولہ شئ من السفینۃ یعمل الاسفل والمقدم وغیرھما سواء کان قلیلا اوکثیرا ھذا واللہ اعلم، احقر ظفر احمد ، ۱۹ صفر سنہ ۱۳۴۳ھ

جہاز کے ملازمین کے لئے قصر کا حکم

سوال (۸) جہاز کے ملازموں میں سے بعض لوگ کہیں باہر نہیں جاتے انمیں سے بہت سے لوگ نماز قصر پڑھتے ہیں، اور وہ یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ ہم لوگ جسکی نوکری کرتے ہیں نہ معلوم کب اس کی طرف سے ایسی خبر آجائے جس سے مسافت کی راہ کوچ کرنا پڑے، اور ہمارے جہاز کا پیندا یعنی نیچے کا حصہ مٹی سے یعنی کنارے سے ٹیک لگی نہیں ہوتی، اگر جہاز کا حصہ کنارے سے لگا ہو تو پوری نماز پڑھنی ہوگی،

اور دوسری بات یہ کہ اپنی کمپنی سے خبر کب صادر ہوگی اس سے بھی واقف نہیں، اور نہ کمپنی نے ایسا کہا کہ فلانی تاریخ کو تمھیں فلانی جگہ جانا ہوگا، اور کمپنی کے دل میں کونسی بات گذرتی ہے اور کونسی بات گذرے گی، اس کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے، اور اگر ایسا خیال ہے کہ ہر وقت آمد و رفت ہوتی ہو تو بلا تردد نماز قصر پڑھنی چاہئے، اب یہ لوگ کہتے ہیں ہماری کمپنی کے اس رنگون کے علاوہ اور بھی بہت سی جگہ کارخانہ ہے، اس جگہ ایک دو بار گیا بھی تھا، اب کوئی متعین وقت جانے کے لئے نہیں اور نہ جانے کا ارادہ ہے، لیکن مالک کی کوئی خبر آئے گی کہ نہیں اس کا علم تو خدا کو ہے،

اب تیسری گذارش یہ ہے کہ ہم لوگ جہاز میں شب و روز رہتے ہیں، اور اسی میں خورد و نوش کا بھی انتظام ہے، بلکہ جہاز میں ہماری قیامگاہ ہے، اب اگر مالک کی طرف سے کوئی آرڈر ایسا آپڑے جس سے مسافرت کی راہ طے کرنی پڑے، تو اس حالت میں ہم لوگوں پر نماز قصر پڑھنی چاہئے یا نہیں، بشرطیکہ جہاز ہماری قیامگاہ ہے، اور مع جہاز کے جگہ میں پہونچ جاؤں گا، سو اس پر آپ کی کیا رائے ہے، اس مضمون پر خیال فرماکر نور ضیاء بخشئے، اور کتاب کا حوالہ بھی ضرور دیجئے، اور جو مضمون عربی زبان میں ہو اس کا ترجمہ اردو زبان میں تحریر کیجئے، اس مسئلہ کے بارے میں جہازی آدمیوں میں بڑا فساد برپا ہو رہا ہے، کوئی عالم کہتے ہیں کہ نماز قصر پڑھنی چاہئے، اور کوئی اس کے برخلاف، اب ہم لوگ حیران ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہیں،

الجواب: جو لوگ رنگون میں رہ کر قصر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر نہیں کہ

مالکِ جہاز کی طرف سے کب حکم آجاوے اس کا حکم یہ ہے کہ شرع میں وہم وخیال کا اعتبار نہیں، ظنِ غالب کا اعتبار ہے، اگر ان کو کمپنی کی طرف سے حکمِ سفر آنے کا ظن غالب ہو، جس کا معیار یہ ہے کہ اکثر ہر مہینے میں اُن کو حکمِ سفر آتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے کبھی ایسا موقع نہیں ملتا کہ اپنے ارادہ واختیار سے دس پندرہ دن قیام کرسکیں، یہ حالت ہو تو ان کا رنگون میں قصر کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہ ان کا وطن اصلی نہ ہو، اور اگر ظنِ غالب نہیں محض خیال د وہم ہی ہے کہ شاید حکمِ سفر آجائے تو اس کا اعتبار نہیں، اس صورت میں اگر یہ لوگ رنگون میں نیتِ اقامت کرلیں، یا ظنِ غالب سے کبھی یہ معلوم ہو کہ پندرہ دن تک ابھی کہیں دور جانا نہیں ہے تو مقیم ہو جائیں گے، اور نماز پوری پڑھنا چاہئے، اور گذشتہ ایام میں اگر کبھی ایسا ہوا ہو کہ ظنِ غالب سے پندرہ دن تک کہیں جانا اُن کو متحقق نہ تھا، یا پندرہ دن ٹھیرنے کی نیت کرلی تھی اور ظنِ غالب سے نیت کے پورا ہونے کی امید تھی اور اس وقت میں غلطی سے یہ لوگ قصر کرتے رہے تو ان ایام کی نماز کا اعادہ ضروری ہے، قال فی الدر او دخل بلدۃ ولم ینوها ای مدۃ الاقامۃ بل ترقب السفر غداً او بعدہ ولو بقی علی ذلک سنین (یقصر) الا ان یعلم تاخر القافلۃ نصف شهر کما مر اھ، قلت اشارۃ الی قولہ سابقا او ینوی اقامۃ نصف شهر حقیقۃً او حکماً کما فی البزازیۃ لو دخل الحاج الشام وعلم انہ لا یخرج الا مع القافلۃ فی نصف شوال اتم لانہ کناوی الاقامۃ اھ (ص ۸۲۳ ج ۱) قلت وقد تقرر ان غلبۃ الظن فی حکم العلم شرعاً، واللہ اعلم ۲ جمادی الاول ۱۳۴۲ھ

حکم سیلان زخمیکہ از خود پیدا کردہ شود یا مثل زخمے ہست کہ بآفتِ سماویہ پیدا شود؟

سوال (۹) .... بندہ کے کمر میں بہت درد ہے، اور درد کی وجہ سے پیٹھ میں پیٹھ کی ہموار سطح سے چار انگشت چوڑا ایک انگشت اونچا بڑی انگلی سے ہوگیا ہے، حالانکہ وہ پھنسی بھی نہیں ہے، اور نہ پکتا ہے، اور کمر کے درد کی وجہ سے ایک بھرا ہوا لوٹا بھی اٹھانے میں سخت تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا ہمارے یہاں کے لوگ مرض درد کے واسطے یہ علاج کرتے ہیں کہ نیم کے درخت کی ایک گولی لے کر گھٹنے کے تین انگشت نیچے یعنی پنڈلی کے اعلیٰ حصہ میں کاٹ کر زخم کرکے اس میں نیم کا درخت کی گولی رکھ دی جاتی ہے، اس کے اوپر تین انگشت چوڑا اور دو ہاتھ لمبا ایک کپڑا لپیٹ کر باندھ دیتے ہیں، نیم کی گولی کم از کم ڈیڑھ سال تک رکھی جاتی ہے

اس سے زیادہ بھی رکھتے ہیں، اس زخم سے ہمیشہ پیپ پانی اور خراب چیزیں نکلتی ہیں بعضوں کے بہت بدبو ہوتی ہے، اور بعضوں کے بدبو کم ہوتی ہے، بعضے احتیاطاً دھو دیتے ہیں اور بعضے نہیں دھوتے، مگر بندہ کے بدبو کم ہے، پس ہمارے پڑوسیوں کو دو تین آدمیوں کے استعمال سے مرض درد میں شفا ہوگئی ہے،

خدا کے حکم سے اگر کہیں بدن میں زخم ہوگیا ہے اس سے پیپ خون پانی وغیرہ نکلنے سے صحتِ صلوٰۃ کے لئے قدر درہم تک معاف ہے، اگر بعد وضو بھی وہ خون پیپ وغیرہ نکلے، نماز کے پورے وقت تک وضو باقی رہتا ہے، پس اس صورت بالا میں یعنی خود کردہ زخم کے پیپ پانی وغیرہ کا کیا حکم ہوگا؟ بندہ نے چار ماہ ہوئے استعمال کیا ہے، درد میں کچھ تخفیف معلوم ہوتی ہے،

الجواب: اگر اس زخم میں روئی رکھنے یا اوپر سے پٹی باندھنے یا اور کسی طرح وقتِ صلوٰۃ میں سیلان بند ہوسکے، اور سہولت کے ساتھ بند ہوسکے تو ان طرق سے نماز کے وقت سیلان کو روکنا چاہئے، اور اگر بسہولت سیلان کو نہ روک سکے تو پھر یہ شخص معذور ہے اور اس کے لئے معذورین کا حکم ہے، اس میں خود کردہ اور خدا کردہ زخم برابر ہے، خود کردہ زخم بھی خدا ہی کا کیا ہوا ہے، خصوصاً جب کہ بضرورت علاج کیا گیا ہے، قال فی نور الایضاح وجرح لایرقأ ولایمکن حبسہ بحشو من غیر مشقۃ ولا بجلوس اھ اما اذا کان یمکن ردہ وجب ردہ وخرج عن ان یکون صاحب عذر اھ ط،

اور اس زخم سے جو ناپاکی نکلتی ہے، اگر وہ قدر درہم یا اس سے کم ہو تب تو عفو ہے، اور زائد ہو تو دھونا واجب ہے، بشرطیکہ دھونا مفید ہو کہ دھونے کے بعد دیر تک ناپاکی نہ لگتی ہو، اور اگر دھونا مفید نہ ہو تو پھر جب تک عذر باقی رہے اس کا دھونا بھی عفو ہے، قال فی حاشیۃ مراقی الفلاح وفی البدائع یجب غسل المنی وائعی عن الذرھم ان کان مفیداً بان لا یصیبہ مرۃ اخری حتی لولم یغسل وصلی لا یجزیہ وان لم یکن مفیداً لا یجب مادام العذر قائماً وھو اختیار مشایخنا اھ (ص ۸۶) ۲۲ رجب ۴۴ھ

رسالہ احکام القصر فی بعض احکام السفر
یعنی بعض مسائل متعلق نمازِ قصر

سوال (۱۰) جائے ملازمت گو وطن تو نہیں ہے لیکن وہاں پر اہل وعیال مقیم رہتے ہیں، تو کیا محض اہل وعیال کے مقیم ہونے کی بناء پر وہاں ہر حال میں نماز کا اتمام کیا جائے گا، خواہ مسافر ہی ہو،

اور اگر بوجہ مسئلہ اس کے خلاف جاننے کے ایسے مقام پر قصر ہی پڑھتا رہا تو کیا اعادہ ضروری ہوگا حالانکہ یاد نہیں کہ کتنی نمازیں ایسی پڑھی گئیں؟

(۲) اگر زوجہ کسی ایسے مقام پر مقیم ہو جو نہ اس کا وطن ہو نہ اس کے شوہر کی جائے ملازمت ہو، تو اس جگہ کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر زوجہ اپنے ماں باپ کے پاس گئی، اور وہ مقام ماں باپ کا وطن نہیں ہے، مگر ماں باپ وہاں مقیم ہیں تو اگر شوہر وہاں عارضی طور پر بحیثیت مسافر کے جائے تو وہ قصر کرے یا نہیں، اور اگر وہاں زوجہ بھی موجود ہو مگر وہاں اس کا مستقل قیام نہیں بلکہ بطور مہمان کے گئی ہے تو اس صورت میں شوہر مسافر قصر کرے یا اتمام؟

(۴) کیا زوجہ کے وطن میں بحالتِ عدم موجودگی زوجہ بھی یا بحالتِ موجودگیِ زوجہ جبکہ خود اس کا قیام مسافرانہ ہو مسافر شوہر اتمام کرے؟

(۵) دورہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مقامات دورہ تجویز کئے جاتے ہیں، اس صورت میں مجموعی مسافت کا اعتبار ہوگا یا صرف اس مقام کو جہاں کا فاصلہ مرکز سے بہ نسبت دیگر مقامات دورہ کے سب سے زیادہ ہو منتہیٰ سفر کا سمجھا جائے گا، اور جہاں سے فاصلہ کم ہونا شروع ہو جائے وہ سفر واپسی سمجھا جائے گا، اور اس کا اعتبار نہ کیا جائے، نیز اگر صورتِ دورہ اس طرح ہو جس میں مرکز سے چل کر مرکز ہی پر لوٹنے کا ارادہ ہے، اور کل مجموعۂ مسافت مرکز سے مرکز تک ۴۸ میل ہو، اور درمیان میں جتنے مقامات ہیں وہ سب مقصود ہیں، قریب کا بھی ارادہ ہے بعید کا بھی، تو اس صورت میں قصر ہوگا یا نہیں؟

(۶) صورتِ مذکورہ نمبرہ میں اگر اس طرح مقاماتِ دورہ تجویز کئے جائیں کہ کبھی تو مرکز سے زیادہ فاصلہ کے مقام پر پہونچے، اور کبھی کم فاصلہ کے مقام پر اور اس کے بعد پھر دور کے فاصلہ پر جس طرح کہ حسب ذیل نقشہ میں دکھلایا گیا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اور آیا مرکز سے کسی مقام کی مسافت بخطِ مستقیم محسوب کی جائے گی، خواہ راستہ عام بخط مستقیم نہ ہو، بہر صورت؟

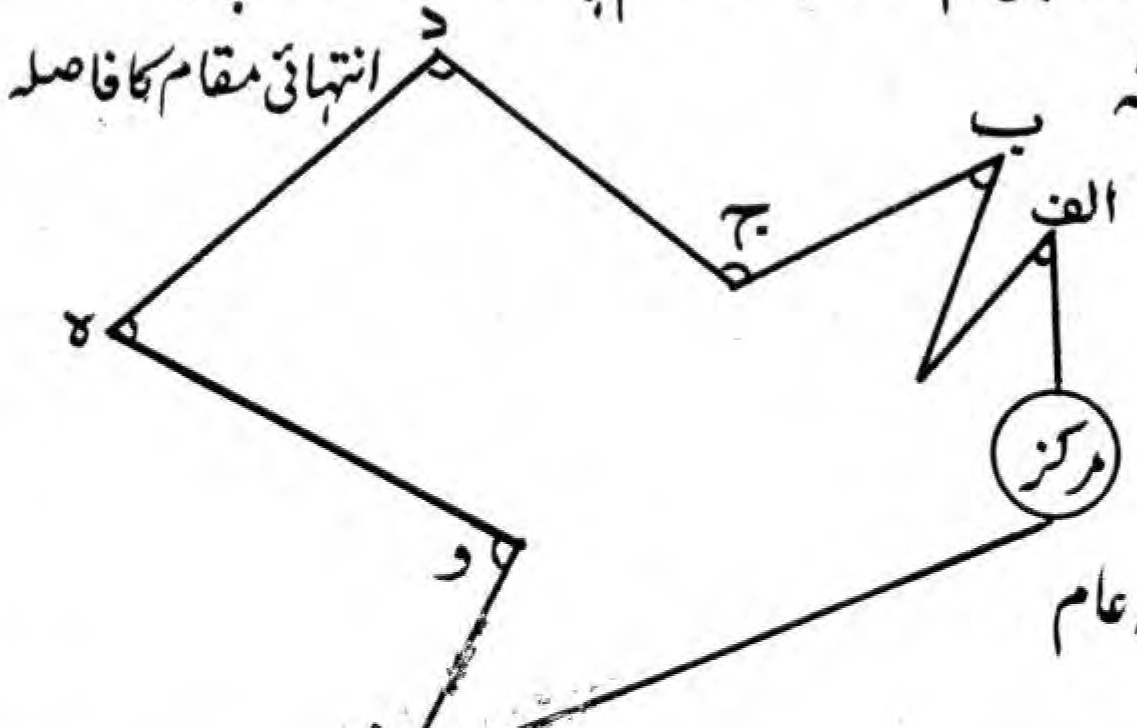

(۷) اگر ایک مقام براہِ راست تو حدِ مسافت پر نہیں ہے مگر پھیر کھا کر جاتا ہے، اور جس رستہ سے جاتا ہے اس سے مقدارِ مسافت قصر پر ہے تو کیا حکم ہے، مثلاً یہ صورت ہے جو ذیل میں دکھلائی گئی، یعنی براہِ راست تو صرف بارہ میل اور چکر کھا کر ۲۴ + ۲۴ = ۴۸ میل

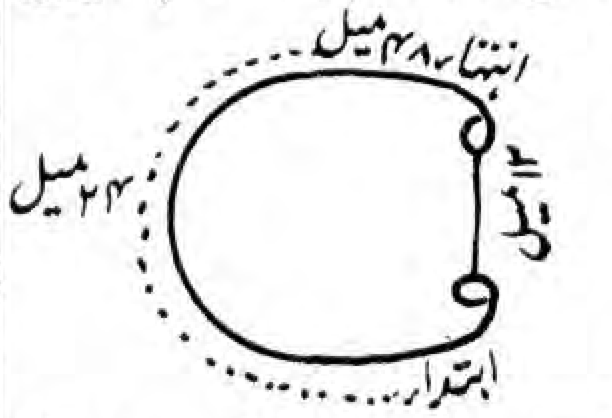

(۸) امام مسافر ہے، لیکن مسافر مقتدی کو امام کا مسافر ہونا نہیں معلوم تھا، اس لئے اس نے چار کی تو کیا وہ پوری چار پڑھے یا امام کے ساتھ دو رکعت ہی پر سلام پھیر دے ؟

الجواب: قال فی البحر عن المحیط لو کان له اهل بالکوفة واهل بالبصرة ولیقی له دور وعقار بالبصرة قبل البصرة لا تبقی له وطنًا لانها انما کانت وطنا بالاهل لا بالعقار الا تری انه لو تاهل ببلدة لم یکن له فیها عقار صارت وطنا له وقیل تبقی وطنا له لانها کانت وطنا له بالاهل والدار جمیعا فبزوال احدهما لا یرتفع الوطن کوطن الاقامة یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر (ص ۱۳۶ ج ۲) الی ان قال وفی المجتبی نقل القولین فیما اذا نقل اهله ومتاعه وبقی له دور وعقار ثم قال وهذا جواب واقعة ابتلینا بها وکثیر من المسلمین المتوطنین بالبلاد ولهم دور وعقار فی القری البعیدة یصیفون بها باهلهم ومتاعهم فلابد من حفظهما انهما وطنان له لا یبطل احدهما بالآخر اهـ وفی السراجیة اذا دخل المسافر بلدة له فیها اهل صار مقیما نوی الاقامة اولا (ص ۶۲ ج ۱)

ان جزئیات سے خصوصًا مجتبی کے جزئیہ سے معلوم ہوا کہ جس مقام پر انسان مع اہل و عیال کے مقیم ہو گو قیام عارضی ہو کہ زمانۂ صیف ہی میں وہاں قیام کرتا ہو وہ اس کا وطن ہو جاتا ہے، اور جب تک وہاں اہل و عیال مقیم رہیں گے وطن رہیگا، تنہا اس کے سفر سے وہ وطن باطل نہ ہوگا جب تک وہاں سے اہل و عیال کو منتقل نہ کرے، پس صورتِ مسئولہ میں جائے ملازمت پر جب اہل و عیال مقیم ہیں وہاں نماز کامل پڑھنا چاہئے، اور چونکہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے، اس لئے اس سے پہلے جن نمازوں میں فتویٰ آخر کی وجہ سے قصر کیا گیا ہے اُن نمازوں کا اعادہ واجب نہیں، فان العامی مکلف بما افتاہ بہ عالم وطاعانہ علی قولہ صحیحۃ کما ہو الظاہر،

(۲) شوہر اس حالت میں قصر کرے، کیونکہ مجرد اقامت اہل توطن کو مستلزم نہیں بلکہ

یا تو وہ جگہ بیوی کا وطن ہو اور بیوی وہیں رہتی ہو، یا شوہر نے مع اہل وعیال وہاں اقامت کر رکھی ہو اور اس کو اپنے اہل وعیال کا مسکن بنایا ہو خواہ عارضی ہی ہو، صرف بیوی کے عارضی قیام سے وہ جگہ شوہر مسافر کے لئے موجب اتمام نہ ہوگی ودلیل الاول ما فی شرح المنیۃ لو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الاقامۃ بہ فقیل یصیر مقیما وھو الاوجہ لما مر من حدیث عثمان انی تاھلت بمکۃ منذ قدمت وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تاھل ببلد فلیصل صلوٰۃ المقیم اھ ای من تاھل ببلد واقر اھلہ بہ لا بدلیل قصرہ صلی اللہ علیہ وسلم وازواجہ بمکۃ مع انہ تزوج بمکۃ ولکن لم یقر اھلہ بہ واما عثمان فقد کان لہ اھل بمکۃ مقیم لہا فسار بہا مقیما بمکۃ کلما اتی بہا وان لم ینو الاقامۃ بنفسہ بل کانت الاقامۃ لہ بہا حراما لکونہ مہاجرا،

(۳) اگر بیوی اپنے وطن میں نہیں رہتی بلکہ شوہر کے پاس رہتی ہے تو شوہر اور بیوی دونوں بحالت سفر وہاں قصر کریں گے، بدلیل قصرہ صلی اللہ علیہ وسلم واہلہ بمکۃ،

(۴) اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گذرا، قال فی شرح المنیۃ ولو کان لہ اھل ببلدتین فایتھما دخلہا صار مقیما وان ماتت زوجتہ فی احدھما وبقی لہ فیہا دور وعقار قیل لا تبقی وطنا اذ المعتبر الاھل دون الدار کما لو تاھل ببلدۃ واستقرت سکنی لہ ولیس لہ فیہا دور وقیل تبقی اھ، اس سے معلوم ہوا کہ محض تزوج ببلدۃ یا اقامت اہل ببلدۃ موجب اتمام نہیں، بلکہ اس کے ساتھ استقرار سکونت زوجین بہا یا استقرار زوجہ وحدہا شرط ہے، اور صورت مسئولہ میں استقرار سکونت نہیں ہے، نہ زوج کے لئے نہ زوجہ کے لئے، بخلاف جائے ملازمت کے کہ وہاں استقرار سکونت ہے، کیونکہ وہاں زوج مکان کرایہ پر لیتا اور اسباب تعیش خانہ داری کے لئے مہیا کرتا ہے، پس وہ نظیر اس جزئیہ کی ہے، جو مجتبیٰ سے اوپر نقل کی گئی ہے، وہاں پہونچ کر زوج مسافر مقیم ہو جائے گا، جبکہ وہاں شوہر کے اہل وعیال مقیم ہیں، اور اس مسئلہ میں مالکیہ بھی ہمارے موافق ہیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے وہ بھی احتجاج کرتے ہیں، قال سحنون فی المدونۃ وقال مالک فی من خرج من افریقۃ یرید بمکۃ ولہ بمصر اھل فاقام عندھم صلوٰۃ واحدۃ انہ یتمہا قال ابن القاسم قلت لمالک الرجل

المسافر یمر بقریۃ من قراہ فی سفرہ وھولا یرید ان یقیم بقریتہ تلک الا یوماً ولیلۃ وفیھا عبیدہ وبقرہ وجواریہ ولیس لہ بھا اھل ولا ولد قال یقصر الصلوٰۃ[عہ] الا ان یکون نوی ان یقیم بھا او یکون فیھا اھلہ وولدہ فان کان فیھا اھلہ وولدہ اتم الصلوٰۃ، قلت اوایت ان کانت ھذہ القریۃ التی فیھا اھلہ وولدہ مَرّ بھا فی سفرہ وقد ھلک اھلہ وبقی فیھا ولدہ اتیم الصلوٰۃ ام یقصر قال یقصر قال انما محمل ھذا رای القصر بعد ھلاک الاھل عند مالک اذا کانت القریۃ بعد ھلاکھا مسکنا لہ اتم الصلوٰۃ وان لم تکن لہ مسکنا لم یتم الصلوٰۃ اھ ص۱۱۹ واما قبل ھلاکھا فھی مسکنا لہ البتۃ فان مسکن المرأۃ مسکن لہ کما دل علیہ حدیث عثمانؓ واتمامہ بمنیٰ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵ و ۶) قصر میں اعتبار اس مقام کا ہے جس کی نیت سے اس نے جائے اقامت سے خروج کیا ہے، پس صورتِ مسئولہ میں جو شکل بنائی گئی ہے اگر سائل نے مرکز سے سفر کرتے ہوئے یہ نیت کی ہے کہ وہ مقام نؔ پر جائے گا، مگر اپنی سہولت کے لئے اُس نے مقام نؔ کا راستہ یوں اختیار کیا کہ مقام الفؔ و بؔ و جؔ و دؔ و ہؔ و وؔ پر گزرتا ہوا جائے، اور اس رستہ سے مقام نؔ مرکز سے مسافت قصر ۴۸ میل یا تین دن کی مسافت پر ہے، تو اس کو نماز قصر کرنا چاہئے بشرطیکہ تین دن کی مسافت طے کرنے سے پہلے مرکز پر درمیان میں لوٹنے کا ارادہ نہ ہو، پس اب اس شخص پر خروج من عمارۃ موضع اقامتہ قاصداً مسیرۃ ثلاثۃ ایام صادق آگیا، اور یہی مدار ہے تحقق سفر کا اور چونکہ اس کا ارادہ ابتداء ہی سے مقام نؔ پر پہونچنے کا ہے، اس طرح کہ الفؔ، بؔ، جؔ، دؔ، ہؔ، وؔ، کو اس کے لئے طریق بنائے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ منتہائے سفر وہ مقام ہے جس کا فاصلہ مرکز سے سب سے زیادہ ہے، یعنی مثلاً دؔ اور اس کے بعد ہؔ اور وؔ کو سفر واپسی کا سفر بنایا جائے، بلکہ سفر واپسی اس وقت شروع ہوگا، جبکہ وہ نؔ سے مرکز کا ارادہ کرے گا، جو اس کے ارادہ میں منتہائے سفر ہے، البتہ اگر یہ شخص مرکز سے چلتے ہوئے مقام نؔ کا براہ الفؔ و بؔ و نؔ و ہؔ و وؔ قصد نہ کرے، بلکہ مقام دؔ کا قصد کرے جو کہ ۱۸ میل نہیں ہے اور وہاں سے براہ ہؔ و وؔ و نؔ مرکز پر لوٹنے کا قصد کرے، تو چونکہ مرکز سے چلتے ہوئے اس نے

[عہ] وھذا موافق لما قال فی شرح المنیۃ اولا ان المعتبر الاھل دون الدار وھو الاوجہ ۱۲ منہ

مسافتِ قصر کا ارادہ نہیں کیا، اس لئے مسافر نہ ہوگا، پس اس کو یہ مسافر خود دیکھ لے کہ اس کی نیت مرکز سے چلتے ہوئے مقام ز تک پہونچنے کی ہے، اور وہاں سے عود الی المرکز کا قصد ہے، یا مقام د تک پہونچنے کی ہے اور وہاں سے عود الی المرکز کا قصد ہے،

صورتِ اُولیٰ میں جو جواب یہاں دیا گیا ہے، وہی امداد الفتاویٰ ص ۸۵ ج ۱ میں مرقوم ہے

قال فی الدر (المسافر) من خرج من عمارۃ موضع اقامتہ قاصداً مسیرۃ ثلثۃ ایام ولیالیھا بالسیر الوسط مع الاستراحات المعتادۃ ولو لموضع طریقان احدھما مدۃ السفر والاٰخر اقل قصر فی الاول دون الثانی اھ (ص ۸۲۰ و ۸۲۱ ج ۱)

قلت فمن خرج من مرکزہ قاصداً موضع ز بحیث یجعل مواضع الالف والباء والجیم والدال والھاء والواو طریقالہ فقد صدق علیہ انہ خرج من موضع اقامتہ قاصداً مسیرۃ ثلثۃ ایام ولا یجعل راجعاً الی المرکز قبل بلوغہ موضع ز لکونہ منتھی سفرہ فی قصدہ وانما یجعل راجعاً اذا خرج من موضع ز فان رجع من الطریق التی جاء منھا قصر حتما وان رجع من طریق اقل قصر ایضا حتی یدخل عمران مرکزہ ھذا ما علمتہ واللہ تعالیٰ اعلم، اور نیت واپسی کی تحقیق بظاہر یہ ہے کہ جو مقام ارادۂ مسافر میں منتہی سفر ہے وہاں سے وطن یا مرکز اقامت کا قصد کرنا نیت واپسی ہے، پس جب تک منتہی سفر سے بارادۂ وطن یا مقامِ اقامت نہ لوٹے اس وقت تک رجوع کا تحقق نہ ہوگا نہ اس کو راجع کہا جائے گا،

ہذا ما فہمتہ ولم ارہ صریحا ولا رجو وجدان التصریح بہ،

(۷) اس صورت میں بھی قصر لازم ہے فان العبرۃ للطریق التی سلکھا ولو کان اختار السلوک فیہ بلا غرض صحیح خلافا للشافعی کما فی الدر الخ شامی (ص ۸۲۱ ج ۱)

وقد مر قول الدر ولو لموضع طریقان احدھما مدۃ السفر والاٰخر اقل قصر فی الاول دون الثانی اھ، اس کی مثال یہ ہے کہ تھانہ بھون سے دیوبند براہ راست ۲۱ کوس ہے اور براہ ریل مسافتِ قصر ہے، پس براہ ریل تھانہ بھون سے دیوبند جانے والا قصر کرے گا، اور یہ نہ کہا جائے گا کہ سہارنپور سے چل کر اب سفر واپسی شروع ہوگیا، کیونکہ سہارنپور انتہائی فاصلہ کا مقام ہے، اور اب سہارنپور سے دیوبند کی طرف جُوں جوں قریب ہوں گے تھانہ بھون سے قرب ہوتا جائے گا، مثلاً نانگل جو درمیان دیوبند و سہارنپور ہے تھانہ بھون سے براہ راست

۱۵ کوس ہے، سواس کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ سہارنپور سے دیوبند جاتے ہوئے بھی یہ سفر ہی کر رہا ہے، واپسی نہیں کر رہا، گو اس کا قصد دیوبند سے تھانہ بھون براہ راست ہی آنے کا کیوں نہ ہو، اس مثال سے صورتِ سابقہ (نمبر ۵ و ۶) کی بھی وضاحت ہوگئی، کہ جو شخص مرکز سے مقام تہ کا قصد کر کے چلا ہے وہ مقام تہ پر پہونچنے سے پہلے راجع نہیں ہے گو مسافت مقام دَ سے چل کر کم ہوتی جاتی ہے، اور اگر کوئی شخص تھانہ بھون سے سہارنپور کا قصد کر کے چلا، اور اس کا ارادہ یہ ہو کہ سہارنپور سے واپس تھانہ بھون اس طرح ہوگا کہ سہارنپور سے دیوبند جاکر دیوبند سے براہ راست براہ پیادہ آئے تو یہ شخص مسافر نہیں کیونکہ تھانہ بھون سے سہارنپور مسافت قصر نہیں، اور سہارنپور سے براہ دیوبند جو واپسی ہے وہ بھی مسافتِ قصر نہیں، اس لئے اتمام کرے گا، یہ اس کی مثال ہے جو جوابِ سابق میں مرکز سے بقصد چلنے کی اور وہاں سے براہ کَ دَ دَ تہ مرکز پر واپس ہونے کے مرکوز ہے، فافہم، رہی یہ صورت کہ کوئی شخص مرکز سے مرکز ہی کی طرف عود کرنے کے ارادہ سے سفر شروع کرے، اور بصورت دائرہ سفر کرے، مثلاً مرکز، اور درمیان میں جتنے مواضع ہیں وہ سب مقصود ہیں اور مرکز سے مرکز تک ۴۸ میل کی مسافت ہے، تو اس صورت میں یہ شخص مسافر نہ ہوگا، کیونکہ یہ خروج من عمارۃ البلد کے وقت مسافتِ قصر کا قاصد نہیں، اس لئے کہ مسافتِ قصر کا تحقق مرکز سے علاوہ نہیں، بلکہ مرکز کو داخلِ مسافت کر کے مسافتِ قصر کا تحقق ہوگا اور اس سے سفر کا وجود نہیں ہوسکتا، بلکہ وجودِ سفر کے لئے یہ لازم ہے کہ مقامِ اقامت سے نکل کر اس کے علاوہ کسی ایسے مقام کا قصد ہو کہ اس میں اور مقام اقامت میں مسافت ۴۸ میل کی ہو، اس راستہ سے جس کو اس نے اختیار کیا ہے، گو دوسرے راستہ سے مسافت کم ہو، اب اگر مقامِ اقامت سے علاوہ مسافتِ قصر نہیں تو یہ مقیم ہوگا اور اس سے علاوہ ۴۸ میل ہو تو مسافر ہوگا، قال مالك فی الرجل یدور فی القری ولیس بین منزله وبین اقصاها اربعة برد وفیما یدور من دورة اربعة برد واکثر قال اذا کان فیما یدور فیه مایکون اربعة برد قصر الصلوٰۃ اھ مد ونه مالك (ص ۱۱۴ ج ۱) قلت وقواعدنا توافقه کما لا یخفی،

(۸) جس وقت امام نے خود دو رکعت پر سلام پھیرا اگر مسافر مقتدی کو معاً یہ خیال آگیا کہ امام مسافر ہے اور اس کے مقیم ہونے کا اور سہواً دو رکعت پر سلام پھیرنے کا شبہ نہیں ہوا

تب تو مقتدی کو دو رکعت پر سلام پھیر کر مطمئن رہنا چاہیئے، اور اگر امام کے متعلق سہواً دو رکعت پر سلام پھیرنے کا شبہ ہوا تو مقتدی کو امام کے ساتھ نماز ختم کر کے اگر تحقیق سے مسافر یا مقیم ہونا معلوم ہوگیا ہو تو مسافر ہونے کی صورت میں نماز صحیح ہوگئی، اور مقیم ہونے کی صورت میں اعادہ کرے، جیسا جزئیہ آیت میں مذکور ہے، اور اگر تحقیق نہیں کی اور اسی شبہ کی حالت میں مقتدی نے دو رکعت پر اکتفا کیا تو اس نماز کا اعادہ کر لے، والتفصیل فی بہشتی گوہر (ص ۵۷ و ۵۸) بحوالہ رد المحتار (ص ۸۲۷ و ۸۷۵ ج ۱) فقط ۱۰ رجب ۱۳۴۶ھ

بیوی ایک ماہ کیلئے وطن اصلی کے علاوہ کہیں اقامت اختیار کرے اور شوہر وہاں آئے تو اس کیلئے بھی وطن اقامت ہوجائے گا یا نہیں

سوال (۱۱) زوجہ اگر کہیں ماہ کے لئے مقیم ہو جاوے علاوہ وطن اصلی کے، تو شوہر اس کا اگر وہاں آوے جہاں زوجہ مقیم ہے تو کیا شوہر کے لئے بھی وطنِ اقامت ہو جاوے گا، شبہ یوں ہوا کہ خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ مولانا ظفر احمد صاحب نے میرٹھ کو صورۃً متذکرہ بالا میں وطن اقامت کا فتویٰ میرے لئے بھی دیا ہے، معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے ؟

الجواب ؛ خواجہ صاحب نے جو مسئلہ بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ وطنِ اقامت سفر سے باطل ہو جاتا ہے یہ مطلق نہیں، بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ وطنِ اقامت میں تنہا مرد کا قیام ہو، اور اگر وطنِ اقامت میں مرد کا قیام مع اہل وعیال کے ہو تو تنہا مرد کے سفر اور نہ درہ سے وطنِ اقامت باطل نہیں ہوا بلکہ وہاں اہل وعیال کا قیام حکماً اسی کا قیام ہے لیکن اگر کوئی جگہ مرد کے لئے وطنِ اقامت نہ ہو بلکہ صرف بیوی کا وطنِ اقامت ہو کہ وہ اپنی ضرورت سے بیس دن کو گئی ہو وہاں مرد مسافر ہو کر جائے گا، تو بیوی کے قیام سے مقیم نہ ہوگا، خواجہ صاحب کو میرٹھ کے متعلق فتویٰ اُس وقت دیا گیا تھا جبکہ وہ میرٹھ میں ملازم تھے، اور مع اہل وعیال کے مقیم تھے، فقط

۲۲ جمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ

مقیم ہونے کے لئے کسی خاص جگہ میں نیتِ اقامت ضروری ہے،

سوال (۱۲) ایک پیر ہے وہ منزلِ سفر طے کر کے ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں پر اُن کے بہت سے مرید ہیں مگر آٹھ دس کوس کے گرد میں ہیں یا کم اگر وہ آٹھ دس کوس کے اندر نیتِ اقامت کرے تو جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب ، آٹھ دس کوس کے اندر نیتِ اقامت معتبر نہیں، اس سے مقیم نہ ہوگا،

جب تک کسی خاص گاؤں یا قصبہ میں اقامت کی نیت نہ کرے اس طرح کہ رات کو وہیں لوٹ آئے گو دن میں اور جگہ پھرتا رہے،

فصل فی الجمعۃ والعیدین

دو ہزار کی آبادی والے گاؤں میں جمعہ کا حکم

سوال (۱) ایک موضع ہے جس میں چار مسجدیں ہیں اور اس میں بہت سے قسم کے لوگ آباد ہیں، اور بعض ضرورت کی چیزوں کی دوکانیں بھی ہیں، مگر ترتیب بازار اور شہر کی نہیں، جیسا دیہاتوں میں دوکان رکھنے کا دستور ہے، موضع خود ایک بڑا موضع ہے، اس کے علاوہ چھ موضع اور چھوٹے چھوٹے موضع مذکور کے متعلق ہیں، سب موضعوں کی معہ اس بڑے موضع کے مردم شماری غالباً دو ہزار کی ہے، آیا ایسی جگہ یعنی اس بڑے موضع میں باعتبار مذہب حنفیہ جمعہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اس موضع میں بحالت مذکورہ جمعہ صحیح نہیں ہوسکتا،

غیر عربی میں خطبہ دینے کے مسئلے میں امداد الفتاویٰ اور بہشتی گوہر کی عبارتوں میں تطبیق؛؛

سوال (۲) بہشتی گوہر میں ہے کہ خطبہ علاوہ خطبۂ عربی کے پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور فتاویٰ اشرفیہ حصہ اوّل میں ہے کہ عربی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جائز ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، صحیح کونسی عبارت ہے؟

الجواب: قال فی الدر کما صح لو شرع بغیر عربیۃ ای لسان کان الی ان قال وشرطا عجزہ وعلی ھذا الخلاف الخطبۃ وجمیع اذکار الصلوٰۃ اھ یعنی غیر القراءۃ فان العجز شرط فیہا اجماعا کما نص علیہ فی الدر فیما بعد قال الشامی قولہ وشرطا عجزہ ای عن التکبیر بالعربیۃ والمعتمد قولہ طاھ وفیہ ایضا لکن سیاتی کراھۃ الدعاء بالاعجمیۃ اھ (ص ۵۰۴ ج ۱) وفیہ (ص ۵۴۴ ج ۱) والظاھر ان الصحۃ عندہ لا تنفی الکراھۃ اھ،

اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ کے نزدیک قرأۃ کے علاوہ بقیہ اذکار جن میں خطبہ بھی داخل ہے بلا عجز کے بھی جائز ہیں، اور صاحبینؒ کے نزدیک اگر عربی سے عاجز ہو تو جائز ورنہ نہیں، اور طحطاوی نے امام صاحبؒ کے قول کو معتمد قرار دیا ہے، مگر فصل دعاء میں علامہ شامی نے تصریح کی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک جواز وصحت کراہت کے منافی نہیں،

پس قادر بالعربی کے لئے خطبہ عجمی میں جائز مگر مکروہ ہے یہی صحیح ہے، پس بہشتی گوہر اور فتاویٰ اشرفیہ کی عبارت میں منافات نہیں، فتاویٰ میں جواز سے مراد صحت ہے، وہو المعتمد کما قالہ الامام، مگر صحت کراہت کے منافی نہیں، ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ

جمعہ کی نماز کے بعد احتیاط الظہر پڑھنے کا حکم

سوال (۳) بہشتی گوہر میں مسئلہ ہے کہ بعض لوگ جمعہ کے بعد ظہر احتیاطی پڑھا کرتے ہیں، ان کو منع کرنا چاہیئے، یہ کس حالت میں شرائط صحیح ہونے کی صورت میں یا عدم شرائط کی صورت میں؟

الجواب: اگر شرائط صحت موجود ہیں تب تو ظہر احتیاطی کی ضرورت نہیں اور اگر شرائط صحت موجود نہیں تو جمعہ پڑھنا جائز نہیں ظہر ہی پڑھنا جماعت کے ساتھ واجب ہے، اس لئے ظہر احتیاطی سے ہر حال میں منع کیا جاوے، واللہ اعلم، ۳ رمضان ۱۳۴۰ھ

گاؤں میں جمعہ صحیح نہ ہونے کا بیان

سوال (۴) چند مسئلے حسب ذیل ہیں امید کہ جواب باصواب عطا فرمایا جائے، اوّلاً یہ کہ وہ کون سی دلیل در بارۂ جواز جمعہ فی القریٰ حضرات شوافع و حنابلہ وغیرہم کی ہے، جس کی وجہ سے بجز امام ابو حنیفہؒ کے یہاں تک کہ غالباً ان کے شاگردوں کا بھی یہی مذہب ہے، کہ ہر قریہ صغیرہ و کبیرہ میں جمعہ بلا دغدغہ و خرخشہ ہو سکتا ہے، اور یہ شرائط جو جماعت کے شافعیہ اور مالکیہ وغیرہ کے نزدیک لگائی گئی ہیں، کہ چالیس پچاس سے کم اگر آدمی ہوں تو جمعہ نہیں ہو سکتا، یہ تعداد کس حدیث سے ثابت کرتے ہیں، اور اگر کوئی حنفی المذہب علی الخصوص مسئلہ جمعہ میں شافعیہ وغیرہ کے مسئلہ پر متفق ہو کر وجوب جمعہ فی القریٰ کا عام اس سے کہ صغیرہ ہو یا کبیرہ قائل ہو اور ادا بھی کرے تو کیا عند اللہ ماخوذ و آثم ہوگا یا نہیں اور حنفیہ کے نزدیک کوئی ایسی دلیل دیکھی نہیں جاتی جس سے صریح ممانعت ادائے جمعہ فی القریٰ کی پائی جائے، اور ادھر ایک حدیث غالباً صحیح بخاری کی ہے مجھے بخوبی یاد نہیں وہ یہ کہ "الجمعۃ علی کل مسلم و قریۃ"۔ بہرحال آپ تو ضرور واقف ہوں گے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں اپنی دلیل میں اسی کو پیش فرما کر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک جس جگہ جماعت کثیر ہو جمعہ پڑھنا چاہیئے، اگرچہ حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اور دوسرے اس وقت دور آخر میں جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنے رسالہ فیوض قاسمیہ میں بہت بسط کے ساتھ غالباً تین ورق تک ایک خط کے جواب میں بعبارت فارسی جمعہ کی ادائیگی کے لئے ایک پُر زور تقریر تحریر فرمائی ہے، جس میں حنفیہ کو متعصب کا لفظ بھی فرمایا ہے، اور انھوں نے

گاؤں کے لوگوں کی رائے سے امام بناکر جمعہ پڑھنے اور ادا ہونے کے لئے فرمایا ہے، آپ کے علوم ظاہری و باطنی سے غالباً ہر کس وناکس اور نہ کہ ذی علم واقف نہ ہو، ملاحظہ فرمائیے فیوض قاسمی اور ایسی ہی تقریر مولانا مولوی بحرالعلوم صاحب لکھنوی نے بھی ایک چھوٹے سے رسالہ غالباً ارکانِ اربعہ میں عربی الفاظ کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، مجھے عبارت بخوبی یاد نہیں، غرضکہ بہت سے احناف کا یہ مذہب ہے کہ جمعہ دیہات میں ہونا چاہئے، اور پڑھتے بھی ہیں، ان علماء کو میں کہتا ہوں جن کی گنتی اہل علم کے نزدیک بڑے ہونے کی کی جاتی ہے، اور پھر بھی تعریفِ مصر میں بہت بڑا اختلاف ہے، اور اس وقت بعض شرائط بھی نہیں پائے جاتے، تو جب چھ شرائط میں سے کوئی مفقود ہو تو پھر جمعہ کا وجوب اور ادائے جمعہ کے کیا معنی، چنانچہ بادشاہ یا نائب بادشاہ کا منجملہ شرائط میں سے ایک شرط وجوبِ ادا کے لئے ضروری ہے، مگر ہندوستان بھر میں بالکل یہ شرط عنقا صفت ہے، پھر اس کے نہ پائے جانے پر جمعہ جو لوگ شہروں میں ادا کرتے ہیں تو کیا جمعہ ادا ہوتا ہے، غالباً اسی وجہ سے لوگوں نے احتیاط الظہر کے مسئلہ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، مگر قریب قریب ہر ایک میں خدشہ لازم آتا ہے، اور دلائل ایک نہ ایک وجہ سے جُرح پذیر ہیں، بہر حال للہ فللہ دربارۂ تحقیق جمعہ فی القریٰ و تحقیق شرائط و تعریفِ مصر کبھی براہینِ قاطعہ و ساطعہ کے ساتھ تحریر فرمائیے، تاکہ چاہِ شکوک سے نکل کر کنارۂ یقین پر فائز المرام ہوں، بینوا توجروا،

الجواب: حنفیہ کے نزدیک صحتِ جمعہ کے لئے مصر شرط ہے، امام صاحبؒ اور صاحبینؒ سب اس میں متفق ہیں، باقی ائمہ کا اختلاف ہے، پس سائل کا یہ کہنا "یہاں تک کہ غالباً اُن کے شاگردوں کا بھی یہی مذہب ہے کہ ہر قریہ صغیرہ وکبیرہ میں جمعہ بلا دغدغہ و خرخشہ ہو سکتا ہے" الخ بالکل غلط ہے، صاحبینؒ قریۂ صغیرہ میں جمعہ کو ہرگز جائز نہیں کہتے، حنفیہ کی دلیل یہ حدیث ہے روی عبدالرزاق فی مصنفہ اخبرنا معمر عن ابی اسحٰق عن الحارث عن علی رضی اللہ عنہ قال لاجمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع عمدة القاری (ص ۲۶۴ ج ۳) فان قلت فیہ الحارث الاعور وقد کذبہ الشعبی وغیرہ قلت قد وثقہ ابن معین وغیرہ، ففی تھذیب التھذیب ج ۲ ص ۱۴۶ و قال الدوری عن ابن معین الحارث قد سمع من ابن مسعود ولیس بہ بأس وقال عثمان الدارمی عن ابن معین ثقة اھ وفیہ ایضاص ۱۴۷ ج ۲ و قال

ابن ابی خیثمة قیل لیحیی یحتج بالحارث فقال مازال المحدثون یقبلون حدیثه
وقال ابن عبد البر فی کتاب العلم له لما حکی عن ابراهیم انه کذب الحارث
اظن الشعبی عوقب بقوله فی الحارث کذاب ولم یبن من الحارث کذبه
وانما نقم علیه افراطه فی حب علی وقال ابن شاهین فی الثقات قال احمد
بن صالح المصری الحارث الاعور ثقة ما احفظه وما احسن ما روی عن علی و
اثنی علیه قیل له فقد قال الشعبی کان یکذب قال لم یکن یکذب فی الحدیث
انما کان کذبه فی رایه وقرأت بخط الذهبی فی المیزان والنسائی مع تعنته فی
فی الرجال قد احتج به والجمهور علی توهینه مع روایتهم لحدیثه فی الابواب
وهذا الشعبی یکذبه ثم یروی عنه والظاهر انه یکذب حکایاته لا فی الحدیث
اه فظهر بذلک ان الحارث لیس ممن اجمع علی ضعفه بل هو مختلف فیه ثقه
بعضهم والاختلاف فی التوثیق لا یضر فان رجال الصحیحین ایضا لا یخلون من
کلام، قال فی عمدة القاری وروی ایضا بسند صحیح حدثنا جریر عن منصور عن طلحة
عن سعد بن عبیدة عن ابی عبد الرحمن انه قال قال علی رضی الله عنه لا جمعة
ولا تشریق الا فی مصر جامع اه ص ۲۶۴ ج ۳ وفی الدرایة لابن حجر وروی
عبد الرزاق عن علی موقوفا لا تشریق ولا جمعة الا فی مصر جامع واسناده صحیح اه ص ۱۳۱

اس تحقیق سے یہ امر واضح ہوگیا کہ اس حدیث کے دو طریق صحیح ہیں، اور ایک طریق میں حارث اعور
ہے، وہ بھی اگر صحیح نہیں تو حسن ضرور ہی، اور ایک طریق ابن ابی شیبہ کے نزدیک اور ہے:

حدثنا عباد بن العوام عن حجاج عن ابی اسحق عن الحارث عن علی قال لا جمعة
ولا تشریق ولا صلوٰة فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او مدینة عظیمة اه
نصب الرایة ج۱ ص ۳۱۳، وفیه الحجاج بن ارطاة مختلف فیه وثقه الثوری
وقال ابوطالب عن احمد کان من الحفاظ وقال البزار کان حافظا مدلسا وکان
معجبا بنفسه وکان شعبة یثنی علیه ولا اعلم احدا لم یرو عنه یعنی ممن
لقیه الا عبد الله بن ادریس اه کذا فی تهذیب التهذیب ص۱۹۶ و۱۹۷ و۱۹۸ ج ۲
وقال ابن القیم فی زاد المعاد وحدیثه لا ینزل عن درجة الحسن ما لم ینفرد بشیء
او یخالف الثقات اه قلت وهذا لیس مما تفرد به وافقه الثقات فی معنی

ماروا ہ فھو حسن وفی عمدۃ الرعایۃ وصححہ ابن حزم فی المحلی اھ ، رہا یہ اعتراض کہ یہ حدیث موقوف ہی مرفوع نہیں، اس کا جواب اصولِ حدیث جاننے والے پر ظاہر ہے کہ قول صحابی مالا یدرک بالقیاس میں حکماً مرفوع ہوتا ہے قال السیوطی فی تدریب الراوی ص ٦٣ ومن المرفوع ایضا ماجاء عن الصحابی ومثلہ لایقال من قبل الرائی ولا مجال للاجتہاد فیہ فیحمل علی السماع جزم بہ الرازی فی المحصول وغیر واحد من ائمۃ الحدیث اھ ، اور ظاہر ہے کہ صحتِ جمعہ وفطر واضحیٰ کے لئے حضرت علیؓ کا ایک ایسی شرط لگانا جو دوسری نمازوں کے لئے نہیں ہے، محض رائے اور قیاس سے ممکن نہیں، پس یہ بھی قاعدہ محدثین پر مرفوع میں داخل ہے، دوسری دلیل حنفیہ کی یہ ہے اخرج البخاری عن عروۃ عن عائشۃ رضؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت کان الناس یتنابون الجمعۃ (ویروی یتناوبون) من منازلھم والعوالی فیأتون فی الغبار یصیبھم الغبار والعرق فیخرج منھم العرق فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان منھم وھو عندی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لوانکم تطھرتم لیومکم ھذا الحدیث ، اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نماز جمعہ کے لئے عوالی وغیرہ سے نوبت بہ نوبت آنا ثابت ہوا جس سے صاف ظاہر ہے کہ گاؤں والوں پر جمعہ واجب نہیں ہے' اور نہ گاؤں میں جمعہ ادا ہوتا ہے' ورنہ جو لوگ عوالی میں رہتے تھے ان کو وہیں ادائے جمعہ کا حکم ہوتا یا اُن سب کو مدینہ آنا واجب ہوتا، حالانکہ عوالی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی وقت کسی جگہ کبھی جمعہ ہونا ثابت نہیں ہوتا،

اور تیسری دلیل حنفیہ کی یہ ہے کہ حضرات صحابہ نے فتح وبلاد کے ساتھ منابر اور مساجد جامعہ کی تعمیر امصار میں ہی کی تھی، کسی گاؤں میں ہرگز صحابہؓ نے منبر اور جامع مسجد تعمیر نہیں کی، اگر ایسا ہوتا تو اس کی ضرور احادیث میں کوئی اصل ملتی، ومن ادعی فعلیہ البیان' قال المحقق ابن الھمام فی الفتح انہ لم ینقل عن الصحابۃ انھم حین فتحوا البلاد واشتغلوا بنصب المنابر والجمع الافی الامصار دون القری ولو کان لنقل ولو احاد اھ ، لہٰذا ان دلائل سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ حنفیہ کے پاس اس مسئلہ میں دلیل نقلی صحیح وعقلی قوی موجود ہے، پس کسی حنفی المذہب کو چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا، اور یہ جو سائل نے لکھا ہے کہ اُدھر (یعنی امام شافعیؒ وغیرہ کی طرف

... ایک حدیث غالباً صحیح بخاری کی ہے مجھے بخوبی یاد نہیں وہ یہ ہے "الجمعۃ علیٰ کل مسلم وقریۃ سو یہ الفاظ کسی حدیث کے نہیں، سائل کو حدیث نبوی کی نقل میں اٹکل پچو لکھنے سے احتراز واجب تھا، بدون خود الفاظ دیکھے ہوئے یا کسی عالم سے پوچھے ہوئے غلط سلط الفاظ لکھنا اس کو جائز نہ تھا، بخاری میں جو حدیث شافعیہ وغیرہ کی دلیل ہے وہ یہ ہے عن ابن عباسؓ قال ان اوّل جمعۃ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد عبد القیس بجواثیٰ من البحرین، اس سے بعض ائمہ نے جواز جمعہ فی القریٰ پر استدلال کیا ہے، مگر اس استدلال کا تمام ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے جواثیٰ کا گاؤں ہونا ثابت کیا ہو، حالانکہ اب تک یہ بات ثابت نہیں ہوسکی جن لوگوں نے جواثیٰ کو گاؤں کہاہے ان کی دلیل صرف یہ ہے کہ بعض روایات میں اس کی نسبت قریۃ من البحرین کا لفظ آیا ہے لیکن یہ دلیل کافی نہیں، کیونکہ اوّل تو لفظ قریہ کا اطلاق لغتِ عرب میں عام ہے، شہر کو بھی قریہ کہدیتے ہیں، چنانچہ خود قرآن میں ہے وقالوا لولا نزل ھذا القراٰن علیٰ رجل من القریتین عظیم، مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں قریتین سے مکہ وطائف مراد ہیں، پس ممکن ہے کہ جواثیٰ شہر ہو جسکو معنی لغوی عام کی بناء پر قریہ کہدیا گیا ہو، اور اس احتمال کی تائید ان اقوال سے ہوتی ہے، حکیٰ ابن التین عن الشیخ ابی الحسن انہا مدینۃ وفی الصحاح للجوھری والبلدان للزمخشری جواثیٰ حصن من البحرین وقال ابو عبید البکری ھی مدینۃ بالبحرین لعبد القیس، ص ۲۶۳ ج ۱، عینی علی البخاری،

ان اقوال سے جواثیٰ کا شہر ہونا معلوم ہوتا ہے، پس دیگر ائمہ کا استدلال ساقط ہے، اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ جواثیٰ گاؤں ہی تھا، اور وہاں صحابہؓ نے جمعہ پڑھا تو پھر بھی اس حدیث سے استدلال کرنا اس پر موقوف ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کے اس فعل کی اطلاع بھی ہوئی اور آپؐ نے سکوت فرمایا، حالانکہ اطلاعِ نبویؐ کا ثبوت اب تک کوئی نہیں ملا، پس ایسی کمزور دلیل سے جمعہ کا جواز گاؤں میں ثابت نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے کہ جمعہ کی نماز پنجوقتہ نماز کی طرح ہر جگہ جائز نہیں چنانچہ جنگل بیابان میں جواز جمعہ کا کوئی قائل نہیں، بلکہ ہر ایک امام نے کچھ نہ کچھ شرط جواز جمعہ کیلئے ضرور لگائی ہے، شہر میں جوازِ جمعہ پر سب کا اجماع ہے، اور گاؤں میں جائز ہونے کے لئے کوئی شافی دلیل ان کے پاس نہیں ہے، اس لئے محض مشکوک دلائل سے

گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہو سکتا، باقی سائل حجۃ اللہ البالغہ اور فیوضِ قاسمیہ و ارکان اربعہ کی عبارات کا جو حوالہ دیا ہے، سو ان کتابوں کی عبارات اس کو نقل کرنا چاہئے تھیں، یہ کتابیں میرے پاس موجود نہیں ہیں، باقی محض سائل کا لکھ دینا کافی نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے سمجھنے میں غلطی کی ہو، جیسا کہ حدیث بخاری کی نقل میں اس نے پہلے غلطی کی ہے، اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ سائل کو معلوم ہونا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب و مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا بحر العلوم کو ہم امام شافعی و امام مالک و امام احمد بن حنبل کی خاک پا کے برابر بھی نہیں سمجھتے، تو جب ہم نے اس مسئلہ میں ان ائمۂ ثلاثہ کے قول کے خلاف ابو حنیفہ کا قول اختیار کیا ہے، کیونکہ روایۃً و درایۃً ان کا قول ہمارے نزدیک صحیح ہے تو ہم ان متاخرین کے قول کو اس کے مقابلہ میں کب تسلیم کر سکتے ہیں، اُن کے اقوال کو ائمۂ اربعہ کے اقوال سے کیا نسبت ہے، کچھ نہیں، اگر ان کی تحقیق امام ابو حنیفہؒ کے خلاف ہی ہوا کرے ہم نے اُن کی تقلید کا التزام نہیں کیا، بعد میں فیوض قاسمیہ کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سائل نے مولانا قاسم العلوم کا مطلب بالکل نہیں سمجھا، مولانا قاسم العلوم کی عبارت کا مطلب سمجھنے کے لئے بڑی عقل کی ضرورت ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ سائل نے مولانا کی کس عبارت سے یہ مطلب سمجھا ہے، کہ جمعہ کے لئے مصر و اذنِ سلطان وغیرہ شرط نہیں، وہ اس عبارت کو پھر لکھے، پھر جواب دیا جائے گا، رہا مصر کی تعریف میں فقہاء کا اختلاف ہونا، سو یہ اختلاف عنوان کا ہے حقیقت کا اختلاف نہیں، مراد سب کی ایک ہے، یعنی اتنی بڑی بستی جہاں انسانی تمام ضروریات مل جاتی ہوں، لیکن ہر زمانے میں ایسی بستیوں کی مختلف علامتیں رہی ہیں، اس لئے فقہاء کی عبارات میں مختلف الفاظ وارد ہوگئے، جیسے ہم کسی سے یوں کہیں کہ مسلمانوں کی علامت یہ ہے کہ اُن کی داڑھی لمبی اور مونچھیں کتری ہوئی ہوں، اور نماز پڑھتے ہوں، ایک زمانہ ایسا آیا کہ مسلمانوں نے ان کاموں میں سستی کر دی، پھر کسی نے یہ تعریف کی کہ جن کے کرتے لمبے پائجامے ٹخنوں سے اوپر ہوں، کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں نے یہ وضع بھی ترک کر دی، تو اب یہ تعریف کی کہ جو ترکی ٹوپی پہنتے ہوں، تو اب ان مختلف تعبیروں کے بدلنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمانوں کی حقیقت بدل گئی نہیں حقیقت ایک ہی ہے، لیکن ہر زمانہ کے اعتبار سے ان کی علامت جدا ہوگئی، اسی طرح شہر کے معنی سب لوگ جانتے ہیں گو اس کی علامتیں ہر زمانہ میں جدا ہوں،

رہا اذن سلطان یا سلطان کا شرط ہونا سو اس کے متعلق حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ اذنِ

سلطان اگر متعذر ہو تو عام مسلمان جس کو امام وخطیب مقرر کرلیں جائز ہے، قال فی الدر ونصب العامۃ الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر اما مع عدمھم فیجوز للضرورۃ اھ ج ا ص ۸۴۲ قال الشامی تحتہ فلو الولاۃ کفاراً یجوز للمسلمین اقامۃ الجمعۃ ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیھم ان یلتمسوا والیاً مسلماً، اھ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اذنِ سلطان کی شرط موجودگی سلطان میں ہے، اور اگر سلطان نہ ہو تو یہ شرط نہیں، اور درحقیقت اذنِ سلطان کی شرط بھی شرطِ مصر کے تابع ہے، اصل شرط مصر ہے، لیکن چونکہ سلطان کو یہ اختیار ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی مصلحت کی وجہ سے گاؤں کو شہر بنا دے، یا شہر کو گاؤں بنا دے، تو سلطان کے ہوتے ہوئے اس کے اذن کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ سلطان کا ارادہ اس شہر کو شہر باقی رکھنے کا ہے گاؤں بنانے کا ارادہ نہیں ہے، فافہم، باقی تفصیل اس مسئلہ کی رسالہ "القول البدیع" مؤلفہ حکیم الامتؒ و "احسن القریٰ" مؤلفہ شیخ العالم دیوبندی قدس سرہٗ میں ملے گی، اس فتویٰ میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں،

غیر عربی زبان میں خطبہ کے متعلق بعض فقہاء کی عبارات کا مطلب

سوال (۵) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس بارہ میں کہ عبارتوں مندرجہ ذیل سے فقہاء کرام کی کیا غرضیں ہیں، اور کیا مطلب ہے، علامہ ملہم من اللہ حسن شرنبلالی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں تحریر فرماتے ہیں: فینبغی للخطیب التنبیہ علیھا فی خطبۃ الجمعۃ التی یلیھا العید اھ، علامہ فقیہ العصر ابن نجیم بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں زیر قول صاحب کنز ویعلم الاضحیۃ الخ تحریر فرماتے ہیں فینبغی للخطیب ان یعلمھم احکامہ فی الجمعۃ قبل عید الاضحیٰ کما انہ ینبغی ان یعلمھم احکام صدقۃ الفطر فی الجمعۃ التی قبل عید الفطر لیتعلموھا ویخرجوھا قبل الخروج الی المصلی ولم ارہ منقولا والعلم امانۃ فی عنق العلماء ویستفاد من کلامھم ان الخطیب اذا رای بھم...... حاجۃ الی معرفۃ بعض الاحکام فانہ یعلمھم ایاھا فی خطبۃ الجمعۃ خصوصاً فی زماننا من کثرۃ الجھلۃ وقلۃ العلم فینبغی ان یعلمھم احکام الصلوٰۃ کما لا یخفی اھ، اسی طرح درمختار وشامی مطبوعہ مصر، ص ۸۷۴ و ۸۷۵ ج ا میں بھی ہے، علامہ ابن عابدین نے ماتن کے کلام کا

تتمہ بحرالرائق ہی سے نقل کیا ہے، یہ تعلیم خطبۂ جمعہ میں کس طرح کی جاوے، اس تعلیم میں سامعین کو فائدہ پہنچانا ہے یا صرف خطیب کا ہی سمجھنا مقصود ہے، اور بقول ابن نجیم وابن عابدین نماز وغیرہ کے احکام کی تعلیم کس طور ہو، ہمارے ائمہ کے فرمان تو صاف ہیں، مگر آپ جیسے ہمارے پیشواؤں سے حلِ عقد کرانا اندھیرے میں چراغ یا چراغ کو سلائی لگا دینا ہے، بلاسلائی لگائی چراغ سے غیر ممکن ہے، بینوا توجروا؟

الجواب: خطیب کو چاہئے کہ خطبۂ عربیہ مختصر پڑھکر ضروری احکام مناسب وقت میں اپنی زبان میں بیان کر دیا کرے، باقی تمام خطبہ کا عربی میں نہ ہونا خلاف سنت ہے، حضرات صحابہ نے بلادِ عجم میں بھی عربی ہی میں خطبہ پڑھا ہے، لیکن اس وقت اسلامی حکومت تھی تمام قضایا اور فیصلے عربی زبان میں لکھے جاتے تھے، اس لئے اہلِ عجم عموماً عربی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے تھے، اس وقت بھی مسلمانوں کو عربی زبان سیکھنا چاہئے تاکہ دین کی حفاظت رہے، خطبۂ عربی کو عوام کی سستی کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ بعد خطبۂ عربیہ کے اردو وغیرہ میں مسائل ضروریہ بیان کر دیئے جاویں،

نمازِ عیدین کا عیدگاہ میں پڑھنا سنت ہے،

سوال (٦) نمازِ عیدین مسجد میں ہی پڑھنی چاہئے یا جنگل میں اصل شرعی حکم کیا ہے؟ جو لوگ اپنی ضدِ نفسانیت سے عناداً جنگل میں نہ جائیں اور مسجد ہی میں پڑھیں، اور خطیب جامع مسجد دوسرے لوگوں کے ہمراہ جنگل میں پڑھتا ہو، اور تھوڑے اپنی نفسانیت سے نہ جائیں، اور کوئی عذر شرعی بھی نہ ہو، تو ان کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

الجواب: نمازِ عیدین کا عیدگاہ میں پڑھنا سنت ہے، بلا وجہ اس سنت کا چھوڑنا بُرا ہے، لیکن اگر کوئی جماعت شہر ہی میں عید کی نماز بلا عذر پڑھ لے تو اس کو بھی ملامت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ صلوٰۃ عید کا متعدد مواقع پڑھنا بالاتفاق جائز ہے، اور اگر کوئی جماعت بستی میں عید کی نماز اس لئے پڑھے کہ مثلاً عیدگاہ کا امام جاہل یا فاسق ہے تو یہ جماعت اس فعل میں معذور ہے قال فی الدر والخروج الیها ای الی الجبانة لصلاة العید سنة وان وسعهم المسجد الجامع هو الصحیح اھ قال الشامی قوله وهو الصحیح قال فی الظهیریة وقال بعضهم لیس بسنة وتعارف الناس ذلك لضیق المسجد وکثرة ازدحام والصحیح هو الاول اھ وفی الخلاصة والخانیة

السنۃ ان یخرج الامام الی الجبانۃ ویستخلف غیرہ لیصلی فی المصر بالضعفاء بناء علی ان صلوٰۃ العیدین فی موضعین جائزۃ بالاتفاق وان لم یستخلف فلہ ذلک اھ نوح ص ۸۶۷ ج ۱، والدلیل علی الجزء الاخیر کراھۃ الصلوٰۃ خلف الفاسق اتفاقاً لیکن دینی کاموں میں ضد اور نفسانیت کو کام میں لانا گناہ ہے، اگر کوئی غرض محمود ہو تو بستی میں بھی عید کی نماز جائز ہے،

عیدگاہ کو پختہ تعمیر کرنا جائز ہے

سوال (۷) عیدگاہ پختہ بنانا شرع شریف میں درست ہے یا نہیں؟ علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی رحمہ اللہ "جذب القلوب الی دیار المحبوب" میں جو زیریں بیان مصلی عید تحریر فرماتے ہیں، "مصلّے عید در زمانِ آں سرور بنا نداشت، بلکہ از بناے آں نہی فرمود" علامہ سمہودی وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ صفحہ میں لکھتے ہیں:۔ ولم یکن المصلّی فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجداً بل کانت صحراء لابناء بہا ونھی صلی اللہ علیہ وسلم عن البناء بہا اھ، نیز صفحہ ۱۱ میں ہے؛ روی ابن شیبۃ عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج الی المصلّی یستسقی فبدأ بالخطبۃ ثم صلّی وکبر واحدۃ افتتح بہا الصلوٰۃ وقال ھذا مجمعنا ومستمطرنا ومدعانا لعیدنا ولفطرنا واضحانا فلا یبنی فیہ لبنۃ علی لبنۃ ولاخیمۃ اسی طرح خلاصۃ الوفاء میں بھی ہے، اُن کی کیا غرض ہے؟ بینوا توجروا،

الجواب: عیدگاہ پختہ تعمیر کرنا جائز ہے، قال الشامی وفی الخلاصۃ عن خواھر زادہ ھذا ای بناءہ حسن فی زماننا اھ ص ۸۶۸ ج ۱ وفی البخاری عن ابی سعید وفیہ فلما اتینا المصلی اذا منبر بناہ کثیر بن الصلت اھ قلت ولم ینکر علیہ الصحابۃ واستمر ذلک بعدہ فکان اجماعا علی جوازہ قال الحافظ فی الفتح وقد وقع فی المدونۃ لمالک رواہ عمر بن شیبۃ عن ابی غسان عنہ قال اوّل من خطب الناس فی المصلی علی منبر عثمان بن عفان کلمھم علی منبر من طین بناہ کثیر بن الصلت اھ وقال ایضا وفی ھذا الحدیث من الفوائد بنیان المنبر قال الزین بن المنیر وانما اختار ان یکون باللبن لامن الخشب لکونہ یترک بالصحراء فی غیر حرز فیؤمن علیہ النقل اھ قلت فلو احیط المنبر بالاسوار من الجدار ان لاجل صیانتہ وبقاءہ فلا باس بہ لانہ ادخل فی

الامن من النقل اھ،

اور جو احادیث سائل نے جذب القلوب اور سمہودی سے نقل کی ہیں جن میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلیٰ میں عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے، ان کا مطلب بتقدیر صحت یہ ہے کہ میدان مصلّےٰ میں کوئی شخص اپنا گھر نہ بنا دے، بلکہ اس کو نماز عید کے واسطے وقف کر دینا ضروری ہے، کسی کو خاص اپنا قبضہ اس پر جمانا جائز نہیں، میں کہتا ہوں کہ اس مصلحت کے لئے بھی عیدگاہ کا پختہ بنا دینا اولیٰ ہے، تاکہ خالی زمین دیکھکر کوئی شخص اس پر قبضہ نہ کر بیٹھے، کیونکہ آجکل زراعت کرنے والے وقف کی زمین کو بھی تھوڑی بہت اپنی زراعت میں داخل کر لیں گے، پھر اُن سے مقدمہ لڑنا اور زمین عیدگاہ کو ان کے قبضہ سے نکالنا دردِ سری ہے، غالباً انہی مصلحتوں پر نظر کرکے متقدمین نے بناء عیدگاہ کو پسند کیا ہے، واللہ اعلم،

۲۱ ر ذی الحجہ ۴۰ھ

عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم

سوال (۸) عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر تشریق کہی جائے یا نہ، کیونکہ بعض علماء کو دیکھا ہے کہ نماز کے بعد فی الفور ہی تکبیر کہہ لیتے ہیں، جب خطبہ شروع کرتے ہیں، اور بعضوں کو دیکھا ہے کہ نماز پڑھتے ہی تکبیر نہیں کہتے بلکہ ممبر پر چلے جاتے ہیں اور خطبہ شروع کر دیتے ہیں، تو آیا ان دونوں صورتوں میں بہتر و فتویٰ کس پر ہے،؟ بینوا توجروا،

الجواب؛ قال فی الدر ولا بأس به (ای التکبیر) عقب العید لان المسلمین توارثوہ فوجب اتباعھم وعلیہ البلخیون اھ قال الشامی قولہ فوجب الظاھر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح وفی البحر عن المجتبیٰ والبلخیون یکبرون عقب صلوٰۃ العید لانھا تؤدی بجماعۃ فاشبھت الجمعۃ اھ وھو یفید الوجوب المصطلح علیہ ط اھ ص ۸۲۹ ج ۱،

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر تشریق باآواز بلند کہنا چاہئے واللہ اعلم، ۲۱ ر ذی الحجہ ۴۰ھ

جمعہ میں ایک آدمی کو خطبہ اور دوسرے کو نماز پڑھانا

سوال (۹)۔ نماز جمعہ میں ایک آدمی کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کا نماز پڑھانا شرع شریف میں درست ہے یا نہ، اگر درست

ہے تو مع الکراہت ہی یا بلا کراہت، اگر مکروہ ہے تو تحریم ہے یا تنزیہی،

(۲) پیچھے تنہا ایک آدمی کھڑا ہو، نیت کرنے سے قبل آگے کی صف سے ایک آدمی کو کھینچ لیوے یا بعد نیت، از تحریر جواب سرفراز فرمائیں،

الجواب: جمعہ میں ایک آدمی کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کا اجازت خطیب سے نماز پڑھانا جائز ہے، مگر اس مسئلہ میں مشائخ کا اختلاف ہی، کہ بلا ضرورت ایسا کرنے کو بعض نے منع کیا ہے، لہذا اس سے احتراز اَولیٰ ہے، (فی السراجیة لو صلّی احد بغیر اذن الخطیب الا اذا اقتدیٰ به من له ولایة الجمعة (کذا فی الدر) وفی الشامیة شمل الخطیب الماذون وذلك لان الاقتداء به اذن دلالته بخلاف مالو حضر ولم یقتد وعلیه تحمل عبارة الخانیة السابقة ثم اذا کان حضوره بدون اقتداء لم یعتبر اذ نا یفهم منه انه لا یجوز خطبة غیره بلا اذن بالاولیٰ خلافاً لمن فهم منه الجواز افاده ط (ص ۱۲۸۴ ج ۱)

(۲) پیچھے صف کے جو آدمی کھڑا ہو وہ تنہا کھڑا ہو جاوے اگلی صف میں سے کسی کو نہ کھینچے نہ بعد نیت کے نہ قبل نیت کے، قال الطحطاوی فی حاشیة مراقی الفلاح والاولیٰ فی زماننا عدم الجذب والقیام وحده، واللہ اعلم ۲۴ر صفر ۱۳۴۱ھ

نماز عیدین کے بعد رفع یدین کے ساتھ مناجات کا حکم

سوال (۱۰) .... بعد سلام نماز عیدین کے مناجات برفع یدین جائز ہے یا ناجائز، اگر جائز ہی تو کرنے والوں پر ثواب و برکات دارین کی امید ہی یا نہیں اور اس کے منکر یعنی نہ کرنیوالوں پر، اور دوسرے کو کرنے میں منع کرنے والوں پر شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: نماز کے بعد دعاء کرنا مطلقاً جائز ہے، اور رفع یدین آداب دعاء سے ہے، لہذا بعد نماز عیدین کے دعاء برفع یدین جائز ہے، اور ثواب کی بھی امید ہے، مگر اس کو ضروری نہ سمجھا جاوے اور جو لوگ اس سے منع کرتے ہیں، اگر ان کا مطلب یہ ہی کہ اس وقت دعاء کرنا جائز ہی نہیں تب تو وہ غلط کہتے ہیں، اور مباح سے روکنے کے سبب لِمَ تحرم ما احل اللہ لک کے مخاطب ہیں، اور اگر یہ مطلب ہی کہ اس وقت دعاء برفع یدین ضروری نہیں تو ان کا قول بھی صحیح ہے، اُن سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں، قال فی الحصن فی آداب الدعاء والصلوٰة عه رحب مُس وفی الحرز ای ذات

الرکوع والسجود والمراد ان یقع الدعاء المطلوب بعدھا فھی من باب تقدیم العمل الصالح والتوسل بہ اھ اس سے معلوم ہوا کہ ہر نماز ذات رکوع وسجود کے بعد دعا جائز ہے، وفیہ ایضاً وبسط الیدین مس ورفعھما ع، واللہ اعلم،

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا

سوال (۱۱) بوقت نماز جمعہ بوقت خطبہ عصا لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: عصا لینا بوقتِ خطبہ سنت ہے، مگر سنتِ مقصودہ نہ سمجھے، گاہے ترک بھی کردے، قال فی الدر ویکرہ ان یتکی علی عصا اوقوس اھ وفی الشامیۃ استشکلہ فی الحلیہ بانہ فی روایۃ ابی داؤد انہ صلی اللہ علیہ وسلم قام ای فی الخطبۃ متوکا علی عصا اوقوس اھ ونقل القھستانی عن عین المحیط ان اخذ العصا سنۃ کالقیام اھ قلت ومحمل الکراھۃ اعتقادہ سنۃ مقصودۃ، واللہ اعلم

ضد وعداوت سے دوسری مسجد میں اقامتِ جمعہ کرنے کا حکم، جبکہ مسجدِ قدیم کو نقصان بھی پہنچتا ہو

سوال (۱۲) ....
....
....
.... بیرونجات شہر یعنی دیہات میں ادائے نماز جمعہ کا کیا حکم ہے، خصوصاً بستی سورۃ میانی جو بقدر دو میل کے فاصلہ پر ملتان شریف کے غرب کی طرف ہے اس بستی[ع] میں عرصۂ دراز سے کہنہ وجامع مسجد موسومہ مولوی گل محمد صاحب مرحوم والی جو مشہور ومعروف اور موجود ہے، اور آج تک بفضلِ خدا وندا کبر آباد ہے، جس کی نو تعمیر کسی شخص کو خواہ طویل العمر اور سن رسیدہ بھی ہو کوئی حال معلوم نہیں کہ کس تاریخ یا کس زمانہ میں اس مسجد شریف کی تعمیر شروع ہوئی ہے، ہاں البتہ کچھ عرصۂ دراز سے مرمت کی تاریخ اس مسجد شریف مذکور کی محراب پر لکھی ہوئی ہے، جس مرمت کو عرصہ ایک سو تیس سال کا گذر چکا ہے، شروع بنیاد کا کوئی حال معلوم نہیں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس مسجد شریف مذکور کو تیار ہوتے ہی نماز جمعہ جاری یا کوئی زمانہ پیچھے شروع ہوئی ہے

ع جس میں تقریباً دو سو مکانات ہیں، جن میں سے تخمیناً ۵۰ مکانات اہل ہنود ہیں اور تخمیناً ایک سو مکانات اہل شیعہ ہیں اور تخمیناً ۵۰ مکانات اہل سنت ہیں اور متفرق تین جگہ پر بیس دوکانات بھی ہیں ۱۲

ہاں البتہ اپنے بزرگان سے یہ سنا گیا ہے کہ بادشاہ نواب صاحب نے اپنی عملداری میں باتفاق تمام مسلمانان اس مسجد شریف مذکورہ میں نماز جمعہ ادا کی ہے، علیٰ ہذا القیاس آباء واجداد سے یعنی قدیم الایام سے تاحال کے زمانہ تک نماز جمعہ جاری ہے، الحمدللہ، ونیز اس مسجد شریف کے گرد ونواح کی متفرق بستیوں میں بہت سی مساجد نو وکہنہ موجود ہیں، جنھوں نے آجتک ایسا کوئی موقع نہیں گذرا کہ ان مساجد میں بھی نمازِ جمعہ ادا کی گئی ہو، کیونکہ یہ مسجد شریف مذکورہ تمام گرد ونواح کی مسجد سے بڑی مسجد ہے، اور جامع مسجد ہے، اور تمام مساجد اس مسجد شریف سے چھوٹی ہیں، بلکہ چند مساجد غیر آباد بھی ہیں، تمام لوگ گرد ونواح کے باہمیں اتفاق سے جمع ہوکر اسی مسجد شریف مذکورہ میں نمازِ جمعہ ادا کرتے چلے آتے ہیں، بلکہ بہت سے علماء عظام واعظین وغیرہ خواہ ملتان شریف کے ہوں یا بیرونجات کے ہوں جو متفرق بستیوں میں وعظ فرمانے کو تشریف لاتے ہیں اور روز جمعہ کا ہوتا تھا، تو پہلے اسی مسجد شریف مذکورہ میں نمازِ جمعہ ادا کرکے پھر متفرق بستیوں کی مساجد میں وعظ بیان فرماتے چلے آتے ہیں، آجتک کسی عالم نے متفرق بستیوں کی مساجد میں نمازِ جمعہ ادا نہیں کی، خصوصاً اس مسجد شریف مذکورہ میں کوئی ایسا امر شرعیہ مانع نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے گرد ونواح کی مساجدِ متفرقہ میں بھی نماز جمعہ ادا کی جاوے۔

جنابِ من آج عرصہ ڈیڑھ سال کا گذر چکا ہے کہ اقوامِ شیخان نے بسبب عداوت اور ضد کے اور واسطے آزار دینے اور بیرونق کرنے اس مسجد شریف مذکورہ کے اپنی مسجد کو جو برفاصلہ ۵۰ یا ۶۰ قدم پر ہے خوب سنوار کر اور آراستہ کرکے بلکہ بعض بعض مردمان نماز خوانندگان کو راستہ سے روک کر اپنی مسجد شریف کی ترغیب دے کر ایک ملّا نو تعلیم یافتہ غیر علاقہ کا بلا کر فی نمازِ جمعہ مبلغ ۶؍ یا عوض نقد دے کر نمازِ جمعہ جاری کردی ہے، کیونکہ ان کی مسجد شریف کا خاص امام مقرر نہیں ہے، جو آگیا اس نے نماز پڑھادی، بعض اوقات کوئی شخص نماز پڑھانے والا جو نہیں ہوتا، اکیلے نماز بھی پڑھی جاتی ہے، چند دفع لوگوں نے کہا ہے کہ تم ضد اور عداوت کو چھوڑ دو، اور آپس میں اتفاق رکھ کر جس مسجد میں نماز ہوتی رہتی ہے وہاں پڑھو، ہرگز نہیں مانتے، بلکہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری مسجد شریف بھی جامع مسجد ہے، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جس نے نماز جمعہ پہلے ادا کرلی اس کی نماز جمعہ درست ہے، اور جس نے پیچھے ادا کی اس کی نمازِ جمعہ ناجائز ہے، اس واسطے ہم

ان سے پہلے نمازِ جمعہ ادا کر لیتے ہیں، تاکہ ہماری نماز درست ہوجائے اور ان کی نماز ناجائز ہوجائے ایا شرعاً اس مسئلہ کے بارے میں کیا حکم ہے، بینوا و توجروا، جواب بمعہ نقول کتب فتویٰ علیہ و بمعہ مواہیر یا دستخط خود تحریر فرماویں، کہ عنداللہ ماجور و عندالناس مشکور ہوں گے،

الجواب؛ صورتِ مسئولہ میں جن لوگوں نے محض عناد اور ضد کی وجہ سے دوسری مسجد میں جمعہ قائم کیا ہے وہ گنہگار ہیں قال العلامۃ عبد الحی فی فتاواہ قال البغوی و قال عطاء لما فتح اللہ علی عمر الامصار امر المسلمین ان یبنوا المساجد وامرھم ان لا یبنوا فی مدینتھم مسجدین یضار احدھما الاٰخر اھ ص ۲۰۶ ج ۱، پس اس صورت میں کہ سب لوگ مسجد قدیم میں جمعہ پڑھنے پر راضی ہیں اور وہاں جمعہ کا انتظام بھی ہمیشہ سے ہے، بلاضرورت بلاوجہ محض ضد و نفسانیت سے دوسری جگہ جمعہ قائم کرنا اور اس مسجدِ قدیم کے درپے تخریب ہونا سببِ گناہِ عظیم ہے، گو دوسری مسجد میں بھی جمعہ درست ہوجائے گا، مگر جو لوگ ضد و نفسانیت کی وجہ سے وہاں جمعہ پڑھیں گے ان کو گناہ بھی ہوگا، اور جو لوگ خالی الذہن ہو کر وہاں جمعہ پڑھیں گے ان کو گناہ تو نہ ہوگا مگر مسجد قدیم کے برابر ثواب نہ ملے گا، کیونکہ مسجد قدیم میں جدید سے زیادہ فضیلت و ثواب ہے، قال فی رد المحتار فی مسئلۃ تعدد الجمعۃ فی بلدۃ واحدۃ ما نصہ لان جواز التعدد وان کان ارجح واقوی دلیلا لکن فیہ شبھۃ قویۃ لان خلافہ مروی عن ابی حنیفۃ واختارہ الطحاوی والتمرتاشی وصاحب المختار وجعلہ العتابی اظھر وھو مذھب الشافعی والمشھور عن مالک واحدی الروایتین عن احمد کما ذکرہ المقدسی فی رسالتہ نور الشمعۃ فی ظھر الجمعۃ بل قال السبکی من الشافعیۃ انہ قول اکثر العلماء ولا یحفظہ عن صحابی ولا تابعی تجویز تعددھا اھ وقد علمت قول البدائع انہ ظاھر الروایۃ وفی شرح المنیۃ عن جوامع الفقہ انہ اظھر الروایتین عن الامام قال فی النھر وفی الحاوی القدسی وعلیہ الفتویٰ وفی التکملۃ للرازی وبہ ناخذ اھ فھو حینئذ قول معتمد فی المذھب لا قول ضعیف ولذا قال فی شرح المنیۃ ھو الاحتیاط لان الخلاف فی جواز التعدد وعدمہ قوی وکون الصحیح لجواز الضرورۃ للفتویٰ لا یمنع شرعیۃ الاحتیاط للتقویٰ اھ ص ۸۴۴ ج ۱ قلت و قد علمت من السوال ان لا ضرورۃ الی تعدد الجمعۃ فی الصورۃ الحاضرۃ

وانما ھو بمحض العناد والحسد وذکر قاضی خان وصاحب منیۃ المفتی وغیرھما ان الاقدم افضل وان استویا فی القدم فالاقرب افضل اھ (ص ۲۰۶ جلد ۱ فتاوی مولانا عبد الحی)۔ ۲۱ر جمادی الاولیٰ سنہ

وہ کارخانہ جو شہر سے متصل ہو اس میں نماز جمعہ کا حکم،

سوال (۱۳) جس دفتر میں خادم کام کرتا ہے وہ شہر سے قریبًا تین میل کے فاصلہ پر ہے، اور اس علاقہ کو مغلپورہ کہتے ہیں اس کا ڈاکخانہ وتھانہ اور پولیس بھی شہر سے علٰحدہ ہے، اور چُنگی کی حد سے بھی باہر ہے، اور نہ ہی یہ گاؤں کی صورت میں ہے، بلکہ یہ ایک بڑا دفتر ہے اور اس کے ساتھ ہی جو کارخانے بنے ہوئے ہیں، جہاں دن کو بائیس تیئیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں، اور رات کو سوائے اُن چوکیداروں کے جو پہرہ پر مقرر ہیں، اور کوئی نہیں ہوتا، دفتر کے اِدھر اُدھر جگہ بجگہ انگریزوں کی کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں جو اس دفتر اور کارخانوں میں ملازم ہیں، کوٹھیاں بھی ایک جگہ نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی (دس پانچ) کئی جگہ بنی ہوئی ہیں، گویا کہ دفتر نہ شہر کے حکم میں ہے، اور نہ گاؤں کے یہاں کے ملازمین جمعہ کے دن کسی ایک کو مقرر کرکے دفتر میں ہی جمعہ پڑھ لیتے ہیں، آیا یہ جمعہ ہو جاتا ہے، یا نہیں، اگر نہیں تو خادم کو قریبًا عرصہ تین سال کا ہو گیا ہے کہ انہی میں شامل ہو کر جمعہ پڑھ لیتا ہے اتنے عرصہ کی ظہر کی نمازیں قضاء پڑھ لے یا نہیں، اور چونکہ خادم گاؤں سے آتا ہے اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خادم پر جمعہ واجب نہیں ہے کہ دفتر کو ہر حال میں چھوڑ کر شہر میں جا کر جمعہ پڑھے،

الجواب:۔ قال فی الدر اوفناءہ بکسر الفاء وھو ماحولہ اتصل بہ اولا حررہ ابن الکمال وغیرہ لاجل مصالحہ کدفن الموتیٰ ورکض الخیل والمختار للفتویٰ تقدیرہ بفرسخ اھ قال الشامی اقول وبہ ظھر صحتہا فی تکیۃ السلطان سلیم بمسرجۃ دمشق وکذا فی مسجدہ بصالحیۃ دمشق فانہا من فناء دمشق بما فیہا من التربۃ بسفح الجبل وان انفصلت عنہ بمزارع لکنہا قریبۃ لانہا علیٰ ثلث فرسخ من البلدۃ وان اعتبرت قریۃ مستقلۃ فہی مصر علیٰ تعریف المصنف اھ، ص ۳۷ ج ۱،

قواعد سے مغلپورہ لاہور کا فناء معلوم ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ مغلپورہ میں رہتے ہیں اُن پر جمعہ فرض ہے، لہٰذا آپ نے جس قدر جمعے وہاں پڑھے ہیں وہ صحیح ہیں، آئندہ بھی

پڑھتے رہنا چاہئے، لیکن مزید احتیاط کے لئے جمعہ کے بعد چار سنتوں میں سنتوں کی نیت کے بجائے چار رکعت فرض ظہر کی نیت کرلی جائے، تاکہ فرض بالیقین ذمہ سے ادا ہوجائے، مگر جہلاء کو اس کی تعلیم نہ کی جائے وہ اس میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، واللہ اعلم،

جزو سوال؛ اور حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کا فتویٰ متعلق ظہر احتیاطی دیکھ کر ایک اور بھی شبہ پڑ گیا ہے کہ اس صورت میں لاہور میں کہیں بھی جمعہ صحیح نہیں ہوتا ہوگا کیونکہ یہاں گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علیحدہ جمعہ پڑھا جاتا ہے، اور کئی ایک بڑی مسجدوں میں بھی علیحدہ پڑھا جاتا ہے، حالانکہ اگر بادشاہی مسجد میں تمام شہر کے لوگ آکر جمعہ پڑھیں تب بھی سما جاویں اور فتویٰ اس پر ہے کہ شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ پڑھا جاوے،

جواب؛ نہیں فتویٰ اس پر ہے کہ ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ جائز ہے، لہٰذا لاہور شہر کے سب جمعے صحیح ہیں،

جزو سوال (۲) کیا کتاب تنبیہ الغافلین کوئی معتبر کتاب ہے، اور اگر خادم اس کا مطالعہ کرے تو اجازت ہے؟

جواب؛ اس کتاب کا مصنف کون ہے، مصنف کا نام معلوم ہونے پر جواب دیا جاسکتا ہے،

سوال (۱۴) | نمازِ عید کے بعد دعاء مانگنے کا حکم

عیدین میں ہاتھ اٹھا کر مناجات کرنا کیسا ہے، ایک مقام پر مدت سے لوگ ایک امام کے پیچھے عیدین کی نماز پڑھتے آئے ہیں، اب عرصہ دو سال سے سابق امام نے بوجہ کبرسنی کے اپنے لڑکے کو جو کہ حافظ اور عالم ہیں اپنی جگہ پر امام مقرر کیا، اور لوگ اُن کے پیچھے عیدین کی نمازیں پڑھنے لگے، حال کے امام نے عید کی نماز کے بعد مناجات نہیں کی، عام لوگ امام سے معترض ہوئے اور کہا کہ آپ کے باپ ہمیشہ سے مناجات کرتے آئے ہیں آپ کیوں ترک کرتے ہیں، امام صاحب نے جواب دیا کہ ہمارے باپ نے حدیث نہیں پڑھی ہے، اس لئے وہ اس مسئلے سے ناواقف ہیں، میں نے حدیث میں اس کی دلیل کہیں نہیں پائی، اس لئے میں ترک کرتا ہوں، اس پر جو عوام نے اصرار کیا کہ مناجات کرنا تو اچھا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں عاجزی پسند ہے، علاوہ اس کے ہمیشہ سے ہم لوگ کرتے آئے ہیں، یکایک ہم لوگوں کے لئے یہ ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے، اس لئے بہت سے لوگ ہماری عیدگاہ میں آنا چھوڑ دیئے

اور جماعت کو نقصان پہونچے گا، امام صاحب نے فرمایا کہ میں خود یہاں کی امامت چھوڑ دوں گا مگر مناجات کر کے گنہگار نہ ہوں گا، اور اس کے بعد امام صاحب اور چند لوگوں نے مشورہ کر کے تمام بازار میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو شخص مناجات کرے گنہگار ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنی درست نہیں، اس بات سے عوام میں ایک نہایت بے قراری پھیل گئی ہے، اور دو جماعت ہوگئی ہیں، اور ان لوگوں کا ارادہ ہے کہ عید کے موقع پر ایک بڑا ہنگامہ برپا کریں گے چونکہ لوگ ہمیشہ سے مناجات کرتے آئے ہیں، اس لئے تین حصہ سے زائد لوگوں نے مناجات کرنے والوں کی طرف ہیں، اور ایک حصہ سے کم لوگ نہ کرنے والوں کی طرف ہیں، اس لئے عند اللہ و عند الرسول آپ اس کا فیصلہ بحوالۂ کتب کر دیجئے، بینوا بالدلیل توجروا بالجزیل،

الجواب، طریقۂ متعارفہ کے طور پر نماز عیدین کے بعد دعا مانگنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً واضحاً ثابت نہیں، ہوا، یہی وجہ ہے کہ بعض نسخ بخاری میں جو باب الدعاء فی العیدین وارد ہوا ہے، تو شارحین کو اس کے اثبات کے لئے تکلف و تجشم کرنا پڑا، قال العلامۃ العینی فی العمدۃ مطابقۃ للترجمۃ المرویۃ عن الحموی فی قولہ یخطب فان الخطبۃ مشتملۃ علی الدعاء کما انہا تشتمل علی غیرہ اھ ص ۳۶ وقال الحافظ فی الفتح ویحتمل ان یوجہ بان الدعاء بعد صلوٰۃ العید یؤخذ حکمہ من جواز اللعب بعدھا بطریق الاولیٰ وقد روی ابن عدی من حدیث واثلۃ انہ لقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم عید فقال تقبل اللہ منا ومنک فقال نعم تقبل اللہ منا ومنک وفی اسنادہ محمد بن ابراھیم الشامی وھو ضعیف وقد تفرد بہ مرفوعاً وخولف فیہ فروی البیہقی من حدیث عبادۃ بن الصامت انہ سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلک فقال ذلک فعل اھل الکتابین واسنادہ ضعیف ایضاً وکانہ اراد لم یصح فیہ شیء وروینا فی المحاملیات باسناد حسن عن جبیر بن نضیر قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا التقوا یوم العید یقول بعضھم لبعض تقبل اللہ منا ومنک اھ ص ۱۲۷ ج ۲،

پس حافظ کا حدیث تقبل اللہ منا ومنک سے اثبات ترجمہ کی طرف اشارہ کرنا بتلا رہا ہے کہ دعاء فی العیدین کے متعلق کوئی حدیث صریح نہیں ہے، اسی لئے بعض لوگوں نے

ان نمازوں کے بعد دعا بطریق متعارف کو سنت نہیں سمجھا،

لیکن کسی خاص قضیہ کا حکم ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ احادیث میں اس کا نام بھی بالتعیین وارد ہوا ہو بلکہ عموماتِ حدیث سے بھی احکام بکثرت ثابت کئے جاتے ہیں، اگر عمومات سے حکم ثابت نہ ہوسکے تو پھر دنیا کی بہت سی چیزوں کا جواز و استحباب ثابت نہ ہوسکے گا، مثلاً مدارس کا قائم کرنا تعلیم دین کے لئے مستحب ہے، حدیث میں اس کا نام کہاں وارد ہوا ہے، ریل میں سفر کرنا جائز ہے، حدیث میں اس کا نام کہاں وارد ہوا ہے، علیٰ ہذا، پس بعد عیدین کے ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا گو صراحۃً احادیث میں نظر سے نہیں گذرا مگر بعض احادیث سے ہر نماز کے بعد دعاء کا مستحب ہونا ثابت ہے، نیز احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ اٹھا کر دُعاء کیا کرتے تھے، عن علیؓ قال حدثنی ابوبکرؓ وصدق ابوبکرؓ انہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من عبد یذنب ذنبا فیحسن الطھور ثم یقول فیصلی رکعتین ثم یستغفر اللہ الاغفر اللہ لہ ثم قرأ ھذہ الآیۃ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ الخ رواہ ابوداؤد وسکت عنہ (ص ۲۲۰ ج ۱) ولذا قال صاحب الحصن الحصین من اٰداب الدعاء استقبال القبلۃ والصلوٰۃ والجثو علی الرکب وبسط الیدین ورفعھما (ص ۲۲ و ۲۳) وحدیث رفع الیدین فی الدعاء متواتر کذا فی تدریب الراوی (ص ۱۹۱)

پس عیدین کی نماز کے بعد مناجات و دعاء کرنا عموماتِ حدیث سے مستحب ہے، بلکہ ہر نماز کے بعد دعاء کرنا مستحب ہے، واللہ اعلم، ۱۲ ر رمضان ۱۳۴۱ھ

بعد تحریر جواب ہذا خاص مناجات بعد صلوٰۃ العید کے بارے میں روایات دستیاب ہوگئیں، وہی ہذہ عن اُم عطیۃ قالت کنا نؤمر ان نخرج یوم العید حتی تخرج البکر من خدرھا حتی تخرج الحیض فیکن خلف الناس فیکبرن بتکبیرھم ویدعون بدعائھم یرجون برکۃ ذلک الیوم وطھرتہ اھ اخرجہ البخاری فی صحیحہ کذا فی فتح الباری، ص ۳۸۶ ج ۲ واخرج الترمذی عن اُم عطیۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج الابکار والعواتق وذوات الخدور والحیض فی العیدین فاما الحیض فیعتزلن المصلی ویشھدن دعوۃ المسلمین الحدیث، ص ۶۹)

قال الترمذی حدیث ام عطیۃ حدیث حسن صحیح، اس حدیث میں دعاء سے دعاء خطبہ مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ خطبہ میں صرف امام دعاء کرتا ہے، سامعین دعاء نہیں کرسکتے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حائض عورتیں عیدین میں مَردوں کے پیچھے کھڑی رہتیں، اور مَردوں کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہتیں، اور انکی دعاء کے ساتھ دعاء کرتیں، اور اس سے مَردوں اور عورتوں سب کا دُعاء کرنا ثابت ہوتا ہے، اور یقیناً نماز سے پہلے تکبیر و دعاء کا وقت نہیں، یقیناً نماز کے بعد ہی دعاء کی جاتی تھی، اور ترمذی میں اسی حدیث کے اندر یہ الفاظ ہیں ویشھدن دعوۃ المسلمین کہ عورتیں مسلمانوں کی دُعاء میں شریک ہوتی تھیں، اس لئے عیدین کی نماز کے بعد دعاء کرنا جائز و مستحب یقیناً ہے، استحباب و جواز کا انکار نہیں ہوسکتا، لیکن اگر کوئی شخص جائز و مستحب فعل کو ترک کردے، تو اس پر ملامت وطعن اور اس سے ترکِ موالات ہرگز جائز نہیں کیونکہ یہ شان ترک فرائض و واجبات کی ہے نہ کہ مستحبات کی، اور اگر کسی وقت کسی مستحب و سنت کے ترک پر ملامت وطعن ہونے لگے، اور اس مستحب و سنت کے ساتھ واجب و فرض کا معاملہ ہونے لگے تو اس وقت اصلاح عقیدۂ عوام کے لئے اس مستحب کا ترک کردینا ضروری ہوجاتا ہے، تو جو لوگ بعد صلوٰۃ عیدین کے دعاء کو مستحب سمجھتے ہیں وہ تارکین پر ملامت وطعن کرنے کی وجہ سے خود ہی اس مستحب کو ممنوع بنانا چاہتے ہیں، قال فی البحر لو قرأ فی الاُولی بسورۃ الجمعۃ وفی الثانیۃ بسورۃ المنافقین فحسن تبرکا بفعلہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن لایواظب علیٰ ذلک بل یقرأ غیرھا فی بعض الاوقات لا یؤدی الی ھجر الباقی ولا یظنہ العامۃ حتما اھ (ص ۱۵۷ ج ۲) واللہ اعلم

ایک عیدگاہ میں عید کی دوجماعت کرنا،	**سوال** (۱۵) .... ایک عیدگاہ کے اندر دو نمازیں عید کی یکے بعد دیگرے شرعاً

جائز ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا؟

الجواب: قال فی الخلاصۃ والسنۃ ان یخرج الامام الی الجبانۃ ویستخلف غیرہ لیصلی فی المصر بالضعفاء والمرضیٰ، بناء علیٰ ان صلوٰۃ العید فی موضعین جائزۃ بالاتفاق فی وان لم یستخلف لہ ذلک اھ ص ۱۲۱۳ج ۱، وفی الدر ولا یصلیھا وحدہ ان فاتت مع الامام ولو امکنہ الذھاب الی امام آخر فعل لانھا تؤدی بمصر واحد بمواضع کثیرۃ اتفاقا اھ ص ۸۰۵ ج ۱ (مع الشامیۃ) قلت قولہ ولو امکنہ

الذهاب الی امام آخر یشیر الی انه لا یصلی فی موضع واحد مرتین وکذا اقتصار الفقهاء علی بیان الجواز فی مواضع عدیدة وسکوتهم عن ادائها فی موضع واحد مرتین یدل علی ذلك فافهم،

ان عباراتِ فقہیہ سے یہ معلوم ہوا کہ نمازِ عید ایک موضع میں مکرر پڑھنا درست نہیں ہاں چند مواضع میں جائز ہے، جیسا کہ جمعہ چند مسجدوں میں جائز ہے، ایک موضع میں دو مرتبہ نمازِ عید ادا کرنے کی شریعت میں کوئی اصل ہماری نظر سے نہیں گذری، لہٰذا اس ابتداع سے بچنا چاہیے، خصوصاً جبکہ اس کا منشا محض نزع وخلاف وتفریق ہو، واللہ اعلم، ۸ شوال

نمازِ عید ایسی جگہ ادا کرنا جہاں سامنے قبرستان ہو،

سوال (۱۶) ہمارے دیار میں ایک عیدگاہ ہے، اس کے مغرب میں ایک قبرستان ہے، جہاں امام کھڑا ہوتا ہے اس کے دو تین ہاتھ کے فاصلہ پر، بیچ میں کوئی آڑ نہیں، اور درمیان میں ایک مزار بھی ہے، اس کے گرداگرد آدمی نماز پڑھتے ہیں، اس میں نمازِ عیدین جائز ہوگا یا نہ؟ اگر بیچ میں کوئی آڑ نہ ہو تو قبر سے کتنے فاصلہ پر نماز جائز ہے، اور اگر آڑ ہو تو ایسا ہونا چاہیے کہ قبر بالکل نہ دکھائی دے یا کیسا، بعض آدمی مسجد کے مغرب جانب تبرکاً قبر بناتے ہیں وہ کیسا ہے؟

الجواب: قال فی مراقی الفلاح وتکره الصلوٰة فی المقبرة اه قال الطحطاوی (فی زاد الفقیر) وتکره الصلوٰة فی المقبرة الا ان یکون فیها موضع اعد للصلوٰة لا نجاسة فیه ولا قذر فیه اه قال الحلبی لان الکراهة معللة بالتشبیه وهو منتف حینئذ وفی القهستانی عن جنائز المضمرات لا تکره الصلوٰة الی جهة القبر الا اذا کان بین یدیه بحیث لو صلی صلوٰة الخاشعین وقع بصره علیه اه ص ۲۰۵ مراقی الفلاح

صورتِ مسئولہ میں اگر قبر نمازیوں کے اتنے نزدیک نہیں ہوتی کہ خشوع کے ساتھ موضع سجدہ پر نظر رکھنے سے قبر پر نظر پڑتی ہو تو نماز جائز ہے، اور اس سے زیادہ نزدیک ہو تو مکروہ ہے، اور جس مزار کے گرداگرد لوگ نماز پڑھتے ہیں، اگر قبر کے گرد اتنی اونچی عمارت ہو جس سے قبر پوشیدہ ہوگئی ہو نظر نہ آتی ہو، تو نماز درست ہے ورنہ مکروہ ہے، اور ہر حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ عیدگاہ کی مغربی جانب میں ایک دیوار بنادیں، جس سے قبروں اور نمازیوں میں آڑ ہو جائے، مسجد کی مغربی جانب کو تبرک سمجھنا اور وہاں قبریں بنانا بے اصل بات ہے، اس سے احتراز چاہیے، واللہ اعلم، ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ

امام کا لوگوں کے بیچ میں کھڑے ہوکر خطبہ دینے کا حکم

سوال (۱۷)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی عیدگاہ میں چونکہ امام کی آواز سارے مقتدیوں کو نہیں پہونچ سکتی، اس لئے بعض جگہ آٹھ آٹھ دس دس صفوں کے بعد تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بآواز بلند تکبیر کہنے کے واسطے پختہ یا لکڑی کے اونچے اونچے مکبرے بنا دیئے جاتے ہیں، پس اگر امام اپنی امامت کے پاس والی جگہ یعنی ممبر کو چھوڑ کر حاضرین کی زیادہ تعداد کو خطبہ سنائی دینے کے خیال سے عیدین کا خطبہ وسط حاضرین میں کسی درمیانی اونچے مکبرہ پر کھڑے ہوکر پڑھے تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہوگا یا ناجائز، اور اگر جائز ہوگا تو بکراہت یا بے کراہت؟

الجواب: امام کا وسط قوم میں کھڑے ہوکر خطبہ پڑھنا مکروہ ہے، لیکن اگر ایسا کیا تو خطبہ صحیح ہو جائے گا، گو خلاف سنت ہونے کی وجہ سے کراہت ہوگی، قال فی مراقی الفلاح ویسن استقبال القوم بوجھہ کما استقبل الصحابۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اھ قال الطحطاوی فان ولاھم ظھرہ کرہ قال شمس الائمہ من کان امام الامام استقبل بوجھہ ومن کان عن یمین الامام او یسارہ انحرف الیہ اھ (ص ۲۹۹) قلت ولا یخفی ان فی قیامہ علی المکبرۃ یلزم تولیۃ الظھر الی بعض السامعین فیکرہ، ۲؍ ذی الحجہ سنہ ۴۳ھ

عید الفطر میں تکبیر تشریق جہراً کہنے کا حکم

سوال (۱۸) بعض عیدگاہوں میں دستور یہ ہے کہ بروز عید الفطر پہلے ایک شخص بآواز بلند تکبیر کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے، اس کے سب حاضرین متفقہ طور پر بآواز بلند تکبیر کہتے ہیں، ان سب کے خاموش ہو جانے کے بعد پھر وہی پہلا شخص تنہا بآواز بلند مثل سابق تکبیر کہتا ہے، اور اس کے خاموش ہونے پر جملہ حاضرین مثل سابق آواز ملا کر تکبیر کہتے ہیں، یہ سلسلہ اسی طرح نماز عید شروع ہونے تک جاری رہتا ہے پس ارشاد ہو کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک عید الفطر میں بآواز بلند تکبیر کہنا اور اس کے ساتھ ہی ہیئت متعارفہ مذکورہ کو اختیار کرنا کیسا ہے، آیا مباح ہے یا مستحب یا سنت یا واجب یا مکروہ یا حرام، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ امام اعظمؒ کے علاوہ ائمہ مجتہدینؒ میں سے کسی کے نزدیک اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟ تکبیر یہ ہے، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ،

الجواب؛ قال فی مراقی الفلاح ثم یتوجه الی المصلی ماشیا مکبرا سرا قال علیه السلام خیر الذکر الخفی وعندهما جهرا وهو روایة عن الامام وکان ابن عمرؓ یرفع صوته بالتکبیر ویقطعه ای التکبیر اذا انتهی الی المصلی فی روایة جزم بها فی الدرایة وفی روایة اذا افتتح الصلوٰة کذا فی الکافی وعلیه عمل الناس قال ابوجعفر وبه اخذ اھ قال الطحطاوی فی حاشیته قال الطحاوی ذکر ابن ابی عمران عن اصحابنا جمیعا ان السنة عندهم یوم الفطر ان یکبر فی طریق المصلی وهو الصحیح اھ (۳۰۸) وفی ردالمحتار وجزم فی البدائع بالاولی وعمل الناس فی المساجد علی الروایة الثانیة اھ (ص ۷۸۵ ج ۱) قال الطحطاوی فی حاشیة مراقی الفلاح قوله وعندهما جهرا قال الحلبی الذی ینبغی ان یکون الخلاف فی استحباب الجهر وعدمه لا فی کراهته وعدمها فعندهما یستحب الجهر وعنده الاخفاء افضل و ذلك لان الجهر قد نقل عن کثیر من السلف اھ قوله وکان ابن عمر یرفع صوته بالتکبیر اجیب عنه من طرف الامام بانه قول صحابی فلا یعارض به عموم الآیة القطعیة اعنی قوله واذکر ربك فی نفسك الی قوله ودون الجهر اھ (ص ۳۰۹) اصل مذہب امام ابوحنیفہؒ کا یہ ہے کہ عید الفطر میں تکبیر آہستہ کہی جائے اور عیدگاہ میں پہونچکر ختم کر دی جائے، ظاہر روایت راجح یہی ہے، اب اگر کوئی شخص تکبیر جہر سے کہے اور عیدگاہ پہونچکر شروع صلوٰۃ تک اس کو مستمر رکھے تو بعض روایات پر اس کی گنجائش تو ہے، مگر آواز ملا کر تکبیر کہنا جس سے عادۃً غیر معمولی شور پیدا ہو جاتا ہے خلاف سنت ہے اور بدعت ہے، اور قابلِ ترک ہے، قال صلی اللہ علیہ وسلم اربعوا علی انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائبا، اگر جہر ہی کرنا ہو اور نماز تک تکبیر کو مستمر رکھنا ہو تو ہر شخص کیف ما اتفق الگ الگ تکبیر کہتا رہے، اور اتنا جہر کرے کہ دو تین آدمی آس پاس والے سُن لیں، نہ زیادہ جہر کرے نہ آواز ملانے کا اہتمام کرے، واللہ اعلم، ۲ر ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

نماز عیدین کے بعد دعاء مانگنے کا حکم

سوال (۱۹) صلوٰۃ عیدین اور ان کے خطبہ کے بعد دعاء مانگنا بہتر ہے یا نہ مانگنا، سلف کا کیا معمول ہے؟

الجواب؛ احادیث سے دعاء کا ثبوت ہوتا ہے، مگر ضروری نہیں، بہتر یہ ہے کہ

دعاء کرلیا کریں، اجتماع مسلمین کے وقت دعاء قبول ہوتی ہے، ۴ر ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ

نماز جمعہ اور تعدد جمعہ کی تحقیق

سوال (۲۰) .... ایک چھوٹے گاؤں میں تقریباً ۵۰ گھر ہیں، اور اس گاؤں میں چار مسجدیں ہیں اور چاروں مسجدوں میں جمعہ ہوتا ہے جس کو عرصہ پانچ چھ سال کے قریب ہوگیا ہے، اور اس سے پیشتر دو جمعہ ہوتے تھے، اب یہ جو کہ دو جمعہ ہوتے ہیں، یہ جائز ہیں یا کہ نہیں، اور اس گاؤں میں احتیاط ظہر پڑھنا چاہیے یا کہ نہیں؟

الجواب: جس جگہ شرعی قاعدہ سے جمعہ جائز ہے وہاں دو چار جگہ بلکہ دس پانچ جگہ بھی جائز ہے، اب یہ دیکھ لیا جائے کہ اس گاؤں میں صحت جمعہ کے شرائط موجود ہیں یا نہیں جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی محقق عالم کو یہ گاؤں دکھلا کر پھر مسئلہ دریافت کیا جاوے اور جب تک صحت جمعہ کا یقین نہ ہوجائے اس وقت تک وہاں جمعہ نہ پڑھا جائے، صرف ظہر پڑھنی چاہیے، ۱۹ر رمضان ۱۳۴۲ھ

گاؤں میں جمعہ کا حکم

سوال (۲۱) ایک چھوٹا سا گاؤں تقریباً ۱۰۰ یا ۲۰۰ گھروں کی آبادی ہے اور اس گاؤں کی جو مسجد ہے اس کے اندر جمعہ کے روز اس قدر آدمی آتے ہیں کہ تمام مسجد بھر کر اور آدمی باہر باقی رہ جاتے ہیں، آیا اس گاؤں میں جمعہ ہوتا ہے یا کہ نہیں اور اگر جمعہ ہوجاتا ہے تو پھر احتیاط الظہر ان کو پڑھنا چاہیے یا نہیں، اور اسی طرح ایک گاؤں کل ۱۵ گھروں کی آبادی ہے، اس میں بھی جمعہ ہوگا یا نہیں، بینوا توجروا۔

الجواب: دوسرے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں معلوم ہوتا، صرف ظہر پڑھنی چاہیے، اور پوری تحقیق کسی محقق عالم کو گاؤں دکھلانے سے ہوسکتی ہے، ۱۹ر رمضان ۱۳۴۲ھ

اس جزیرہ میں جمعہ کا حکم جو متعدد مواضع پر مشتمل ہو

سوال (۲۲) اس احقر کا وطن ایک جزیرہ میں ہے، جس کا نام ہاتیہ ہے، اور اس کے چاروں طرف دریا ہے، موسم سرما میں وہ جزیرہ خشک رہتا ہے، اور برسات میں دریا اور بارش کے پانی سے اکثر جزیرہ غرقاب ہوجاتا ہے، اس میں ایک سرکاری راستہ ہے، جو جانب شمال میں لب دریا سے جنوب کی طرف قریب بیس میل تک گیا ہے، جو برسات میں اکثر وہ راستہ کیچڑ اور پانی سے بھرا رہتا ہے، لوگوں کی آمد و رفت برسات اسی راستہ پر سے ہوتی ہے، اس میں لوگوں کے مکانات علیحدہ علیحدہ ہیں، بعض جگہ دو تین مکانات ایک دوسرے سے متصل ہیں اور

متصل بھی اس طرح پر کہ ایک مکان سے دوسرے مکان تک باغیچہ کا فاصلہ ہوتا ہے، ہندوستان کے قصبہ اور گاؤں کے گھر جو ایک دوسرے سے متصل ہیں ایسا نہیں ہے، ہاں ایک جگہ کے دو تین گھر البتہ ایک دوسرے کے متصل ہیں، اور بعض جگہ ایک مکان سے دوسرے مکان تک ایک کانی دو تین چار دس پندرہ کانی تک کا فاصلہ ہوتا ہے، اور یہ بھی واضح رہے کہ اس جزیرہ کی آبادی طولاً قریب پچیس میل اور عرضاً قریب پندرہ میل کے ہوگی، اور بعض نہریں اس طرح پر ہیں کہ دریا کے ایک طرف سے نکال کر دوسری طرف پہنچایا ہے، اور ان نہروں کے ایک طرف سے دوسری طرف پار ہونے کے لئے پُل موجود ہیں، اور یہ بھی واضح ہو کہ اس جزیرہ میں مختلف مواضع ہیں، ان مواضع میں متعدد مسجدیں ہیں، مجموعہ مسجدیں اس جزیرہ کے قریب تین سو کے ہوں گی، اس میں لوگ جمعہ پڑھتے ہیں اور بعض مسجد میں مصلی تیس، بعض میں پچاس اور بعض میں ایک سو .... ہوتے ہیں، اور بعض مسجد میں جانے کے لئے برسات میں کپڑے بھیگنے کی نوبت پہنچتی ہے، اور ایک مسجد کا فاصلہ دوسری مسجد سے اس قدر ہے کہ اگر ایک مسجد میں اذان دی جاتی ہے تو دوسری مسجد تک بخوبی سُنی جاتی ہے، اور یہ بھی واضح ہو کہ ان مسجدوں میں فقط جمعہ کے دن گرام کے لوگ جمع ہوتے ہیں، اور پنجگانہ نماز کی جماعت بعض مسجد میں ہوتی ہی نہیں، اور بعض مسجد میں ہوتی بھی ہے، تو جس جس دروازے پر مسجد ہے اس مکان کے چار پانچ آدمی حاضر ہوتے ہیں اور بس،

اور یہ بھی معلوم رہے کہ اس جزیرہ میں ہندو مسلمان، عورت مرد لڑکا قریب ایک لاکھ کے رہتے ہیں، اس میں ایک آفس ہے، جس میں دیوانِ عدالت اور فوجداری موجود ہے، اور گرام اس آفس سے بہت دُور دُور ہیں، اب دریافت طلب حضور معدن النور سے یہ ہے کہ آیا اس جزیرہ میں حنفی مذہب کے موافق جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں، جو لوگ اس میں جمعہ پڑھتے ہیں احتیاط ظہر اُن پر پڑھنا لازم ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اس میں جمعہ نہ پڑھے تو موافق مذہب حنفی کے عند اللہ اس کا مواخذہ ہوگا یا نہیں، اور اس جگہ میں جو شخص جمعہ نہیں پڑھتا ہے اس کو سب وشتم کرنا اور اس پر لعن طعن کرنا اور مواکلت ومجالست اس سے نہ کرنا اور اس کو جہنمی وغیرہ کہنا شرعاً کیسا ہے، احقر مدت سے اس مسئلہ میں متردد ہے حضور از روئے مہربانی جو کچھ رائے عالی اس باب میں ہو تحریر فرما کر کمترین کو سرفراز فرمائیں اور عند اللہ ماجور رہوں،

تنقیح : ہر ہر موضع کے جدا جدا حالات نہیں لکھے کہ آبادی کتنی ہے اور بازار مستقل ہے یا نہیں ؟

جواب تنقیح ، واضح رہے کہ بعض موضع کی آبادی قریب ایک میل اور بعض قریب نصف میل کے ہوتی ہے ، اور یہ مواضع ایک دوسرے سے متصل ہوتے ہیں ، حدِ فاصل بعض جگہ راستے ہوتے ہیں اور بعض جگہ چھوٹی چھوٹی نہریں ہوتی ہیں ، اور موسم سرما میں وہ نہریں خشک رہتی ہیں ، اور برسات میں پانی رہتا ہے ، ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لئے پُل ہوتے ہیں ، اور چھوٹی کشتیوں کی آمد و رفت بھی ہوتی ہے ، اور بعض موضع میں مکانات تیس چالیس پچاس سو تک یا اس سے کچھ کم و بیش ہوتے ہیں ، اور مکانات اُن مواضع کے فرادیٰ فرادیٰ ہوتے ہیں ، اور ان مواضع میں بعض جگہ ایک بازار ہوتا ہے ، ہفتہ میں اُن مواضع کے لوگ جمع ہوجاتے ہیں ، تین چار بجے سے لوگوں کی آمد شروع ہوجاتی ہے ، اور رات کے آٹھ سات بجے تک رہتے ہیں ، اور ہر ہر موضع میں دو تین مسجدیں ہوتی ہیں ، کہ لوگ اس میں جمعہ پڑھتے ہیں ، ایسی جگہوں میں جمعہ پڑھنا موافق مذہب حنفی کے کیسا ہے ، اور نہ پڑھنے والے کے لئے کیا حکم ہوسکتا ہے ، اس احقر کو فقط رائے عالی معلوم کرنا مقصود ہے ، کسی سے لڑنا جھگڑنا ہرگز مقصود نہیں ، جو کچھ رائے عالی ہو تحریر فرما کر اپنے خاص دستخط سے سرفراز فرمائیں ، اور یہ بھی واضح رہے کہ دو مکانوں کے درمیان جو زمین ہوتی ہے اس میں زراعت کرتے ہیں ،

الجواب : سارے جزیرے کو تو ایک شہر نہیں کہا جاسکتا ، بلکہ یہ ایک پرگنہ ہے ، جو متعدد مواضع پر مشتمل ہے ، پس ان مواضع میں سے جس موضع کی شان یہ ہو کہ اس میں تین چار ہزار یا اس سے زیادہ کی آبادی ہو اور بازار بھی روزانہ لگتا ہو جس میں ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہوں جیسا کپڑا ، جوتا ، غلّہ ، گوشت ، ترکاری ، دوا ، دودھ وغیرہ اس میں تو جمعہ جائز ہے اور جس کی آبادی تو اس مقدار کو پہنچتی ہو مگر ضروریات سب وہاں نہ ملتی ہوں نہ بازار روزانہ لگتا ہو وہاں جمعہ جائز نہیں ، اور جس جگہ جوازِ جمعہ میں تردد ہو وہاں جمعہ نہ پڑھیں صرف ظہر پڑھیں ، واللہ اعلم ، ۴ ؍ ذی الحجہ ۴۲ھ

سوال (۲۳) جمعہ کے دن بعد اذان کے باہر بیٹھے رہنا اور جب خطبہ شروع ہوجاوے ،	اس شخص کے ثواب کے بارے میں جو اذان کے بعد مسجد سے باہر رہے اور بوقت خطبہ مسجد میں آئے ،

تب آنا کیسا ہے، اور کتنے ثواب کا مستحق ہوگا؟

الجواب: باہر بیٹھنے سے کیا مراد ہے، آیا مسجد کی فناء سے بھی باہر یا مسجد کی حد سے باہر اور فناء مسجد کے اندر، جزئیہ صریح تو نہیں ملا، البتہ فقہاء نے فناء مسجد کو بحکم مسجد فرمایا ہے، اس کا مقتضا یہ ہے کہ جو شخص فناء مسجد میں بہ نیت صلوٰۃ جمعہ سویرے داخل ہو جائے گا وہ بھی سویرے آنے والوں میں شمار ہوگا، گو مسجد کی حد میں دیر سے آئے، اور فناء مسجد وہ احاطہ ہے جو مسجد کے متعلق ہے اور داخل باب مسجد ہے، جیسے حوض وحجرات وغیرہ، قلت و فی الحدیث الصحیح تقعد الملائکۃ علی ابواب المسجد فیکتبون الاول فالاول الحدیث وھذا یفید ان من دخل من باب المسجد فی السابقین یکتب فی السابقین وان لم یدخل فی المسجد بل بقی جالسا فی الاحاطۃ المتعلقۃ بہ واللہ تعالیٰ اعلم، اور اگر مسجد کے احاطہ سے بھی باہر رہا یعنی دروازۂ مسجد میں بھی داخل نہیں ہوا وہ دیر سے آنے والوں میں شمار ہوگا، پس جو شخص عین خطبہ کے وقت آئے گا اس کو حدیث کے موافق تصدق بیضہ کا ثواب ملے گا، اور جو خطبہ شروع ہونے کے بعد آئے گا وہ جمعہ میں سویرے آنے والوں کے اندر لکھا ہی نہیں جائے گا، لما فی الحدیث فاذا خرج الامام طووا الصحف وجاء وا یستمعون الذکر واللہ اعلم، ۳۰ محرم ۴۵ھ

سرکاری قلعہ میں نماز جمعہ کا حکم

سوال (۲۴) جمعہ کی بابت جو لکھا ہے قلعہ کی تفصیل یہ ہے قلعہ کے اندر کوئی غیر آدمی کسی وجہ سے بھی نہیں آسکتا، نہ جمعہ کے واسطے آسکے نہ اور کسی کام کے واسطے، اگر کسی کو کوئی ضرورت ہوتی ہے تو اجازت سے کمان افسر صاحب کی آسکتا ہے، اور ہمارے پیش امام صاحب نے تو نماز عید بھی اسی جگہ پڑھائی تھی حضرت اس مسئلہ کو صاف صاف لکھیں، اگر نماز کے واسطے ممانعت ہو تو کیا حکم ہے، اگر بالکل اجازت نہ ہو تو کیا حکم ہے، اکثر کھلی ہوئی چھاؤنی میں بھی آنے کی ممانعت ہوتی ہے چاروں طرف سنتری لگ جاتے ہیں، وہاں کی بابت بھی تحریر کر دیں تو عین مہربانی کا باعث ہوگا، کیونکہ ایسا موقع ہمارے ساتھ اکثر گذرتا ہے تو فرض نماز نہ رہ جاوے، اور اب ٹریننگ (تعلیم فوج) بھی شروع ہے، جنگل میں جمعہ ہو سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ وہاں بھی غیر آدمیوں کے آنے جانے کی ممانعت ہوتی ہے،

الجواب: قال فی الدر والاذن العام من الامام وھو یحصل بفتح

ابواب الجامع للواردین کافی فلا یضر غلق باب القلعۃ لعدو او لعادۃ قدیمۃ لان الاذن العام مقرر لاھلہ وغلقہ لمنع العدو لا المصلی نعم لو لم یغلق لکان احسن اھ (ص ۷۵۸ ج ۱ مع الشامی) اس سے معلوم ہوا کہ جس شہر میں جامع مسجد وغیرہ نماز جمعہ کے لئے موجود ہو اور ان میں نمازیوں میں رکاوٹ نہ ہو، وہاں اگر چھاؤنی یا قلعہ میں جمعہ ادا کیا جائے تو جائز ہے، گو چھاؤنی اور قلعے میں دوسرے لوگ نہ آسکتے ہوں، کیونکہ مقصود نماز سے روکنا نہیں ہے، بلکہ انتظام مقصود ہے، پس قلعہ اور چھاؤنی والے اس حالت میں جمعہ وعید کر سکتے ہیں بشرطیکہ چھاؤنی یا قلعہ شہر میں یا فناء شہر میں اس کے متصل ہو، باقی جنگل میں جمعہ جائز نہیں، جبکہ وہ جنگل فناء شہر میں داخل نہیں، اور فناء شہر وہ ہے جس سے شہر کا تعلق ہو، خواہ قبرستان ہو یا گھوڑ دوڑ کا میدان ہو یا عیدگاہ کا موقع ہو، وغیرہ واللہ اعلم، ۱۲ ر صفر ۱۳۴۵ھ

خطبۂ جمعہ میں غیر عربی میں مسائل کی تعلیم درست ہے

سوال (۲۵) درمیان خطبۂ جمعہ بزبان بنگلہ یا اردو وعظ و تعلیم امورِ دین درست است یا نہ؟

الجواب: درمیان خطبۂ عربیہ بزبانِ دیگر قدرے تعلیم مسائل رواست،

الدلیل: قال فی الدر ویکرہ تکلمہ فیھا ای فی الخطبۃ الا لامر بمعروف لانہ منھا اھ (ص ۸۴۸ ج ۱، مع الشامی) یکم ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

نثر یا نظم میں ترجمہ خطبہ سنانے کے بعد عربی میں خطبہ پڑھنا

سوال (۲۶) جمعہ کے پہلے خطبہ میں ترجمہ نثر ہو یا نظم، پہلے پڑھ کر بعدہٗ عربی میں خطبہ پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب: خطبہ میں عربی کے ساتھ اگر کسی وقت کسی خاص ضرورت سے نصیحت کے طور پر اردو میں بھی کچھ بیان کر دیا جائے تو جائز ہے، لیکن اردو یا فارسی یا عربی نظم پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ سلف سے خطبہ میں نظم کا پڑھنا منقول نہیں، پس یہ بدعت ہے، اسی طرح سارا خطبہ اردو میں ہونا یعنی عربی بالکل نہ ہو، یہ بھی بدعت ہے، واللہ اعلم ۱۲ ربیع ۲ ۱۳۴۵ھ

قال العلامۃ عبد الحی فی فتاوی لکن بجہت آنکہ مخالف سنت متوارثہ است (خطبہ بنظم خواندن) خالی از کراہت تنزیہی نیست وصاحب نصاب الاحتساب بحرمت او رفتہ (ص ۱۴۱ ج ۱ مع الخلاصۃ) وقال شیخنا فی امداد الفتاوی فقط خطبۂ عربی پر اکتفاء کرنا چاہئے، ترجمہ وغیرہ کرنا بہتر نہیں ہے، ہاں اگر کوئی نصیحت مناسب وقت

کسی واقعہ میں کر دی جائے تو جائز ہے، یکرہ للخطیب ان یتکلم فی حال الخطبۃ الا ان یکون امرا بمعروف کذا فی الفتح عالمگیری (ص ۱۴۵ ج ۱) ویروی رجوعہ فی اصل المسئلۃ الی قولہما وعلیہ الاعتماد والخطبۃ والتشہد علی ھذا الاختلاف ۱۲ ھدایۃ، قال الشیخ فلما ثبت الرجوع عنہ فی القراءۃ ثبت فی الخطبۃ بالفارسیۃ ایضا (ص ۱۰۳ ج ۱) فقط،

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصاء لینا خلاف سنت نہیں،

سوال (۲۷) عصاء گرفتن در خطبۂ جمعہ مستحب است، یا نہ، آنچہ در بحر الرائق وعالمگیری آوردہ کہ ہر شہر کہ فتح آں بغلبہ شدہ باشد دراں شہر سیف گرفتہ خطبہ گوید و ہر شہر کہ برضاء ورغبت اسلام آوردہ باشد بلا سیف خطبہ گوید، ایں فرق صحیح است یا نہ، بینوا وتوجروا؟

الجواب: اخذ عصاء در خطبہ خلاف سنت نیست، وآنچہ در کتب حنفیہ قول بکراہت وعدم سنیت مذکور است، مراد بآں کراہت اعتقاد سنت مقصودہ است، واما نفس ایں فعل بدون اعتقاد مذکور خلاف سنت نیست صرح بہ فی رد المحتار، وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص ۲۹۹ ج ۱) ودر بحر الرائق وعالمگیریہ فرقیکہ میان بلد مفتوح بالغلبہ وبغیر غلبہ نوشتہ اند صحیح است، واللہ اعلم، ۵ رج ۲ ۱۳۴۳ھ،

مسجد واحد میں تعدد جمعہ جائز نہیں،

سوال (۲۸) .... شہر ملتان کے اطراف میں ایک جگہ کے لوگوں میں کسی وجہ سے تفرقہ پیدا ہوا، ایک فریق کے لوگ بروز جمعہ مسجد کے امام کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرتے وقت دوسرے فریق کے لوگ اقتدار نہ کرکے الگ رہتے ہیں، فریق اول کے لوگ نماز جمعہ ہونے کے بعد فوراً دوسرے فریق کے لوگ دوسرا ایک امام کھڑا کرکے نماز جمعہ ادا کرتے ہیں، پس سوال یہ ہے کہ اس طور سے ایک مسجد میں دو مرتبہ نماز جمعہ ادا کرنا درست ہے یا نہیں، اور فریق اول کی نماز جمعہ صحیح ہے یا نہیں، اور فریق ثانی کی نماز جمعہ کا کیا حکم ہے، بینوا بالدلیل توجروا بالاجر الجزیل،

الجواب: تعدد جمعہ مسجد واحد میں جائز نہیں، اور اسی صورت میں جماعت اولیٰ کی نماز تو صحیح ہو جائے گی، دوسری جماعت کی صحیح نہ ہوگی، قال فی الدر وتؤدی فی مصر واحد بمواضع کثیرۃ مطلقا علی المذہب اھ قال الشامی فقد ذکر السرخسی ان الصحیح من مذہب ابی حنیفۃ جواز اقامتہا فی مصر واحد فی مسجدین واکثر

وبہ ناخذ اھ (ص ۸۴۳ ج ۱) قلت وقیود النفقہ احترازیۃ وقد قیدوا جوازھا بمواضع کثیرۃ وبمسجدین فصاعدا فمفادہ عدم جواز التعدد فی مسجد واحد کیف لا وجواز التعدد فی مسجدین مختلف فیہ ایضًا وعدم الجواز ھو الظاھر ولکنھم جوزوہ للضرورۃ ففی رد المحتار بل قال السبکی من الشافعیۃ انہ رای عدم جواز التعدد قول اکثر العلماء ولا یحفظ عن صحابی ولا تابعی تجویز تعددھا اھ الی ان قال ولذا قال فی شرح المنیۃ الاولی ھو الاحتیاط لان الخلاف فی جواز التعدد وعدمہ قوی وکون الصحیح الجواز للضرورۃ للفتوی لا یمنع شرعیۃ الاحتیاط للتقوی اھ (ص ۸۴۴ ج ۱) قلت فلما کان ھذا حال التعدد فی موضعین فکیف بہ فی موضع واحد لعدم الضرورۃ فیہ اصلا وعدم تجویزہ عن احد من الائمۃ فیمنع کل المنع واللہ اعلم ۱۲ رجب ۴۳ھ

احکام خطبۂ عید | **سوال** (۲۹) مسئلہ: عیدین کی نماز کے بعد خطبہ پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، (شامی، ص ۸۶۵ ج ۱)

مسئلہ: جب تک امام خطبہ پڑھے اس وقت تک سب نمازیوں کا بیٹھا رہنا بھی سنت ہے، امام کی فراغت سے پہلے مقتدیوں کا چلا جانا مکروہ ہے جس سے گناہ ہوتا ہے، (درمختار مع الشامی، ص ۸۷۴ ج ۱) اور اس کراہت پر مالکیہ و شافعیہ کا بھی اتفاق ہے (المدونۃ لمالک، ص ۱۵۵ ج ۱ و کتاب الام للشافعی، ص ۲۱۲ ج ۱)

مسئلہ: اور جو لوگ خطبہ کے وقت عیدگاہ میں موجود ہوں، ان کو خطبہ ہوتے ہوئے بات چیت کرنا جائز نہیں، خطبہ چھوڑ کر چلا جانا تو مکروہ ہی ہے، اور خطبہ ہوتے ہوئے عیدگاہ میں رہ کر بات چیت کرنا حرام ہے (شامی و درمختار، ص ۸۵۸ ج ۱) پس یہ جو دستور ہے کہ لوگ نمازِ عید کے ختم ہوتے عیدگاہ ہی میں بات چیت کرنے اور معانقہ وغیرہ کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اس وقت امام خطبہ پڑھنے میں مشغول ہوتا ہے، یہ فعل ناجائز ہے،

مسئلہ: خطبۂ عیدین میں امام کو پہلے خطبہ میں کھڑے ہوتے ہی اوّل نو دفعہ تکبیر اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کر خطبہ شروع کرنا چاہئے، اور دوسرے خطبہ میں اوّل سات تکبیریں کہہ کر خطبہ شروع کرنا چاہئے، یہ سنت ہے، اکثر لوگ اس سنت پر عمل نہیں کرتے، اس کو زندہ کرنا چاہئے، (شامی ۸۷۴ ج ۱) اس سنت کی دلیل حدیث سے کتاب الام للشافعی (ص ۲۱۱ ج ۱)

میں موجود ہے، واللہ اعلم، ۲؍ ذی الحجہ ۴۳ھ

اختتامِ خطبہ کے بعد متصل اقامت شروع ہو تو امام سامع اقامت کے لئے بیٹھے یا نہیں

سوال (۳۰) جمعہ کے دونوں خطبوں کے بعد امام منبر سے اُتر کر حسبِ معمول مع مقتدی تکبیر بیٹھ کر سنے، یا حیّ علی الصلوٰۃ پر مع مقتدی کھڑے ہوں یا شروع تکبیر اُولیٰ اللہ اکبر پر مع مقتدی کھڑے ہو کر سُنے،

الجواب؛ جمعہ کے دونوں خطبوں کے بعد بالاتفاق تکبیر کے شروع ہی سے کھڑے ہوں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ سے کہیں سے ثابت نہیں، کہ وہ خطبہ پڑھ کر بیٹھے ہوں، وفی باب الجمعة واذا اتم اقیمت ویکرہ الفصل اھ، قال الشامی بحیث یتصل اول الاقامة بآخر الخطبة وینتهی الاقامة بقیام الخطیب مقام الصلوٰة اھ (ص ۸۶۱ ج ۱) فیه دلالة علی ان الخطیب لا یجلس بعد الخطبة بل یقوم فی موضع الصلوٰة فلو کان القیام عند حیّ علی الصلوٰة مندوبًا فی الجمعة لندب للخطیب ایضا لکون الامام والمقتدی فی هذا الحکم سواء ولان الجماعة کثیرة یتعسر بها تسویة الصفوف بالعجلة فینبغی لهم القیام بعد الخطبة مع الاقامة کما قالوا ان التحلیق هو الافضل لسماع الخطبة ولکن الرسم الاٰن انهم یستقبلون القبلة للحرج فی تسویة الصف لکثرة الزحام کذا فی شرح الهدایة للسروجی قال فی شرح المنیة واذا فرغ من الخطبة اقاموا الصلوٰة اھ (ص ۵۲۰) واقاموا امر للکل، والله تعالیٰ اعلم، ۲۰؍ رجب ۴۴ھ

حکم نمازِ جمعہ بر کاشتکارانِ بادیہ نشین

سوال (۳۱) جو لوگ جنگل میں کھیت وغیرہ پر رہتے ہیں، اور بعض کے وہاں سے آنے میں نقصانِ مال کا خوف ہے، اور بعض کے آنے میں کچھ نقصان بھی نہیں، تو ان میں سے ترکِ جمعہ سے کون فریق گنہگار اور کون نہیں، اور جبکہ اذانِ جمعہ کی آواز بعض کو آتی ہے اور بعض کو نہیں آتی، فقط والسلام

الجواب؛ جس کو جمعہ اور جماعت کی نماز میں شریک ہونے سے کھیت یا مال کے نقصان کا خوف ہو مثلاً غلّہ کاٹ کر کھلیان میں ڈال رکھا ہے، اور چوری ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں جمعہ وجماعت کے ترک سے گناہ نہ ہوگا، قال فی الدر او خوف علی ماله قال الشامی ای من لص ونحوه اذا لم یمکنه غلق الدکان او البیت

مثلا ومنه خوفه علیٰ تلف طعام فی قدر او خبز فی تنور تأمل اھ (ص ۱ج۵۸۱)

اور جس کو کھیت سے مسجد تک آنے میں نقصان کا اندیشہ نہیں اس کو جمعہ کا ترک کرنا جائز نہیں، گناہ ہوگا، باقی اوقات کی جماعت کا ترک کھیت پر رہنے والوں کو اس وقت ناجائز ہے جبکہ کھیت آبادی سے متصل ہو، اور جو آبادی سے اتنا دور ہو کہ اذان کی آواز وہاں تک نہ پہونچتی ہو، نیز وہاں سے آبادی میں آنا اور واپس جانا موجب کلفت و حرج ہو تو اس صورت میں کھیت والوں پر مسجد میں آنا واجب نہیں، کھیت ہی پر جماعت کرلیں، اور جماعت نہ کرسکیں تو تنہا پڑھ لینا ہی جائز ہے، عن ابی هریرة رض مرفوعًا لینتهین الرجال ممن حول المسجد لا یشهدون العشاء الآخرة فی الجمیع او لاحرقن بیوتهم رواه احمد ورجاله موثقون (مجمع الزوائد ص ۱۵۸ ج ۱) وعن صفوان بن امیّة قال کنا عند رسول الله صلی الله علیه وسلم فقام عرفطة بن نهیك فقال یارسول الله انی واهل بیتی مرزوقون من هذا الصید وهو مشغلة عن ذکر الله وعن الصلوٰة فی جماعة وبنا الیه حاجة افتحله ام تحرمه قال احله لان الله عزوجل قد احله ویکفیك من الصلوٰة فی جماعة اذ رغبت عنها فی طلب الرزق حبك للجماعة واهلها وحبك لذکر الله واهله رواه الطبرانی فی الکبیر وفیه بشر بن نمیر متروك اھ (ص ۱۶۱ ج ۱) قلت ولکنه مؤید بالنصوص المصرحة بنفی الحرج عن الامة، والله اعلم، ۱۵ر شعبان ۴۴ھ

چرواہے پر نمازِ جمعہ فرض ہے یا نہیں

سوال (۳۲) ایک شخص اپنا ریوڑ بھیڑ بکری چرا رہا ہے، اور جمعہ کا روز ہے تو فرمائیے کہ اس پر نمازِ جمعہ کی فرض ہے یا کہ ظہر کی؟

الجواب: اگر یہ شخص فناءِ مصر میں بکریاں چرا رہا ہے تو اس پر جمعہ میں آنا واجب ہے، اور بکریوں کو اپنے ساتھ واپس لے آئے، بعد جمعہ کے پھر لے جائے، اور اگر فناءِ مصر سے اتنا دور ہے کہ شہر سے میل بھر کا فاصلہ ہوجائے تو اس صورت میں اس سے جمعہ ساقط ہے، ظہر کی نماز پڑھ لے، بشرطیکہ وہ شہر سے قبل زوال کے نکل گیا ہو قیاسًا علی التیمم قال فی نور الایضاح اوالاقامة فیما ای فی هو داخل فی حد الاقامة بها ای بالمصر فی الاصح کربض المصر وفنائه

الذی لم ینفصل عنه بغلوة ولا یجب علی من کان خارجه ولو سمع النداء من المطرۃ (ص ۲۹۲) واللہ اعلم، ۲۷ رشوال ۴۴ھ

گاؤں اور قصبہ کی تعریف **سوال (۳۳)** .... حنفیہ کے نزدیک ایسے گاؤں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں جس کی تعریف حسب ذیل ہے :۔

آبادی ۱۹۴۸ ہے، جس میں مسلمان مختلف قومیں آباد ہیں، شیخ، مغل، پٹھان، زمیندار راجپوت نومسلم، لوہار، بڑھئی، نائی، دھوبی، قصائی تیلی، منہیار، درزی، تیرگر، ڈوم، خرادی نداف، جولاہا، سقہ، عطار، پنساری، بزاز وغیرہ وغیرہ، وسط گاؤں میں مسلسل دو طرفہ تقریباً چالیس دکانیں، ایک ڈاک خانہ ہے، ایک ہی مسجد ہے، مع حوض نہایت عالیشان ہے پہلے سے جمعہ ہوتا آیا ہے، اب اختلاف ہوا ہے،

الجواب : اصل یہ ہے کہ گاؤں میں جمعہ صحیح نہیں اور شہر و قصبات میں صحیح ہے قصبہ کی تعریف ہمارے عرف میں یہ ہے کہ جہاں آبادی چار ہزار کے قریب یا اس سے زیادہ ہو، اور ایسا بازار موجود ہو جس میں دکانیں چالیس پچاس متصل ہوں، اور بازار روزانہ لگتا ہو، اور اس بازار میں ضروریات روزمرہ کی ملتی ہوں، مثلاً جوتہ کی دوکان بھی ہو، اور کپڑے کی بھی، عطار کی بھی ہو بزاز کی بھی، غلہ کی بھی اور دودھ گھی کی بھی، اور وہاں ڈاکٹر یا حکیم بھی ہوں معمار و مستری بھی ہوں وغیرہ وغیرہ اور وہاں ڈاکخانہ بھی ہو، اور پولیس کا تھانہ یا چوکی بھی ہو، اور اس میں مختلف محلے مختلف ناموں سے موسوم ہوں،

پس جس بستی میں یہ شرائط موجود ہوں گے وہاں جمعہ صحیح ہوگا، ورنہ صحیح نہ ہوگا، قال فی ردّ المحتار عن ابی حنیفة انه بلدة کبیرة فیها سکک و اسواق ولها رساتیق وفیها والٍ یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح اه (ص ۸۳۵ ج ۱) قلت اقمنا البولیس وقیامه مقام الوالی لرجوع الناس الیه فی الحوادث والرساتیق المحلات والقریٰ التابعة لها، وقال فی الغنیة المستملی والفصل فی ذلك ان مکة والمدینه مصران تقام بها الجمعة من زمنه علیه الصلوٰة والسلام الی الیوم فکل موضع کان مثل احدهما فهو مصر فکل تفسیر لا یصدق علی احدهما فهو غیر معتبر ثم صح الروایة التی ذکرناها عن الامام وقال قال قاضی خان

والاعتماد علی ما روی عن ابی حنیفۃ کل موضع بلغت ابنیتہ ابنیۃ منی وفیہ مفتی وقاض فہو مصر جامع وعن محمد ان کل موضع مصرہ الامام فہو مصر حتی انہ لو بعث الی قریۃ نائبا لاقامۃ الحدود والقیاس تصیر مصراً فاذا عزلہ تلحق بالقری ووجہ ذلک ما صح انہ کان لعثمان عبد اسود امیرا علی الربذۃ یصلی خلفہ ابوذر وعشرۃ من الصحابۃ الجمعۃ وغیرھا، ذکرہ ابن حزم فی المحلی اھ (ص ۵۱۱ و ۵۱۲)

وفی الخلاصۃ الامام اذا منع اھل المصر ان یجمعوا لم یجمعوا کما ان لہ ان یمصر موضعا کان لہ ان ینہاھم (ای اذا لم یکن منعہ تعنتا واضرارا بل اراد ان یخرج ذلک الموضع من ان یکون مصراً قالہ الفقیہ ابو جعفر ۱۲) ولو ان اماما مصر مصرا ثم نفر الناس عنہ لخوف عدو وما اشبہ ذلک ثم عادوا الیہ فانھم لا یجمعون الا باذن مستانف من الامام اھ (۲۰۸ ج ۱)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ مصر مصر ہونے کے بعد جب تک کہ امام اس کو مصریت سے نہ نکالے، مصر باقی رہتا ہے، مگر یہ کہ اس کے کل باشندے وہاں سے بھاگ جائیں تو از سر نو اذنِ امام کی ضرورت ہے، اور جہاں امام نہ ہو وہاں عامۃ الناس بجائے .... امام کے ہیں، پس جو بستی ایک دفعہ قصبہ ہو چکی اور وہاں جمعہ قائم ہو چکا، تو جب تک ... وہاں پر آثار قصبہ کے مثلاً بازار اور عمارات کی ہیئت باقی ہو گی وہ قصبہ رہی گا جب تک کہ عرفِ عام اس کو قصبہ ہونے سے نہ نکالے،

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قصبہ ہونے کے لئے ابنیہ وعمارات کی خاص ہیئت کو بھی دخل ہے، واللہ اعلم، ۲۶ ر ذیقعدہ ۴۳ھ

جیل میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال (۳۴) اگر کسی شہر کے جیل خانے میں کثرت سے مسلمان قیدی ہوں، اور گورنمنٹ کی طرف سے جیل کے اندر کسی مقرر جگہ میں نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے، اور باہر کے کسی مولوی صاحب کو جمعہ پڑھانے کی اجازت ملے تو اس صورت میں قیدخانہ میں جمعہ جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب: صحتِ صلوٰۃ جمعہ کے شرائط میں سے اذنِ عام بھی ہے، اور صورتِ مذکورہ فی السوال میں وہ مفقود ہے، لہٰذا جمعہ صحیح نہ ہوگا، فی الدر المختار فلا یضر غلق باب

القلعۃ لعدو او لعادۃ قدیمۃ لان الاذن العام مقرر لاھلہ وغلقہ لمنع العدو
ولا المصلی نعم لو لم یغلق لکان احسن کما فی مجمع الانھر معزیا شرح عیون المذاہب
قال وھذا اولی مما فی البحر والمنح فلیحفظ وقال الشامی (قولہ لان الاذن العام
مقرر لاھلہ) ای لاھل القلعۃ لانھا فی معنی الحصن والاحسن عود الضمیر
الی المضمر المفہوم عن المقام لانہ لا یکفی الاذن لاھل الحصن فقط بل الشرط الاذن
للجماعات کلھا کما مر عن البدائع (قولہ وغلقہ لمنع العدو الخ) ای ان الاذن
ھنا موجود قبل غلق الباب لکل من اراد الصلوٰۃ والذی یضر انما ھو منع المصلین
لا منع العدو (قولہ لکان احسن) لانہ ابعد عن الشبہۃ لان الظاھر اشتراط
الاذان وقت الصلوٰۃ لا قبلھا لان النداء للاشتھار کما مر وھم یغلقون الباب
وقت النداء او قبیلہ الخ (ص ۸۵۱ ج ۱)

اور شامی میں کافی کی عبارت ہے (لان اشتراط السلطان للتحرز عن تفویتھا علی
الناس وذا لا یحصل الا بالاذن العام) کے بعد جو کہا ہے، قلت وینبغی ان یکون محل
النزاع ما اذا کان لا تقام الا فی محل واحد اما لو تعددت فلا لانہ لا یتحقق
التفویت کما افادہ التعلیل تأمل، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شامی کے نزدیک
جیل خانہ میں جمعہ جائز ہے، جب کہ اس شہر میں دوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو، لیکن تحریر مختار میں
قول مذکور پر لکھتے ہیں لا یلزم من انتفاء العلۃ انتفاء المعلول فالحق ابقاء الکلام
علی عمومہ وان انتفت ھذہ العلۃ التی ذکرھا لاحتمال علۃ اخری اقتضت
العموم علی ان ما تقدم عن البدائع من التعلیل یقتضی عموم الحکم وقد قالوا
لا یلزم من بطلان الدلیل المعین بطلان المدلول (ص ۱۱۲ ج ۱)

و نیز بحر الرائق (ص ۱۵۱ ج ۲) میں ہے فلو امر انسانا یجمع بھم فی الجامع
وھو فی مسجد اخر جاز لاھل الجامع دون اھل المسجد الا اذا اعلم الناس بذلک اھ
اس سے بھی ظاہرا یہی معلوم ہوا کہ بدون اذنِ عام کسی حال میں جمعہ صحیح نہیں، پس جیلخانہ
میں جمعہ نہ پڑھنا چاہئے، اور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی چونکہ نمازیوں کو عام اجازت
نہیں، اس لئے اسٹیشن پر بھی باوجود مصر یا فناءِ مصر ہونے کے جمعہ صحیح نہ ہوگا، واللہ اعلم،
احقر عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، انشاء اللہ تعالیٰ ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۱ ذیقعدہ ۴۳ھ

مصر کی تعریف | **سوال** (۳۵) قریۂ کبیرہ کی کیا تحدید ہے، کہ وہاں صلوٰۃ جمعہ واجب ہے، قریۂ صغیرہ وکبیرہ میں نہایت اشتباہ ہے، تشفی بخشئے؟

الجواب: مصر کی علامات ہر زمانہ میں مختلف ہوئی ہیں، آجکل علامات یہ ہیں کہ تین چار ہزار کی آبادی ہو، بازار ہو، جس میں سب ضروریات ملتی ہوں اور وہ بازار مستقل ہو، ہفتہ وار بازار لگنا کافی نہیں، اور ڈاک خانہ وغیرہ ہو، ۸ ربیع الثانی ۴۴ھ

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا | **سوال** (۳۶) جمعہ کو خطبہ سے قبل خادم مسجد آن کر منبر پر جا نماز بچھا جاتا ہے، اور کتاب خطبہ رکھ جاتا ہے، اور ایک چھڑی پتلی سی بانس کی جو نہایت صاف ستھری ہوتی ہے منبر پر رکھ جاتا ہے، چنانچہ جب امام صاحب منبر پر خطبہ سنانے کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں تو اسی چھڑی کو ہاتھ میں لیلیتے ہیں اس بارے میں ناواقف لوگوں نے امام صاحب سے دریافت کیا تو فرمایا کہ جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ پڑھتے تھے تو کسی وقت آپ نے ہاتھ میں تلوار لی ہے اور کبھی کمان اور کبھی نیزہ اور لکڑی، چنانچہ بطریق سنت ایسا کیا جاتا ہے، اور مشکوٰۃ شریف میں لکھا ہے، چنانچہ جناب سے دریافت طلب ہے کہ اس کی کیا صورت ہے؟ امید ہے کہ جواب سے آگاہی فرمائی جائے گی؟

الجواب: عصا لینا مستحب ہے، لیکن اگر اس کو ضروری سمجھا جاوے اور تارک پر ملامت کی جائے تو التزام مالا یلزم کی وجہ سے منع کیا جائے گا، فی الدر ویکرہ ان یتکی علی قوس او عصاء و فی الشامی نقل القھستانی عن عین المحیط ان اخذ عصا سنۃ کالقیام (ص ۸۶۲ ج ۱) وقال شیخنا مد ظلھم العالی ان الکراھۃ محمولۃ علی مقصودہ، واللہ اعلم

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۸ ربیع الثانی ۴۴ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ

جمعہ کی دونوں اذانوں کے درمیان کھانا پینا اور خطبہ کے بعد نیت باندھنے سے قبل باتیں کرنے کا حکم | **سوال** (۳۷) جمعہ کی اول اذان سے لے کر خطبہ کی اذان تک اور ایسے ہی خطبہ کی اذان سے نماز کے ختم تک کھانا پینا کیسا ہے، کیونکہ اکثر لوگ مسجد میں آکر خطبہ شروع ہونے سے پہلے بھی اور پیچھے بھی پانی پیتے رہتے ہیں، خطبہ ختم ہونے کے بعد نیت باندھنے تک بول چال کرنی مثلاً نمازیوں کو پیچھے سے

آگے بلانا یا صف سیدھی کرنے کے لئے بول چال کرنا کیسا ہے ؟

الجواب، دونوں اذانوں کے درمیان کھانا جائز ہے، بشرطیکہ جمعہ فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اگر فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو کھانا جائز نہیں فی الدر المختار یمع الندا ء وھو یاکل ترکہ ان خاف فوت جمعۃ او مکتوبۃ لاجماعۃ (شامی، ص ۸۶۲ ج ۱) اور خطبہ کے وقت کھانا پینا کلام کرنا حرام ہے، کما فی الدر ایضا وکل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیھا ای فی الخطبۃ خلاصۃ وغیرھا فیحرم اکل وشرب وکلام الخ ص ۸۵۸ اور خطبہ واقامت کے درمیان بھی امام صاحب کے نزدیک کسی قسم کا کلام جائز نہیں، البتہ صاحبین کے قول پر فقط دنیوی کلام ناجائز ہے، اور تسویۂ صفوف کے لئے کلام کی گنجائش ہے، کما فی الدر المختار وقالا لاباس بالکلام قبل الخطبۃ وبعدھا واذا جلس عند الثانی والخلاف فی کلام یتعلق بالآخرۃ اما غیرہ فیکرہ اجماعاً،

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

کیا نابینا پر نماز جمعہ واجب ہے

سوال (۳۸) ایسے اندھے پر جمعہ واجب ہے یا نہیں کہ جو شہر کے اندر رہتا ہو، مکان متصل جامع مسجد ہو اور اندھا آسانی مسجد میں یا اس سے بھی دو چند چہار چند فاصلہ کے سفر کو روزانہ طے کیا کرتا ہو، اور بلا کسی دوسرے آدمی کے مدد کے سارے شہر میں گھوم آتا ہے، لیکن سڑکوں اور جامع مسجد لب سڑک ہے، اور پانی کنویں میں سے خود کھینچ کر بھر لیتا ہے، کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، کبھی کبھی خفیف سی چوٹ دیوار وغیرہ کے ٹکرا جانے سے آجاتی ہے،

الجواب، جو نابینا بدون دوسرے شخص کے ہمراہ ہوئے بھی پھرتا ہے اور اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس کے ذمہ جمعہ واجب ہے کما فی الشامی (ص ۸۵۳ ج ۱) واقول بل یظھر لی وجوبھا علی بعض العمیان الذی یمشی فی الاسواق ویعرف الطرق بلا قائد ولا کلفۃ ویعرف ای مسجد ارادہ بلا سوال احد لانہ حینئذ کالمریض القادر علی الخروج بنفسہ بل ربما یلحقہ مشقۃ اکثر من ھذا فتامل، فقط ، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، یکم محرم الحرام ۴۵ھ یوم شنبہ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

شہر یا قصبہ میں نماز جمعہ پڑھ کر شام تک گاؤں واپس آسکتے ہوں تو ایسے گاؤں والوں پر جمعہ فرض ہے یا نہیں

سوال (۳۹) جو دیہات شہر یا قصبہ سے اتنی دور رہوں کہ اہل دیہات جمعہ کی نماز پڑھ کر

شہر یا قصبہ سے اپنے مکان پر شام تک واپس چلے جاویں تو ان اہل دیہات پر جمعہ فرض ہے یا نہیں؟

الجواب: اس قصبہ اور گاؤں میں کھیتوں وغیرہ کا فصل ہو اور وہ قصبہ سے جدا سمجھا جاتا ہو، تو اس گاؤں کے باشندوں پر جمعہ فرض نہیں، گو ایک دو ہی میل کا فصل ہو، اور اگر فصل درمیان میں نہیں بلکہ قصبہ کی آبادی گاؤں تک متصل چلی گئی ہو تو گاؤں والوں پر جمعہ فرض ہوگا، ۲۳ رجب ۴۵ھ

حضرت تھانویؒ کے قول اور احسن القری کی عبارت دربارۂ تعریفِ مصر میں رفعِ اختلاف کے متعلق ایک سوال کا جواب

سوال (۴۰) جناب کی اکثر تصانیف سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر کی تعریف میں جو اقوال منقول ہیں وہ تحدید حقیقی کے لئے نہیں بلکہ رسمِ ناقص ہیں، اور احسن القری ص ۶۳ و ۲۰۷ میں اس کے خلاف مصرح ہے، نیز اگر درحقیقت یہ رسوم ہوئیں تو فقہاء کے بعض تعریفوں کو مزیف اور بعض کو صحیح و مرجح قرار دینے کا کیا مطلب ہوگا؟ مثلاً علامہ حلبی کبیری ص ۵۰۷ پر ما لا یسع اکبر مساجدہ الخ کو غیر صحیح فرماتے ہیں، لعدم صدقہ علی الحرمین، اگر رسم مراد ہوتی تو اس تعلیل کی کیا توجیہ، طحاوی ص ۲۳۹ میں اس تعریف کو غیر صحیح کہا ہے، درمختار و شرح وقایہ میں اسی تعریف کو مفتی بہ ٹھہرایا ہے، لظہور التوانی، اور شامی میں اس کی تائید میں چند اقوال نقل کئے ہیں، ہدایہ میں امام صاحب سے مصر کی تعریف فیہ سکک واسواق ووال الخ منقول ہے، اور یہی ظاہر المذہب ہے، کبیری ص ۵۰۷ میں اسی کو ترجیح دی ہے، اور ظاہر الروایت کہا ہے، اور شامی ص ۵۳ میں بھی ظاہر الروایت کو ترجیح دی ہے، نیز اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ تعریف ما لا یسع الخ اکثر قریٰ پر بھی صادق آجاتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں تعریفوں کا مآل ایک نہیں، ورنہ اس تعریف کے صدق کی تخصیص چہ معنی؟

(۲) والی جس قریہ میں چلا جائے وہ مصر ہو جاتا ہے، کما ہو مصرح فی الفقہ، یہ قریہ کس تعریف کے بموجب مصر کہلائے گی؟

(۳) اگر سب تعریفیں عرفی ہیں تو موجودہ عرف میں مصر کی جامع مانع تعریف کیا ہوگی، بعض اطراف میں تو چھوٹی چھوٹی بستیوں کو بھی شہر کہتے ہیں، ان کا عرف معتبر ہوگا یا نہیں، ایسی تحدید فرمائیں کہ محل تجمیع و تقلید عند الاختلاف صاحب مختار ہو جائے،

الجواب: (۱) مولانا دام مجدہم کا مطلب اس سے یہ ہے کہ جمعہ کی حدِ حقیقی موافق اصطلاح میزانیین مراد فقہا نہیں، بلکہ وہ جو کچھ بیان فرما رہے ہیں رسوم ہیں، جن کا مبنیٰ یہ ہے کہ وہ اس موضع میں جمعہ کی اجازت دینا چاہتے ہیں، جو مکہ اور مدینہ کی اُس حالت کے موافق ہو جس حالت پر یہ دونوں بلدان مکرمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، اور ظاہر ہے کہ اس معیار کو حدِ حقیقی کے ساتھ بیان کرنا دشوار ہے، کیونکہ اختلافِ امصار سے اس معیار کا مصداق مختلف ہوتا رہتا ہے، دوسرے یہ مفہوم بھی فی نفسہ کلی نہیں جس کو حد کلی سے بیان کر دیا جائے، بلکہ جزئی ہے، اور مفہوم جزئی کو جب کلی کیا جائے گا تو لا محالہ وہ رسم ہی ہو گی، لیکن رسم سے رسم فقہی مراد ہے، نہ کہ رسم عرفی محض، پس اب مولانا کے ارشاد اور احسن القریٰ کی عبارت میں کوئی تخالف نہیں، قال ابن الحلبی فی شرح المنیۃ والفصل فی ذلک ان مکۃ والمدینۃ مصران تقام بہما الجمعۃ من زمنہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الیوم فکل موضع کان مثل احدہما فہو مصر، فکل تفسیر لا یصدق علی احدہما فہو غیر معتبر اھ (ص ۵۱۱) اور فقہاء کا بعض رسوم کو مزیف و مرجح کرنا اسی پر مبنی ہے کہ بعض اس معیار میں جامع اور مانع ہیں اور بعض نہیں،

(۲) یہ قریہ بموجب تعریف منقول از امام ابو حنیفہؒ مصر ہو جائے گا، عن ابی حنیفۃؒ انہ بلدۃ کبیرۃ فیہا سکک واسواق واساتیق وفیہا وال یقدر علی الانصاف الخ کیونکہ جب وہاں والی ہو گا تو اس کا عملہ و محکمہ و عدالت و فوج بھی ساتھ ہو گا جس سے اسواق و اساتیق کا تحقق خود بخود ہو جائے گا، اور ان کا تحقق نہ بھی ہو گا تو یقیناً اس وقت امصارِ کبیرہ قریبہ اس قریہ کے تابع ہو جائیں گے جہاں والی موجود ہے، کہ اوامر و نواہی میں اہلِ امصار اُس قریہ کی طرف رجوع کریں گے، اور جب چند قریٰ کی تبعیت سے مصر مصر ہو جاتا ہے، تو امصار کی تبعیت سے قریہ مصر کیوں نہ ہو گا، اس صورت میں اس گاؤں کو اقرب مصر الیہا کا جزو اعظم اور اس مصر کو اس کے تابع ماننے کی وجہ سے مصر کہا جائے گا، اور نزول والی فی القریہ کے وقت اقرب مصر کا اس قریہ کا تابع ہو جانا مشاہد ہے بشرطیکہ والی من حیث الولایہ نزول کرلے، کہ یہی مراد فقہاء ہے، خفیہ گشت و جاسوسی کے طور پر نزول کرے،

یہ تو اوپر معلوم ہو چکا کہ فقہاء کا یہ مطلب نہیں کہ مصریت و قردیت کا مدار محض عرف عام ورائے اہل عرف پر ہے، بلکہ اس کے لئے اُن کے نزدیک معیار شرعی ضرور ہے، جس کو وہ مختلف عبارات سے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ اختلافِ زمان سے اس معیار کا مصداق مختلف ہو جاتا ہے،

پس اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اصل معیارِ مصر تو مکہ و مدینہ کی حالت موجودہ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اور اس معیار کی احسن تفسیر وہ ہے جو امام صاحبؒ سے خود منقول ہے، اور آجکل اس تعریف کا مصداق ہندوستان میں ہمارے نزدیک ہر وہ موضع ہے جس کی آبادی قریب چار ہزار کے ہو یا اس سے زیادہ اور وہاں ایسا بازار موجود ہو جس میں تیس چالیس دُوکانیں متصل یک جا ہوں (کہ بازار اسی کا نام ہے، متفرق دُکانوں کو جن میں فصل کثیر ہو بازار نہیں کہا جاتا) اور اس بازار میں ضروریاتِ روزمرہ دستیاب ہوتی ہوں کہ پارچہ کی دُکان بھی ہو، جوتہ کی بھی، عطارہ کی بھی، دودھ، گھی، غلہ وغیرہ کی بھی اور وہاں ڈاکٹر یا حکیم بھی ہو، معمار و مستری بھی ہو اور وہاں ڈاک خانہ بھی ہو اور پولیس کا تھانہ یا چوکی بھی ہو، اور اس میں مختلف محلے مختلف ناموں سے موسوم ہوں، جس میں یہ شرائط موجود ہوں وہاں جمعہ صحیح ہوگا ورنہ نہیں، قلت اقمت البولیس مقام الوالی لرجوع الناس الیہ فی الحوادث، واللہ اعلم، ۸ رمضان ۴۵ھ

سوال (۴۱)

تکبیرات ایام تشریق کن پر واجب ہے، مفتیٰ بہ قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے یا صاحبینؒ کا؟

.... تکبیرات ایام تشریق کن پر واجب ہیں، چونکہ امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے درمیان خلاف ہے، امام صاحبؒ نے جماعتِ مستحبہ و مصر و رجال وغیرہ کو شرط قرار دیا، اور صاحبینؒ فرماتے ہیں مطلقاً جن پر نماز فرض ہے انہی پر تکبیراتِ تشریق بھی واجب ہیں، اب سوال یہ ہے کہ فتویٰ امام صاحبؒ یا صاحبینؒ کے قول پر ہے، بحوالہ کتب مستندہ و معتبرہ مع صفحہ واضح طور پر بیان فرماویں عنداللہ ماجور ہوں گے،

الجواب: قالا یجب التکبیر فور کل فرض علی من صلاۃ ولو کان منفردا او مسافرا او قرویا لانہ تبع للمکتوبات وبہ ای بقولہما یعمل وعلیہ الفتویٰ طحطاوی ص۲۱۳، مولانا عبدالشکور صاحب اپنے علم الفقہ کے حاشیہ پر

تحریر فرماتے ہیں کہ صاحبینؒ کے نزدیک یہ کوئی شرط نہیں، عورت و مسافر اور منفرد اور قریہ میں تکبیر واجب ہے، صاحبِ بحر الرائق نے سراج وہاج وغیرہ سے نقل کیا ہے، کہ فتوی صاحبین کے قول پر ہے، جلد دوم علم الفقہ، ص ۱۱۲،

وقالا هو على كل من صلى المكتوبة مصرا او قرويا او مسافرا او منفردا او امرأة لانه شرع تبعا للمكتوبة فيؤديه كل من يؤديها والفتوى على قولهما (كنز الدقائق، ص ۴۷ کا حاشیہ) ؛ سوال: تکبیراتِ تشریق کن پر واجب ہے؟

جواب: جن پر نماز فرض ہے انہی پر تکبیر بھی واجب ہے، بموجب مذہب صاحبینؒ کے، اور اسی قول پر فتوی ہے، تو اب مسافر اور تنہا پڑھنے والے پر بھی تکبیر واجب ہوئی، رکن دین ص ۲۵ اور مختار کبیری وعندهما يجب على كل من يصلي المكتوبة وابتداءه من فجر عرفة عندنا الخ والعمل على قولهما، صغیری ص ۲۸۵ وقال هو على كل من يصلي المكتوبة لانه تبع المكتوبة ھدایہ، ص ۱۵۵ ج ۱، درحاشیہ مالابدمنہ فارسی ونزد صاحبین جماعت شرط نیست پس واجب است بر منفرد وزن ومسافر، درمختار، صفہ ۶۵ میں مذکور ہے وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ على كل من يؤدي المكتوبة في هذه الايام على اى صفة كان في اى مكان كان وهو قول ابراهيم النخعي، بدائع الصنائع جلد اول صفہ ۱۹۷، ونزد صاحبینؒ بر منفرد وزن ومسافر ہم واجب است، مفتاح الصلوٰۃ ۱۴۲ نیز صفہ ۱۴۳ کے حاشیہ میں مرقوم ہے کہ گفت در بحر الرائق وغیرہ والعمل وفتوی بر قول صاحبین ست در ہمہ شہرہا وزمانہا قال في بحر الرائق وغيره والعمل والفتوى على قولهما في عامة الامصار وكافة الاعصار، وبقول ابو یوسفؒ ومحمدؒ تکبیراتِ تشریق واجب است بر ہر کہ فرض بگذارد وختم تکبیرات بر قولِ ایشاں عصر آخر ایام تشریق است وآں بست وسہ نماز است وعليه الفتوى، درکنز فارسی صفحہ ۲۷ ونزدیک صاحبینؒ اقامت وذکورۃ وصحت ومنفرد جماعت شرط نہ پس واجب باشد بر ہر مصلّی بعد فرض ایں ایام از فجر عرفہ تا عصر پس ایامِ تشریق هو المعمول وعليه الفتوى، فتوی برہانیہ كما في الترغيب وقالا بوجوبه فور كل فرض مطلقا ولو كان منفردا او مسافرا او امرأة لانه تبع للمكتوبة الى عصر اليوم الخامس آخر ايام التشريق وعليه الاعتماد والعمل والفتوى في عامة الامصار وكافة الاعصار، درمختار، قال ابو یوسفؒ ومحمدؒ التكبير

تبع الفریضہ فکل من ادّی فریضۃ فعلیہ التکبیر الفتویٰ علیٰ قولہما من تکبیر المسافر واھل القری جوھرۃ النیرۃ، ص ۹۲ ونزدیک ابویوسفؒ ومحمدؒ ہر کہ نماز بگنید بروے واجب آید کہ تکبیر گوید (قدوری فارسی، ص ۲۸) وعندہما یجب التکبیر علیٰ کل من یصلی المکتوبۃ، کنز الدقائق نولکشوری، ص ۴۲ کے حاشیہ نمبر ۶ میں مذکور ہے، لیکن اگر منفرد اور عورت اور مسافر بھی کہہ لے تو بہتر ہے، کہ صاحبین کے نزدیک ان سب پر واجب ہی، بہشتی گوہر ص۹۹ حوالہ درمختار، وعندہما کل من صلی المکتوبۃ فی ہذہ الایام فعلیہ التکبیر مقیماً کان مسافراً رجلاً کان امرأۃ فی المصر او فی غیرہ فی الجماعۃ او وحدہ، خلاصۃ الفتویٰ، ص ۲۱۶ ج ۱، المستفتی بندہ ادریس سلہٹی

صحیح — عبداللطیف عفا اللہ عنہ، مدرسہ مظاہر علوم

الجواب صحیح — بندہ منظور احمد، عفی عنہ

الجواب صحیح — محمد زکریا، قدوسی، مدرس مدرسہ مظاہر علوم،

جواب صحیح ہے — صدیق احمد عفا اللہ عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم

صحیح ہے — بندہ عبدالرحمٰن غفرلہ مدرس

الجواب صحیح — ۱۸ر صفر ۴۶ھ — بندہ محمد ظہور الحق عفی عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

ان کان کذٰلک فکذٰلک — عبدالقیوم عفی عنہ

جواب صحیح ہے — بندہ ارشد علی عفی عنہ

جواب صحیح ہے — بندہ عبدالقیوم

جواب درست ہے — بندہ اخلاق احمد مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

الجواب الجواب — محمد امیر سلہٹی عفا اللہ عنہ

چہ می فرمایند علمائے دین و شرع متین در بارۂ جواب سوال مرقوم الصدر صحیح است یا غلط، بر تقدیر ثانی عبارتہائے کہ علیہ الفتویٰ والعمل بقولہما فی الامصار وغیرہ را چہ جواب است بینوا بالتفصیل وتوجروا باجر الجزیل،

الجواب، سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم،

جواب سوال مرقوم الصدر از تتبع کتب فقہاء حنفیہ غلط معلوم می شود علی الاطلاق بہر کس واجب نیست بلکہ بر ہر مقیمیکہ نماز با جماعت مستحبہ گزاردہ باشد، چنانکہ در فتویٰ عالمگیریہ مرقوم است، اما شرطہ فاقامۃ ومصر ومکتوبۃ وجماعۃ مستحبۃ ھکذا

فی التبیین، و ایضا در ہدایہ متناً عقیب الصلوات المفروضات علی مقیمین فی الامصار فی الجماعۃ المستحبۃ عند ابی حنیفۃ ولیس علی جماعات النساء اذا لم یکن معھن رجل ولا علی جماعۃ المسافرین اذا لم یکن معھن مقیم وشرحًا والشرع ورد عند استجماع ھذہ الشرائط الا انہ یجب علی النساء اذا اقتدین بالرجال وعلی المسافرین عند اقتدائھم بالمقیم بطریق التبعیۃ آمدہ است وایں قول نیز در مختصر الوقایۃ آمدہ است من فجر عرفۃ عقیب کل فرض ادی بجماعۃ مستحبۃ علی المقیم بالمصر ومقتدیہ برجل ومسافر مقتد بمقیم الی عصر العید وقالا عصر آخر ایام التشریق وبہ یعمل، وہکذا در مالابد منہ مسطور است "تکبیراتِ تشریق بعد ہر نماز کہ بجماعت گذاردہ بر مقیم بمصر واجب است از صبح روز عرفہ تا عصر روز عید نزد امام اعظمؒ وتا عصر تاریخ سیزدہم نزد صاحبین وفتوی برآن ست واگر مسافر اقتدا بمقیم کند بر آنہا نیز تکبیر واجب شود" ہر کس وناکس غبی وذکی اظہر من الشمس ظاہر ست کہ مختار قول ابی حنیفہ است، در مذہب احناف اکنوں باقی ماند جواب علیہ الفتوی والعمل بقولہما فی الامصار، جوابش آنست کہ مرجع ضمیر علیہ فقط قول صاحبین کہ تا عصر روز سیزدہم ہست، ومراد از قولہما قول تا روز سیزدہم ہست دراں شکے نیست کہ مختار ومعمول بہ در مذہبِ احناف فی عامۃ الامصار وکافۃ الاعصار ہمین است، چنانکہ در عالمگیری منقوش است واما وقتہ فاولہ عقیب صلوٰۃ الفجر من یوم عرفۃ وآخرہ فی قول الصاحبین عقیب صلوٰۃ العصر الی آخر ایام التشریق ھکذا فی التبیین الفتوی فی عامۃ الامصار وکافۃ الاعصار علی قولھما کذا فی الزاھدی و ھکذا در مختصر الوقایۃ وقالا الی عصر آخر ایام التشریق وبہ یعمل و ایضاً در مالابد منہ "تا روزِ عصر روز عید نزد امام اعظمؒ وتا روز عصر تاریخ سیزدہم نزد صاحبین وفتوی بر آن ست" ہر کہ بر عبارت مرقومۃ الصدر بارے نظر سطحی می اندازد ہرگز فتوی ندہد کہ فتوی بر آنست کہ بر ہر دو مرد وزن خواہ مسافر باشد خواہ مقیم بمصر یا قریہ منفرد باشد یا بجماعت گزاردن تکبیر تشریق واجب است حاشا وکلا ہرگز ایں خیال صحیح نیست وعبارتہائے کہ مفتی صاحب نقل فرمودہ اند ہمہ را نقل کردن وتطبیق دادن بہایت مشکل است وچنداں ضرورت ہم نیست لیکن عبارتے کہ دراں مدار فتوی است

وبارہا بزبان فارسی وعربی وار دو نقل کردہ اند آں عبارت درمختار است وعلی مقتدی مسافر او قروی او امرأۃ بالتبعیۃ لکن المرأۃ تخافت ویجب علی مقیم اقتدی بمسافر وقالا لوجوبہ فور کل فرض مطلقا ولو منفردا او مسافرا او امرأۃ لانہ تبع للمکتوبۃ الی عصر الیوم الخامس آخر ایام التشریق وعلیہ الاعتماد والعمل والفتوی فی العامۃ الامصار وکافۃ الاعصار، عبارت عالمگیری ومختصر الوقایۃ ومالابد منہ را اگر بدیں عبارت ملاحظہ کردہ شود معلوم گردد کہ علیہ الاعتماد والعمل والفتوی الخ را تعلق فقط الی آخر ایام التشریق است چونکہ در اکثر جا عبارت فقہاء مختلط بودہ است بنائٌ علیہ صاحب ہدایہ بوقت شرح علیحدہ بیان فرمودہ وصاحب عالمگیری علیحدہ باچناں وضاحت بیان فرمودہ اند کہ دراں ہیچ خفا نماندہ کہ علیہ را تعلق الی آخر ایام التشریق ست، نا کہ با قول مفتی صاحب، کما لایخفی علی المتامل، نیز سخن تعجب خیز است کہ جناب مفتی صاحب عبارتیکہ نقل فرمودہ اند بہر چہ کہ از ال حق ظاہر گردد نقل نہ فرمودہ اند، چنانکہ در عبارت بہشتی گوہر نظر فرمائید ہمہ عبارتش اینست " تکبیر تشریق یعنی ہر نماز کے بعد ایک مرتبہ اللہ اکبر الخ کہنا واجب ہے، بشرطیکہ وہ فرض جماعت سے پڑھا گیا ہو اور وہ مقیم مصر ہو، یہ تکبیر عورت اور مسافر پر واجب نہیں، اگر یہ لوگ کسی ایسے شخص کے مقتدی ہوں جس پر تکبیر واجب ہے، تو اُن پر بھی تکبیر واجب ہو جائے گی، (درمختار) لیکن اگر مسافر اور عورت بھی کہہ لے تو بہتر ہے کہ صاحبین کے نزدیک ان سب پر واجب ہے، ہر کہ عبارت گوہر را ملاحظہ نمایند، ہرگز نمی گویدکہ فتوی بر قول صاحبین ست کہ بر ہر مصلی مکتوبات تکبیر واجب است معہذا بندہ می گوید از لفظ بہتر واجب چگونہ ثابت گردد ہرگز نہ بل استحباب مستفاد گردد ہمیں غرض ست کجا کہ فقہاء نقل قول صاحبین کردہ اند، لایخفی ہذا من طالع کتب الفقہیہ وہرگاہ ثابت شد عمل در امصار حسب قول امام ابو حنیفہؒ ست، ہرچند کہ جناب مفتی صاحب قول صاحبینؒ کہ مثبت وجوب است نقل کردہ اند اثر فائدہ نمی بخشد زیرا کہ قول صاحبینؒ را کسے منکر نیست لیکن عمل بداں ومفتی بہ نیست، کما علمت بل در مذہب ما ازاں استحباب ثابت کردہ شود کما لایخفی علی المتدبر، حررہ احقر الناس محمد مظہر علی غفر اللہ عنہ

الجواب صحیح، محی الدین احمد عفی اللہ الصمد مدرس مدرسہ احمدیہ باغبانپورہ الجواب صحیح محمد غلام غفرلہ ولوالدیہ

محمد محی الدین عفی عنہ مدرس مدرسہ باغبانپورہ، الجواب ہو الجواب کہ بر منفرد و مسافر تکبیر تشریق بمذہب احناف واجب نیست، کما فی الصغیری تکبیر التشریق عقیب الصلوٰۃ فریضۃ بجماعۃ مستحبۃ فلا یجب علی المسافر ولا علی المنفرد، انتہی وفی فتاوی السراجیۃ لا تکبیر علی المنفرد عند ابی حنیفۃ رح انتہی،

الجواب من جامع امداد الاحکام

اقول وباللہ التوفیق الصحیح عندنا الجوابُ الثانی دون الاوّل ودلیلہ ما فی رد المحتار تحت قول الدر وعلیہ الاعتماد والعمل والفتویٰ فی عامۃ الامصار ونصّہ ھذا بناء علی انہ اذا اختلف الامام وصاحباہ فالعبرۃ لقوۃ الدلیل وھو الاصح کما فی آخر الحاوی القدسی او علی ان قولھما فی کل مسئلۃ مروی عنہ ایضاً الی انہ قال وبہ اندفع ما فی الفتح من ترجیح قولہ ھنا ورد فتوی المشائخ بقولھما بحرا ھ (ص ۷۹۸ ج ۱) فھذا یدل علی ان ابن الھمام قد رد فتوی المشائخ فی ھذہ المسئلۃ التی اعتمدوا فیھا علی قول الصاحبین وافتوا بہ فلو نظر المجیب الاوّل فتح القدیر وراجع کلام المحقق لعلم ان المسئلۃ التی رجحت المشائخ فیھا قول الصاحبین انما ھی مسئلۃ انتھاء وقت التکبیر لا غیر وفیھا بسط المحقق الکلام ورد علی المشائخ الاعلام کما ذکر فی (ص ۴۹ ج ۲) واما مسئلۃ من یجب علیہ التکبیر فلم یرجح المشائخ فیھا قولھما علی قولہ ولم یرد المحقق فیھا علی احد من المشائخ فظھر من مجموع الکلام الشامی وکلام المحقق ان الذی علیہ الاعتماد والعمل والفتوی ھو الذی رد فیہ المحقق علی المشائخ ورجح فیہ قول الامام ولیس ذلک الا مسئلۃ انتھاء وقت التکبیر ھذا وقد علم من عادۃ صاحب الھدایۃ انہ یؤخر دلیل المذھب الذی ھو المختار عندہ وفی نتائج الافکار من عادۃ المصنف المستمرۃ ان یؤخر القوی عند ذکر الادلۃ علی الاقوال المختلفۃ لیقع المؤخر بمنزلۃ الجواب عن المقدم وان کان قدم القوی فی الاکثر عند نقل الاقوال اھ من مقدمۃ الھدایۃ (ص ۳ ج ۲) و فی مسئلۃ من یجب علیہ التکبیر قدم صاحب الھدایہ قول الامام عند نقل الاقوال واخر دلیلہ عن دلیلھما وھذا یدل علی ان قول

الامام هو الراجح فیهما عنده، وفی الخلاصة فی تکبیرات ایام التشریق ما نصه
کبار الصحابة رضی الله عنهم یقولون بانه یبدأ بالتکبیر من صلوٰة الغداة
یوم عرفة وبه اخذ علمائنا رحمهم الله واختلفوا فی القطع قال ابن مسعود
یکبر الی صلوٰة العصر من اول یوم النحر وهو ثمانی تکبیرات وبه اخذ ابو حنیفة
وقال علی الی صلوٰة العصر من آخر ایام التشریق وهو ثلث وعشرون تکبیرة وبه
اخذ ابو یوسف ومحمد رحمهما الله وعلیه الفتویٰ وعلیه عمل الناس الیوم،
ثم هذا التکبیر علی اهل الامصار فی الصلوات المکتوبات المؤدیات بجماعة
مستحبة حتی لا یجب علی النسوان وان صلین بجماعة وعندهما کل من صلی
المکتوبة فی هذه الایام فعلیه التکبیر مقیما کان او مسافرا رجلا کان او امرأة
فی المصر او فی غیر المصر فی الجماعات او وحده ومن دخل فی الجماعة من
المسافرین والنساء فعلیهم التکبیر تبعا للرجال کما فی الجمعة والمسافرون
اذا صلوا جماعة فی المصر فیه روایتان والاصح انه لیس علیهم التکبیر اھ
(ص ۲۱۵ و ۲۱۶ ج ۱) وهذا صریح فی ان الفتویٰ علی قولهما انما هو فی وقت قطع
التکبیر واما فی حکم من یجب علیه فالراجح قول الامام لان صاحب الخلاصة
انما ذکر الفتویٰ علی قولهما فی الاول دون الثانی بل صرح فی حکم المسافرین
اذا صلوا جماعة فی المصر بان الاصح انه لیس علیهم التکبیر مع انهما
قائلان بوجوب التکبیر علی المسافر المنفرد ایضا ولو کان فی قریة فعلی المسافرین
اذا صلوا جماعة فی المصر اولی ولکن صاحب الخلاصة صرح بتصحیح
ما یخالف قولهما ثم راجعت البدائع فرأیته قد رجح قول الامام
علی قولیهما فی الفصلین واجاب عن کل ما استدلابه (ص ۱۹۸ ج ۱) و
کذا رجح ابن امیر حاج فی شرح المنیة قول الامام علی قولیهما فی الفصلین
ایضا (ص ۵۳۱) نعم ذکر فی البحر عن السراج الوهاج والجوهرة والفتویٰ
علی قولهما فی هذا ایضا ای فی وجوب التکبیر علی کل من صلی المکتوبة
فی هذه الایام) فالحاصل ان الفتویٰ علی قولهما فی آخر وقته وفیمن یجب
علیه اھ (ص ۱۶۶ ج ۲) ولکن هذا معارض لترجیح صاحب الهدایة وتصحیح

صاحب الخلاصۃ وتحقیق صاحب البدائع وتصویب ابن امیر حاج ویعارض الحدیث الذی استدل بہ الحنفیۃ علی اختصاص الجمعۃ والعیدین بالمصر وھو ما رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ حدثنا عباد بن العوام عن حجاج عن ابی اسحق عن الحارث عن علی رضؓ قال لاجمعۃ ولا تشریق ولا صلوٰۃ فطر والاضحی الا فی مصر جامع او مدینۃ عظیمۃ کذا فی نصب الرایہ ص۳۱۳ ج۱ وسندہ حسن کما ذکرتہ فی اعلاء السنن وبہ احتج ابوحنیفۃ علی اختصاص وجوب التکبیر باھل المصر دون القریٰ کما صرح بہ فی البحر والبدائع والتشریق رفع الصوت بالتکبیر قالہ النضر بن شمیل وھو من ائمۃ اللغۃ قالہ صاحب البدائع فقول ابوحنیفۃ قوی روایۃ ودرایۃ واکثر المصنفین علی ترجیح قولہ علی قولھما فی من یجب علیہ التکبیر فلا عبرۃ بنقل السراج الوھاج والجوھرہ، واللہ اعلم، حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۲ رجب ۴۶ھ

تعریفِ مصر

سوال (۴۲) آجکل کے زمانہ میں کس قسم کی جگہ شرعاً شہر کہلائے گی؟

الجواب: جہاں تین چار ہزار کی آبادی ہو، اور بازار متصل ہو، جس میں ضروریات روزمرہ سب دستیاب ہوتی ہوں، اور اس آبادی کے متعلق اس کے توابع میں کچھ دیہات بھی ہوں،

۱۰ رشوال ۴۶ھ

صحراء جہاں عیدین کی نماز پڑھنا سنت ہے، شرعاً کس کو کہتے ہیں، اور اس کے متعلق متعدد سوالات

سوال (۴۳) شرعاً صحراء کس کو کہتے ہیں؟ جہاں عیدین کی نمازیں پڑھنا سنت مؤکدہ ہے؟

الجواب: جہاں مکانات نہ بنے ہوئے ہوں، مکاناتِ آبادی سے باہر جو میدان ہو وہ عیدگاہ کا محل مسنون ہے،

سوال: کس قسم کے میدان میں عیدین کی نمازیں پڑھنا چاہئے؟ کیا عیدگاہ کا شہر سے باہر ہونا شرط ہے؟ اگر شرط ہے تو یہاں شہر سے کیا میونسپلٹی حدود مراد ہے یا بازار اور بستی وغیرہ؟

جواب: حدودِ میونسپلٹی سے باہر ہونا مراد نہیں، بلکہ مکانات وآبادی سے باہر ہونا مراد ہے،

سوال: شہر کی میونسپلٹی کے اندر مگر بازار وغیرہ کے باہر کوئی کھلی ہوئی جگہ

(میدان) ملے تو اسی کو عیدگاہ بنانے میں شرعاً کوئی مضائقہ ہے یا نہیں؟

الجواب؛ اوپر کے جواب سے معلوم ہو چکا،

سوال؛ میونسپلٹی کی حدود کے اندر عیدگاہ ہونے سے اگر تین ہزار لوگ جمع ہوں اور باہر ہونے سے تین سو ہوں تو کہاں عیدگاہ بنانا افضل ہوگا؟

الجواب، اوپر گذر چکا کہ حدود میونسپلٹی سے باہر ہونا عیدگاہ کا ضروری نہیں، صرف آبادی سے باہر ہونا چاہئے، اور زیادہ دور بھی ہونا ضروری نہیں،

سوال؛ اگر شہر کے لئے اندر یا باہر کوئی عیدگاہ نہ ہو، مگر شہر کے اندر سرکاری یا غیر سرکاری ایسے وسیع میدان ہوں (مدرسہ، اسکول، کالج کے میدان) جہاں باجازت مالک شہر کے لوگ ایک جا ہو کر بہت بڑی جماعت کے ساتھ عیدین کی نماز ادا کر سکتے ہیں وہاں عیدین کی نمازیں میدان میں پڑھنا بہتر ہوگا یا مختلف مساجد میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ادا کرنا بہتر ہوگا؟

الجواب؛ نمازِ عید تو اس صورت میں صحیح ہو جائے گی مگر سنت ادا نہ ہوگی سنت یہی ہے کہ شہر کی آبادی سے باہر عیدگاہ ہو،

سوال؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ شہر کے چاروں طرف شہر پناہ دیوار تھی یا نہیں؟ برتقدیر اول آپ کی عیدگاہ اندر تھی یا باہر؟

الجواب؛ ہاں مدینہ کی شہر پناہ تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیدگاہ شہر پناہ سے باہر تھی، مگر ظاہر یہ ہے کہ شہر پناہ حضور ؐ کے زمانے کے بعد بنائی گئی ہے، حضور ؐ کے زمانہ میں نہیں بنائی گئی، حضور ؐ کے زمانے میں مدینہ کی تین جانب تو کھجور کے درختوں اور عمارتوں سے محفوظ تھیں، اور ایک جانب کھلی ہوئی تھی، اُدھر غزوۂ احزاب میں خندق بنائی گئی، اور عیدگاہ خندق سے باہر فاصلہ پر تھی یا خندق کے اندر تھی اس کی تحقیق نہیں ہو سکی، ہاں خلاصۃ الوفاء میں امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ مسجد نبوی ؐ اور عیدگاہ میں ہزار ذراع کا فاصلہ تھا، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی شہر پناہ جو حضور ؐ کے بعد بنی ہے عیدگاہ اس شہر پناہ کے باہر تھی، (۱۷۷ و ۱۷۸) واللہ اعلم،

سوال؛ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی عیدگاہ شہر کے باہر تھی یہاں شہر سے کیا مراد ہے، اور شہر کے باہر عیدگاہ ہونے میں کیا حکمت ہے، خاصکر

اس طرف عید گاہ کرنے کی کوئی وجہ ترجیح بھی تھی یا یہ ایک اتفاقی بات تھی،

الجواب؛ شہر سے مراد مکاناتِ آبادی ہے، اور شہر کے باہر عیدگاہ ہونے میں اس سے زیادہ اور کیا حکمت مسلمان کو چاہئے کہ حضور ﷺ نے شہر کے باہر عیدین کی نماز پڑھی ہے،

سوال؛ شہر کے اندر عیدگاہ بنانے میں کوئی مضائقہ ہے یا نہیں ؟

الجواب؛ ہاں مضائقہ نہیں مگر سنت کے خلاف ہے، واللہ اعلم ۱۰ ارشوال ۴۶ھ

خطبہ سے پہلے وعظ کہنے کا حکم

سوال (۴۴) ضلع ہر دوئی میں "انجمن تبلیغ وحفاظتِ اسلام" قائم ہے، اور فی زمانہ اس کام کی جس قدر اہمیت ہے ظاہر ہے، مسلمانوں کی بے حسی بھی واقع ہے، چنانچہ مسلمانوں کو حالتِ حاضرہ سے آگاہ کرنے کے لئے اور انجمن کی مالی کے واسطے زید ہر جمعہ کو خطبہ سے قبل کچھ وعظ کہہ کر چندہ طلب کیا کرتا تھا، عمر جو مسجد کا امام ہے اس بات سے مانع ہوا کہ وعظ کہنے اور چندہ طلب کرنے میں ان لوگوں کی سنتوں میں خلل پڑتا ہے، جو خطبہ سے پہلے سنتیں پڑھتے ہیں اور اس نے یہ بھی کہا کہ خطبہ سے پہلے مسجد میں کسی قسم کا بھی وعظ ہو ممنوع ہے، اس لئے زید اپنے فعل سے باز رہا، اور اس سلسلہ میں شعبہ تبلیغ کو جو کچھ چندہ مل جایا کرتا تھا وہ بند ہو گیا نمازِ جمعہ کے بعد لوگ منتشر ہو جاتے ہیں، اس لئے پھر اس کا موقع نہیں ملتا، کہ وعظ کہا جائے یا چندہ فراہم کیا جائے، لہذا جبکہ شعبۂ تبلیغ کی اس قدر اہمیت ہے، اور اس کے لئے نمازِ جمعہ سے پہلے چندہ فراہم کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے، تو ایسی صورت میں شرع کا کیا مسئلہ ہے، آیا قبل خطبہ کوئی وعظ کہا جا سکتا ہے یا نہیں، اور امامِ مسجد کا اس میں مانع ہونا کہاں تک بجا ہے، بینوا توجروا ؟

الجواب؛ خطبہ سے پہلے وعظ کہنا جائز ہے، البتہ اس میں یہ رعایت کی جائے کہ جو وقت خطبہ شروع ہونے کے لئے مقرر ہے اس وقت وعظ شروع کیا جائے تاکہ لوگ سنتوں سے فارغ ہو جائیں، اور جو شخص اس وقت تک بھی سنتوں سے فارغ نہ ہوگا وہ خود کوتاہی کرتا ہے، کیونکہ اب اس کی سنتوں میں خطبہ سے خلل پڑتا جبکہ خطبہ کا وقت آ گیا، البتہ اس صورت میں نماز دیر سے ختم ہوگی، جس میں نمازیوں پر گرانی ہونا محتمل ہے، اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی جمعہ میں عام نمازیوں سے اس کی اجازت لی جائے کہ اگر آپ صاحبوں پر گرانی نہ ہو تو خطبہ سے پہلے خطبہ کے وقت تھوڑی

دیر اس کام کے لئے آپ کا وقت لے لیا جائے، اگر سب یا اکثر اس پر راضی ہوں تو پھر مضائقہ نہیں، حاصل یہ ہے کہ خطبہ سے پہلے وعظ کہنا فی نفسہٖ ممنوع نہیں، اگر کوئی مانع خارجی پیش آجائے اس کا انسداد کردے خواہ اس طریق سے جو اس جواب میں مذکور ہے خواہ کسی دوسری طریق سے، واللہ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ ۱۱ر شوال ۴۶ھ اشرف علی

سوال (۴۵) المنبر اذا بنی فی المحراب ھل یجوز الخطبۃ علیہ ام لا، ذکر فی الجلد الخامس من العالمگیریۃ المصری فی صفحہ ۳۵۵ دخل المحراب لہ حکم المسجد فلو بنی المنبر فی المحراب ویخطب علیہ یوم الجمعۃ ھل یجوز ذلک ام لا، بینوا توجروا؟

الجواب: نعم یجوز فان المنبر للخطبۃ وھی کالصلوٰۃ فلیس فی بنائہ شغل البقعۃ بغیر الصلوٰۃ وقد وضع منبر المسجد النبوی فی المسجد بعد ما بنی المسجد بتمامہ وقد کان موضعہ قبل موضع الصلوٰۃ وصار مشغولا بالمنبر بعد وضعہ فیہ ولکنہ جاز لکون الخطبۃ من الصلوٰۃ، قال الشامی المنبر بکسر المیم من النبر وھو الارتفاع ومن السنۃ ان یخطب علیہ اقتداء بہ صلی اللہ علیہ وسلم، بحر وان یکون علی یسار المحراب قہستانی اھ (ص ۸۶۰ ج ۱) قلت ویسار المحراب اعم من ان یکون داخلہ اوخارجہ فافھم، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۹ر شوال ۴۶ھ

سوال (۴۶) خطیب خطبۂ جمعہ شروع کرنے سے قبل اعوذ باللہ بسم اللہ جہراً پڑھے یا آہستہ .... جمعہ کا خطبہ شروع کرنے سے پہلے خطیب کو بسم اللہ اور اعوذ باللہ بلند آواز سے پڑھنا چاہئے یا آہستہ سے پڑھنا چاہئے، بینوا توجروا؟

الجواب: پہلا خطبہ شروع کرنے سے صرف اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم آہستہ پڑھ لے، جہر نہ کرے، اور بسم اللہ کا پڑھنا منقول نہیں، قال فی الدر ویبدأ بالتعوذ سراً اھ قال الشامی ویبدأ قبل الخطبۃ الاولیٰ بالتعوذ سراً ثم بحمد اللہ تعالیٰ والثناء علیہ والشھادتین والصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والتذکیر العظتہ والقراءۃ قال فی التجنیس والثانیۃ کالاولیٰ الا انہ

یدعو للمسلمین مکان الوعظ قال فی البحر وظاھرہ انہ یسن قراءۃ آیۃ فیھا کالاولیٰ اھ قلت ولکن الظاھر ان یبدأ بالتعوذ قبل الثانیۃ ایضاً سراً بعدم استثنائہ سوی الوعظ، واللہ اعلم،

اس عبارت کے اخیر جزسے قیاساً حیث قال والثانیۃ کالاولیٰ، معلوم ہوا کہ دوسرے خطبہ کو بھی اعوذ باللہ الخ آہستہ پڑھکر شروع کیا جاوے، باقی اعوذ باللہ یا بسم اللہ قبل خطبہ کے یا قبل اذان واقامت کے نماز کے زور سے پڑھنا جیسا کہ آجکل بعض مقامات میں رواج ہے بدعت ہے، واللہ اعلم، ۱۶ ذیقعدہ ۴۶ھ

جمعہ کے دن آخر ظہر پڑھنے کا حکم

سوال (۴۷) اس ملک سندھ میں جو جو بڑے شہر ہیں ان شہروں میں آخر ظہر پڑھی جاوے یا نہ؟ بینوا توجروا اجراً عظیما،

الجواب: بڑے شہروں اور قصبات میں آخر ظہر پڑھنا مکروہ ہے، اور جس جگہ جمعہ کی صحت میں شبہ ہو وہاں جمعہ پڑھنا مکروہ ہے، بلکہ ظہر ہی پڑھنا چاہئے، واللہ اعلم ۲ صفر ۴۷ھ،

اذانِ جمعہ سے قبل وعظ کی ایک صورت کا حکم،

سوال (۴۸) ایک مسئلہ میں اور مولانا کی ڈھیل معلوم ہوئی، وہ مسئلہ یہ ہے جو آجکل تمام عالم اسلام ترکی افغانستان وغیرہ میں معرکۃ الآرا بنا ہوا ہے، یعنی خطبۂ جمعہ زبان مادری میں ہونا چاہئے، اسی تبلیغی کانفرنس میں علیگڈھ کالج کے تین طلبہ آئے ہوئے تھے، انھوں نے ایک روز جس دن مولانا حسین احمد صاحبؒ دہلی گئے ہوئے تھے، ایک سبجیکٹ کمیٹی (باصطلاح جدید) یعنی وہ اشخاص نامزد شدہ جو تجاویز اوّل تیار کرتے ہیں میں پیش کی، یہ کہتے ہوئے کہ مولانا حسین احمد صاحبؒ نے اس کو منظور کر لیا ہے، تجویز کے الفاظ یہ تھے کہ امام مساجد کو ضروری ہے کہ خطبۂ اوّل حالاتِ حاضرہ پر مادری زبان میں پڑھے، اور بعدہ اسی کا ترجمہ عربی زبان میں پڑھے، مگر اس کو مولوی عبدالرحمن خانصاحب نے نامنظور کیا کہ یہ ناجائز ہے، طالب علم مولانا حسین احمد صاحبؒ کا حوالہ دیتے رہے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس مسئلہ کو مولانا آجائیں تو کل پیش کرنا، دوسرے روز مولانا کے روبرو تجویز پیش ہوئی، مولانا نے اس کو منظور کر لیا اس پر مولوی صاحب بولے کہ حضرت یہ تو ناجائز ہے، اس میں گفتگو ہوئی، مولوی صاحب نے فرمایا کہ لزوم مالایلزم کے تحت میں

آتا ہے اگر مفسدہ حال نہیں تو مفسدہ مآل ضرور ہے، جملہ بدعات اسی طرح شروع ہوئیں، اس میں ترمیم کی گئی کہ ہمیشہ نہیں بلکہ گاہ گاہ جبکہ ضرورت ہو، اس پر مولوی صاحب تو خاموش ہوئے مگر اور صاحبوں نے اعتراض کئے کہ مصلی سنتوں کی نیت کہاں باندھے، جب امام تقریر اردو میں کر رہا ہو آیا اس کو ترک کردے، اگر ترک کرتا ہے تو اس کا جزیہ دکھایا جائے اور اگر پڑھتا ہے تو نماز پر خلل پڑتا ہے، اس کا کچھ جواب نہیں دیا گیا کہ خطبہ کے آداب وسنن ہیں مثلاً خلفاء راشدین کا ذکر وغیرہ ترک ہوں گے، اس پر ترمیم ہوئی آج چونکہ مولانا حسین احمد صاحب موجود تھے تو مولوی صاحب وغیرہ تو خاموش اور دیگر اصحاب انجمن مولانا کے مؤید سوائے عبداللہ خان گنج والے اور عبدالرحیم خان کے یہ دو صاحب اڑے رہے، اور بہت دیر تک مولانا سے بحث کی مگر نہ چلی، اور تجویز بالفاظ ذیل منظور ہوئی، تجویز نمبر ۳ منجانب ینگ مسلم ایسوسی ایشن علیگڈھ "اس کانفرنس کی رائے میں اشد ضروری ہے کہ کسی نئی ضرورتوں کے پیش آنے پر خطبہ جمعہ کے مواعظ ونصائح کم از کم دس پندرہ منٹ قبل اذانِ جمعہ بپابندی احکامِ شرعی مخاطبین کی زبان میں بیان کئے جائیں، اس میں اُن مضامین کی تصریح بھی شامل ہوا کرے جو خطبہ عربیہ میں ہوں"

اس تجویز کو مولانا حسین احمد صاحبؒ نے کثرتِ رائے سے منظور کر لیا، اور طے ہوا کہ جلسۂ عام میں اس کو منظور کرایا جائے، چونکہ سبجکٹ کمیٹی میں بندہ کو بولنے کا حق نہ تھا، اس واسطے کہ بندہ اس کا باضابطہ ممبر نہ تھا، اس لئے وہاں سے اُٹھ کر مشورہ ہوا کہ اس تجویز کو جلسہ عام سے رَدّ کرانی چاہئے، مجبوراً ہم نے چالیس پچاس اپنے ہم خیال بنائے اور جلسۂ عام میں، ان کو مختلف جگہوں پر متعین کر دیا، کہ جس وقت یہ تجویز پیش ہو اس کی زبردست مخالفت کی جائے، غالباً ہمارے پروپیگنڈے کا پتہ ان طلباء کو ہو گیا، جو سمجھ گئے کہ ہماری تجویز کی مخالفت ہوگی اور ہم کو جلسۂ عام میں زک ملے گی، اس لئے انھوں نے تجویز واپس لے لی، اور فوراً جلسہ سے اٹھ کر چلے گئے اور کہنے لگے کہ ہم تو مولانا حسین احمد صاحب کا نام دیکھکر آئے تھے کہ خطبہ کو اردو میں کرالیں گے، مگر ان لوگوں نے چلنے نہ دی یہ اُن طلبہ کی نیچریت تھی، اور دیگر تاویلیں محض حیلہ حوالہ کے واسطے تھیں، ورنہ ان کا منشاء اُن نیچریوں کی اتباع کرنا تھا، کہ جنھوں نے مادری زبان میں خطبہ جاری کر دیا ہے، مگر اللہ کا شکر ہے کہ خورجہ سے منظور نہ کراسکے،

الجواب: جن الفاظ سے تجویز نمبر ۳ (خط کشیدہ) کو مولانا نے منظور فرمایا ہے، فی نفسہ اس کے جائز ہونے میں شبہ نہیں، کیونکہ قبل اذان جمعہ کے جو بیان اردو میں ہوگا وہ خطبہ سے خارج ہے، مگر جس صورت سے اس کو منظور کیا گیا ہے اس میں ایک مباح کو اشد ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس کو پاس کر کے گویا ائمہ مساجد کو اس پر مجبور کیا جائے گا اور مباح میں جبر غیر امام کو جائز نہیں، ولا اثم لنا، اور اگر ائمہ مساجد کو مجبور کرنا مقصود نہیں تو پھر قانون بنانے اور اس کو پاس کرنے سے کیا فائدہ، بلا جبر کے تو علماء قبل خطبہ و بعد جمعہ وعظ کہتے ہی ہیں، ۲۴ رجمادی الثانی ۴۷ھ

سوال (۴۹) گاؤں میں نماز جمعہ و عیدین درست نہیں

ہمارے علاقہ میں قدیم سے رواج چلا آتا ہے کہ عیدین کے دن ہر گاؤں میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا نماز عیدین بہ نیت نفل باجماعت ادا کرتے ہیں اور جس گاؤں میں کوئی عالم ہو تو وہاں کچھ وعظ و نصیحت و شوکتِ اسلام کی اچھی رونق ہو جاتی ہے، اب یہاں بعض علماء نے آکر عیدین فی القریٰ کو منع فرمایا ہے، اور کہا تم تمام حنفی المذہب ہو اور عند الاحناف جہاں جمعہ ہے وہاں عید بھی ہے، اور تم جمعہ نہیں پڑھتے ہو اور عیدین (ضرور) ادا کرتے ہو یہ کیا وجہ ہے؟ جب علماء نے یوں کہا تو عوام کالانعام نے شور و غل مچا دیا، جب عید نہیں تو قربانی و فطر کیسا؟ حتیٰ کہ بعضوں نے فطرہ اور قربانی کو ترک کر دیا ہے، اسی موضع میں میرے دادا صاحب اور والد صاحب اور ماموں صاحب جو کہ اچھے عالم ہیں بحسبِ رواج قدیم کے عیدین ادا کرتے چلے آئے ہیں، اب میرے ماموں صاحب یہاں کے امام مسجد ہیں، اور احقر بھی انہی کے ساتھ شامل ہے، جب علماء نے جماعت نوافل و عیدین کو منع کیا، تو مجھ سے بھی مسئلہ پوچھا گیا میں نے بھی منع کیا چنانچہ کتب فقہ حنفیہ میں ہے، مگر بوجہ کمالِ خوشی اس دن کے ان لوگوں نے کچھ توجہ نہ کی، چونکہ میں بحمد اللہ و فضلہ تعالیٰ کچھ طالب علم ہوں میرا عیدین میں شامل ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور وعظ وغیرہ کا اشتیاق رکھتے ہیں، اور میری عدمِ شمولیت ان پر سخت ناگوار گذرتی ہے، اب گذارش یہ ہے کہ اس پُر آشوب زمانہ میں اس رواج کے متعلق کیا ارشاد ہے، آیا اس کو برقرار رکھا جائے یا اس سے حتی الوسع برکنار رہا جائے، اور اس کے ادا کرنے میں عند الشرع کوئی جرم ہے یا نہیں، اب تو پنجاب کا شاید کوئی ہی موضع ایسا ہو گا کہ

عیدین اس میں نہ پڑھی جاتی ہوں، حتیٰ کہ اب جمعہ کا رواج بھی اکثر مقاموں میں بہت پھیل رہا ہے، پس اگر جمعہ کو بھی بغرض تبلیغ احکام کے پڑھا جائے تو جائز ہوگا یا نہیں حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ مصفیٰ شرح مؤطائے امام مالکؒ رحمہ اللہ میں فرماتے ہیں "پس ظاہر آنست کہ در دہ اگر دون از اربعین جمعہ خوانند نماز ایشاں صحیح باشد و متخلفان آثم باشند، انتہیٰ (ص ۱۵۲)

س ۲: اگر نماز عیدین کو جماعت کے ساتھ نہ پڑھا جاوے تو کیا فرادیٰ فرادیٰ ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ س ۳: نفلوں کی جماعت تو احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی شرح تیسیر القاری باب صلوٰۃ النفل بجماعۃ در جواز نفل با جماعت اور فتح الباری باب صلوٰۃ النفل جماعۃً قیل مرادہ النفل المطلق ویحتمل ماھو اعم .... من ذلک، اور شرح الیاس میں ہے، ویصلّی التطوّع بجماعۃ خارج رمضان نیز صحیح بخاری میں ہے لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھذا عیدنا یا اھل الاسلام وامر انس بن مالک بن ابی عتبۃ بالزاویۃ فجمع اھلہ وبنیہ وصلّی کصلوٰۃ المصر وتکبیرھم وقال عکرمۃ اھل السواد یجتمعون فی العید ویصلّون رکعتین کما یصنع الامام وقال عطاء اذا فاتہ العید صلّی رکعتین" انتہیٰ

تو اب عرض ہے کہ فقہاء اس کو مکروہ کیوں لکھتے ہیں، اور اگر مکروہ ہے تو تحریمہ ہے یا تنزیہہ، اگر تحریمہ ہو تو شرعاً اس کا کیا نتیجہ اور سزا و جزاء ہے مفصل مسجل ہو،

الجواب: قال علی رضی اللہ لا جمعۃ ولا تشریق ولا فطر ولا اضحیٰ الا فی مصر جامع او مدینۃ عظیمۃ رواہ ابن ابی شیبہ فی المصنف بسند حسن کما حققتہ فی اعلاء السنن وللہ الحمد، وھو موقوف فی حکم المرفوع لکونہ واردا علیٰ خلاف القیاس المستمر فی الصلوات من عدم تقییدھا بمکان دون مکان قال تعالیٰ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض کلھا مسجداً طھوراً، اثر مذکور کی بناء پر حنفیہ کے نزدیک دیہات میں جمعہ وعیدین کی نماز درست نہیں، بلکہ ان کے لئے قصبات یا شہر ہی محل ہیں، اور عوام کالانعام کی ضد سے احکام شرعیہ نہیں بدل سکتے، اور نفل نماز کی جماعت بالتداعی مکروہ تحریمی ہے،

اور جن احادیث سے جماعت نوافل ثابت ہے وہ صلوٰۃ کسوف اور استسقاء کے باب میں ہیں، یا جماعت بلا تداعی واہتمام تھی، اور حضرت انسؓ کا اثر حنفیہ کے معارض نہیں، کیونکہ حضرت انسؓ کا زاویہ بصرہ کے توابع سے تھا، یا وہاں حضرت انس رضؓ کو اقامت جمعہ وعیدین کی والی بصرہ کی طرف سے اجازت ہوگی، اور حاکم مسلم کی اجازت کے بعد دیہات میں بھی حنفیہ کے نزدیک جمعہ درست ہے جبکہ دیہات میں حاکم کی طرف سے کوئی نائب مقدمات کے فیصلہ کے لئے متعین ہو اور احتمالات کے ہوتے ہوئے استدلال باطل ہے، جیساکہ طلبہ کو معلوم ہے، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے شرح موطا میں حنفیہ کا مذہب نہیں لکھا، بلکہ امام مالکؒ کے کلام کی شرح کی ہے، پس اس سے بھی استدلال صحیح نہیں، ۵ رشوال ۴۷ھ

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا

سوال (۵۰) یہاں مدراس میں ہر جگہ عصا ہاتھ میں لیکر خطیب خطبۂ جمعہ پڑھتا ہے، اس میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ امام کی عدم موجودگی میں لوگوں نے اصرار کیا کہ میں خطبۂ جمعہ پڑھوں اور نماز بھی پڑھاؤں، میں نے عصا لینے سے انکار کیا، اور بغیر عصا لئے پڑھنے کو بخوشی تیار ہوں، تو یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کے علماء کہتے ہیں کہ عصا ہاتھ میں لے کر پڑھنا سنت ہے،"

الجواب، اخذِ عصاء فی الخطبہ کی مسنونیت میں حنفیہ نے اختلاف کیا ہے، خلاصہ میں مکروہ کہا ہے، اور قہستانی نے محیط سے اخذِ عصاء کی مسنونیت نقل کی ہے، شامی ص ۸۶۲ ج باب الجمعہ، دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ اخذ عصا سنتِ مقصودہ نہیں، بلکہ سنتِ مقصودہ اخذ سیف ہے، اس مقام پر جو سیف سے مفتوح ہوا ہو، اور اگر سیف نہ لے تو عصاء کا لینا بالقصد مسنون نہیں، بلکہ محض اعتماد اور سہولتِ قیام کے لئے اخذ عصاء جائز ہے، وہو محمل ما روی ابو داؤد انہ صلی اللہ علیہ وسلم قام ای فی الخطبۃ متوکئاً علی عصاء او قوس اھ ای اتکاء علی احدہما الاعتماد والیسر لا تعبداً، پھر جب عوام نے اخذِ عصاء کو مثل اخذ سیف کے سنت مقصودہ سمجھ لیا تو بعض فقہاء نے اس کو مکروہ کہدیا، کیونکہ مباح کو مسنون سمجھ لینا مکروہ ہے، پس اخذ عصاء فی نفسہٖ جائز ہے، مگر اس کا التزام نہ کیا جائے احیاناً ترک بھی کردیا جائے، واللہ اعلم، ۱۳ ذیقعدہ ۴۷ھ

عید جب جمعہ کے روز ہو تو جمعہ اور عید دونوں واجب ہیں

سوال (۵۱) .... عید اور جمعہ دونوں ایک دن میں ہوجائیں تو کیا دونوں

فرض ہیں یا دونوں واجب یا دونوں سنت، یا ان میں تفصیل ہے، یعنی بعض فرض اور بعض واجب یا سنت، مدلل تحریر فرمائیں، اور دلیل اگر حدیث ہو تو بہتر ہے،

الجواب، قال فی الدر لو اجتمعا ای العید والجمعة لم یلزم الا احدهما کذا فی القهستانی عن التمرتاشی قلت وقد راجعت التمرتاشی فرأیته حکاه عن مذهب الغیر وبصیغة التمریض فتنبه اھ قال فی رد المحتار اما مذهبنا فلزوم کل منهما قال فی الهدایة ناقلا عن الجامع الصغیر عیدان اجتمعا فی یوم واحد فالاوّل سنته والثانی فریضة ولا یترك واحد منهما قال فی المعراج قال عبد البر سقوط الجمعة بالعید مهجور وعن علی ان ذلك فی اهل البادیة ومن لا تجب علیهم الجمعة اھ وسماها فی الجامع الصغیر سنته لان وجوبها ثبت بالسنة حلیه قال فی البحر والظاهر انه لا خلاف فی الحقیقه لان المراد من السنة المؤکدة بدلیل قوله لا یترك واحد منهما وکما صرح به فی المبسوط وقد ذکرنا مرارًا انها بمنزلة الواجب عندنا اھ (ص ۶۸۵ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عید اور جمعہ مجتمع ہو جائیں تو پہلی نماز واجب ہے، یعنی عید کی، اور دوسری یعنی جمعہ کی نماز فرض ہے، اور شہر والوں کو کسی کا ترک بھی جائز نہیں، ہاں دیہات والوں کو جن پر جمعہ وعید واجب نہیں، گنجائش ہے کہ عید پڑھ کر اپنے گاؤں کو واپس ہو جائیں، اور جمعہ نہ پڑھیں، کیونکہ دیہاتی اگر شہر میں آجاوے تو جب تک زوال کے وقت تک شہر میں نہ رہے اُس پر جمعہ فرض نہیں ہوتا، زوال سے پہلے اس کو واپس ہو جانا جائز ہے، کما فی الدر والشامی (ص ۸۶۱ ج ۱) مع ذکر الاختلاف فیه واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ ذی الحجہ ۴۷ھ

تکبیرات ایام تشریق جماعت سے نماز پڑھنے والوں کیساتھ خاص ہیں یا یہ حکم عام ہے،

سوال (۵۲) تکبیر تشریق جماعت سے نماز پڑھنے والوں کے ساتھ خاص ہے یا منفرد وغیرہم کے لئے بھی عام ہے؟

الجواب، بحر میں مجتبیٰ وجوہرہ سے نقل کیا ہے کہ اس مسئلہ میں فتویٰ صاحبین رح کے قول پر ہے کہ ہر فرض نماز پڑھنے والے کے ذمہ تکبیر تشریق واجب ہے، خواہ جماعت سے یا منفرد مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، اس لئے اسی پر عمل احوط ہے، قال فی

الشرنبلالیۃ والدرالمختار وقالا بوجوبہ فور کل فرض مطلقا ولو منفرداً او مسافراً او امرأۃ لانہ تبع للمکتوبۃ الی عصر الیوم الخامس آخر ایام التشریق وعلیہ الاعتماد والعمل والفتوی فی عامۃ الامصار وکافۃ الاعصار اھ وتوھم منہ رجوع قولہ وعلیہ الاعتماد الی مجموع قولھما من بیان الوقت ومن یجب علیہ وعندی ذلک راجع الی بیان الوقت فقط بدلیل ما فی متن الوقایۃ وتجب تکبیرات التشریق من فجر عرفۃ عقیب کل فرض ادی بجماعۃ مستحبۃ علی المقیم بالمصر ومقتدیۃ برجل ومسافر مقتد بمقیم الی عصر العید وقالا الی عصر آخر ایام التشریق وبہ یعمل اھ (ص ۲۴۸ ج ۱) وبما فی الدر وقالا فور کل فرض مطلقا سوأ ادی بالجماعۃ اولا وسواء کان المصلی رجلا او امرأۃ مسافرا او مقیما فی المصر او فی القری الی عصر الخامس من یوم عرفۃ وبہ ای بالتکبیر الی ھذا الوقت وعدم الاقتصار الی عصر العید یعمل الآن احتیاطاً فی باب العبادات اھ (ص ۱۴۶ ج ۱) وبما فی الخلاصۃ قال ابن مسعودؓ یکبر الی صلوٰۃ العصر من اول یوم النحر وبہ اخذ ابو حنیفۃ رحؒ وقال علیؓ الی صلوٰۃ العصر من آخر ایام التشریق وھو ثلاث وعشرون تکبیرۃ وبہ اخذ ابو یوسف ومحمد وعلیہ الفتوی وعلیہ عمل الناس الیوم ثم ھذا التکبیر علی اھل الامصار فی الصلوات المکتوبات المؤدیات وبالجماعۃ مستحبۃ حتی لا یجب علی النسوان وان صلین بجماعۃ وعندھما علی کل من صلی المکتوبۃ فی ھذہ الایام فعلیہ التکبیر اھ (ص ۲۱۵ ج ۱) ولم یذکر الفتوی علی قولھما فی ذلک ومثلہ فی العالمگیریۃ ایضا وصنیع صاحب الھدایۃ یدل علی ترجیح قول الامام فی بیان من یجب علیہ لانہ قدم قول الامام واخر دلیلہ واللہ تعالیٰ اعلم واصحاب المتون کالکنز والقدوری اقتصروا علی ذکر قول الامام فی بیان من یجب علیہ فھو المذھب ولو کان الراجح قولھما فی ذلک لذکروہ کما ذکروا قولھما فی الوقت نعم نقل فی البحر عن المجتبی والجوھرۃ ان الفتوی علی قولھما فی من یجب علیہ ایضا فلیحرر وبالجملۃ الاحوط العمل بقولھما، واللہ اعلم، ۲۴ محرم ۳۸ھ

جو شخص یہ کہتا ہو کہ یہاں (ہندوستان میں) جمعہ ادا نہیں ہوتا اس لئے ہم ظہر احتیاطی ادا کرتے ہیں، اسکے پیچھے نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں

سوال (۵۳) ایک امام صاف کھلم کھلا کہتا ہے کہ یہاں جمعہ ادا نہیں ہوتا ہے اس واسطے ہم ظہر احتیاطی بھی ادا کرتے ہیں، اس کے پیچھے جمعہ کی نماز درست ہے یا نہیں؟ **الجواب**: یہ مسئلہ اقتدا بالشافعی فی الوتر کی نظیر ہے، اور اس میں اختلاف ہے، .... قال فی الارشاد انہ لا یجوز اصلا باجماع اصحابنا لانہ اقتداء مفترض بالمتنفل ۱۲ شامی ووافقہ ابن الہمام فی الفتح، مگر اصح یہ ہے کہ اقتدا صحیح ہے بشرطیکہ امام نے صرف وتر کی نیت کی ہو، سنت وتطوّع بالوتر کی نیت نہ کی ہو، صرح فی التجنیس ان الامام ان نوی الوتر وھو یراہ سنتہ جاز الاقتداء کمن صلی الظھر خلف من یری الرکوع سنۃ وان نواہ بنیۃ التطوع لا یصح لانہ اقتداء المفترض بالمتنفل اھ شامی ص ۶۹۹ ج ۱ وفی التنویر صح الاقتداء فیہ بشافعی لم یفصلہ بسلام علی الاصح للاتحاد وان اختلف الاعتقاد،

اس جزئیہ کا مقتضا یہ ہے کہ قول اصح پر اس شخص کے پیچھے نماز جمعہ صحیح ہے، جبکہ وہ جمعہ کی نیت کرتا ہو، نفلِ جمعہ کی نیت نہ کرتا ہو، اور ظاہر یہی ہے کہ جو امام ہندوستان میں جمعہ کو صحیح نہیں مانتا وہ نمازِ جمعہ پڑھنے کے وقت تنفل بالجمعہ کا قصد نہیں کرتا، بلکہ فرضِ جمعہ یا مطلقِ جمعہ کی نیت کرتا ہے، اس لئے اس کے پیچھے جو جمعہ پڑھے گئے ہوں اُن کی قضاء لازم نہیں، ہاں جو تصریح کردے کہ میں تنفل بالجمعہ کی نیت کرتا ہوں اس کے پیچھے نمازِ جمعہ صحیح نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۴ صفر ۱۳۴۸ھ

مسجد محلہ میں بانی یا کسی دوسرے شخص کا نماز جمعہ ادا کرنے سے منع کرنے کے متعلق اذنِ عام کے فوت ہونے پر شبہ کا جواب،

سوال (۵۴) .... ایک محلہ میں قریب ستر برس سے ایک پختہ مسجد واقع ہے، جس میں قریب ستر آدمی اس محلہ کے اور سات آٹھ آدمی دوسرے محلہ کے جمعہ کے دن نمازِ جمعہ ادا کرتے ہیں، گذشتہ رمضان شریف کے بعد ایک دن اکثر کی رائے سے کسی طالب علم کی امداد کے لئے حسبِ توفیق دو چار آنہ پیسے لانے کے لئے مصلیوں کو کہدیا گیا تھا، دوسرے جمعہ کو بعد ادائے نماز جمعہ کے چندہ مذکورہ وصول ہونے لگا، لیکن دوسرے محلہ کے سات آٹھ آدمیوں نے کہا کہ ہمارے گھر جانے سے ہم دیں گے، ورنہ نہیں، اس بات پر بانیِ مسجد کے دو پوتوں

ہیں سے ..... صاحب نے (جو چھوٹے ہیں اور متولی مسجد مذکور بھی نہیں ہیں، مگر دنیوی سرداروں میں سے ایک سردار تھے) زجراً و تنبیہاً کہا "تم لوگ ہمیشہ امرِ خیر میں ہمارے ساتھ شرکت نہیں کرتے ہو، اس مسجد میں نماز پڑھنے مت آؤ"، لیکن اس کے بعد کے جمعہ میں ان ممنوعین سے دو تین آدمی اس مسجد میں نماز پڑھنے آئے، اور بلا روک ٹوک بدستور سابق نمازِ جمعہ پڑھی، اور اس منع کا تذکرہ تک نہ ہوا، اور باقی تین چار آدمی اس مسجد میں نہ آئے، دوسری مسجد میں جا کر نمازِ جمعہ ادا کی اور اس بات پر اڑے رہے کہ جب تک مانع ہم لوگوں کو بلا کر نہ لے جائے ہم لوگ اس مسجد میں نہیں جاتے، اب ویسا ہی کیا گیا،

لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ گذشتہ سات آٹھ مہینہ تک جو ممنوعین اس مسجد میں نہیں آئے اس سے بوجہ فوت ہونے شرط اذنِ عام باقی مصلّیوں کی نمازِ جمعہ شرعاً درست ہوئی یا نہیں، اور اس قسم کے منع سے اذنِ عام مرتفع ہو گیا تھا یا نہیں؟ اس میں حق کیا ہے، اور اذنِ عام وقتِ جمعہ کے مشروط ہے یا قبل جمعہ کے، بینوا توجروا؟

الجواب من جامع امداد الاحکام صورتِ مسئولہ میں صرف ..... صاحب کے منع کرنے سے اذنِ عام فوت نہیں ہوا، اذنِ عام ایسے شخص کی ممانعت سے فوت ہوتا ہے، جس کی مخالفت پر عوام قادر نہ ہوں مثلاً حاکم وقت منع کر دے، اور حاکم وقت کی ممانعت سے بھی اذنِ عام اس وقت فوت ہوتا ہے جبکہ کسی بستی میں مطلقاً جمعہ پڑھنے سے منع کر دے، اور اگر کسی ایک جگہ سے منع کرے اور دوسری جگہ سے منع نہ کرے تو اذنِ عام فوت نہیں ہوتا، نمازِ جمعہ اس بستی کی ہر مسجد میں صحیح ہوگی، اور ..... صاحب کی یہ حرکت خلافِ شرع تھی، کہ ان سے چندہ وصول کرنے پر ایسا جبر کیا، اور نمازیوں کو نماز سے روکا، اس کو علانیہ اپنی حرکت سے توبہ کرنی چاہئے، اور خدا تعالیٰ سے استغفار کرے، واللہ اعلم بالصواب، ظفر احمد عفا عنہ

الجواب من جامع تتمۂ امداد الاحکام ظاہر یہی ہے کہ صرف زبان سے کہہ دینے کی وجہ سے اذنِ عام مرتفع نہیں ہوتا، الّا آنکہ کہنے والا صاحبِ حکومت ہو، اور فعلاً منع کرنا حاکم و غیر حاکم ہر دو کی جانب سے ہو سکتا ہے، یعنی اگر غیر حاکم بھی مسجد کا دروازہ بند کر دے، یا پہرہ زبردست دروازہ پر لگا دے تو اذنِ عام فوت ہو جائے گا، اور یہ سب تفصیل جب ہی جبکہ وہاں

ایک ہی جمعہ ہوتا ہو، اور اگر دوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو تو بہر حال جمعہ جائز ہو جاوے گا، فی الشامی قلت وینبغی ان یکون محل النزاع ما اذا کانت لا تقام الا فی محل واحد اما لو تعددت فلا لانہ لا یتحقق التفویت کما افادہ التعلیل تامل پس صورتِ مسئولہ میں جمعہ صحیح ہوتا رہا، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۰ رج ۲ ۴۸ھ

جہاں ایک ہی جگہ نمازِ جمعہ ہوتی ہو وہاں بعض افراد سے نمازِ جمعہ فوت ہو جاوے تو ان کو کیا کرنا چاہئے؟؟

سوال (۵۵) یہاں جمعہ کی نماز ایک ہی جامع مسجد میں ہوتی ہے، گاہ گاہ بعض بعض نمازیوں کے پہونچنے سے قبل ہی نمازِ جمعہ ختم ہو جاتی ہے، اب وہ لوگ دوسری مسجد میں جا کر اذان و اقامت کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کر سکتے ہیں یا نہیں، یا جمعہ کی نماز ادا کریں یا فرادیٰ فرادیٰ ظہر کی نماز پڑھیں، جو کچھ شریعت کا حکم ہو اس سے اطلاع دیجئے،

الجواب: فی الدر المختار (وکذا اھل مصر فاتھم الجمعۃ) فانھم یصلون الظھر بغیر اذان ولا اقامۃ ولا جماعۃ وقال الشامی الظاھر ان الکراھۃ ھنا تنزیھیۃ لعدم التقلیل والمعارضۃ المذکورین ویؤیدہ ما فی القھستانی عن المضمرات یصلون وحدانا استحبابا اھ ص ۸۵۶ ج ۱ وفی البحر الرائق (ص ۱۵۲ ج ۲) قال فی الظھیریۃ جماعۃ فاتتھم الجمعۃ فی المصر فانھم یصلون الظھر بغیر اذان ولا اقامۃ ولا جماعۃ اھ وھکذا فی الخلاصۃ، ص ۲۱۱ ج ۱)

قواعد سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مصر میں کم از کم چار شخص جمعہ سے رہ جاویں تو وہ جمعہ کی نماز دوسری مسجد میں پڑھ لیں اور ان سب میں وجوبِ جمعہ کی شرطیں پائی جاتی ہوں تو جمعہ واجب ہو، اور اگر فقط صحت کی شرطیں ہوں تو واجب نہ کہا جاوے، لیکن پڑھیں تو صحیح ہو، مگر جزئیہ کوئی نہیں ملا، بلکہ روایاتِ مذکورہ بالا سے بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں تنہا تنہا ظہر پڑھیں، لیکن خلاف قواعد ہونے کی وجہ سے ان روایتوں میں تاویل کی جاوے گی، اور میرے نزدیک ان روایتوں میں کئی تاویلیں ہو سکتی ہیں اوّل تو یہ کہ ان روایتوں کو مبنی کہا جاوے تعددِ جمعہ کے عدمِ جواز پر اور جب مفتیٰ بہ جواز تعدد ہے تو یہ روایت بھی مفتی بہ نہ رہے گی، وہذا ما قالہ سیدی وہو وجہ وجیہ، دوسرے یہ کہ جماعت کے لفظ کو محمول کیا جاوے چار سے کم پر، یعنی دو یا تین آدمی رہ جاویں تو وہ جمعہ نہیں

پڑھ سکتے بوجہ فوت ہونے شرط جماعت کے بلکہ تنہا تنہا ظہر پڑھیں، کیونکہ جمعہ کے دن مصر میں ظہر کی جماعت مکروہ ہے، اور یہ تاویل گو خلاف ظاہر ہے لیکن زیادہ بعید بھی نہیں، تطبیق روایات میں اس سے زیادہ بعید کا تحمل کر لیا جاتا ہے، اوّل یہ دو تاویلیں لکھنے کا ارادہ تھا، کیونکہ اور کوئی تاویل ذہن میں نہ تھی، لیکن عین لکھنے کے وقت ایک تیسری تاویل سمجھ میں آئی، احقر کے نزدیک وہ تنہا کافی وافی ہے، اس لئے اسی پر اکتفاء کا ارادہ ہوا تھا، لیکن تتمیم فائدے کے واسطے یہ دونوں بھی درج کر دیں، ممکن ہے کسی اہلِ علم کے نزدیک ان میں سے کسی کو ترجیح ہو، وہ یہ ہے کہ یہ روایت محمول ہے اس جگہ پر جہاں حکومتِ اسلامیہ کی طرف سے قاضی وغیرہ مقرر ہو اگر وہاں جمعہ فوت ہو جاوے تو بدون اذنِ حاکم دوسرا جمعہ نہیں ہو سکتا، باقی ہمارے ملک میں چونکہ تقررِ امام کا مدار تراضی مسلمین پر ہے، اس لئے یہ باقی ماندہ لوگ کسی کو امام بنا سکتے ہیں، اور جمعہ پڑھ سکتے ہیں، کما قال صاحب الخلاصہ (ص ۲۰۸) ولو اجتمعت العامۃ علی تقدیم رجل لم یامرہ القاضی لم یجز ولم یکن جمعۃ وان لم یکن ثمہ قاضی ولا خلیفۃ المیت فاجتمعت العامۃ علی تقدیم رجل للضرورۃ وفی الدر المختار (ونصب العامۃ) الخطیب (غیر معتبر مع وجود من ذکر) اما مع عدمھم فیجوز للضرورۃ وفیہ ایضا وفی النعجۃ فی تعدد الجمعۃ لابن جرباش انما یشترط الاذن لاقامتھا عند بناء المسجد ثم لا یشترط بعد ذلک، غرضیکہ اہلِ مصر کو تنہا تنہا ظہر کا حکم جب ہے کہ جمعہ سے کوئی مانع ہو، ویؤید ہذا ما فی العالمگیریۃ ونصہ وکرہ جماعۃ الظہر لاہل المصر اذا لم یجمعوا لمانع (ص ۹۵ ج ۱) اب اس بحر وغیرہ کی روایت متقدمہ کی وجہ سے تو کوئی خلجان نہیں، والحمد للہ علیٰ ذلک، الآن وجوب الجمعۃ فی ہذا الصورۃ فی دیارنا، یقتضی وجوب طلب الاذن فی دار الاسلام وہو غیر منصوص فی کتب الفقہ ایضا ویمکن الفرق بالتعذر فی طلب الاذن من السلطان وغیرہ دون نصب امام الجمعۃ فلیتامل، لیکن حالتِ مسئولہ کے متعلق جزئیہ نہ ملنے کے باعث بہتر ہے کہ دوسری جگہ بھی تحقیق کر لیا جاوے اور اس جواب کو بھی وہاں بھیجدیں تاکہ کسی قدر سہولت کا باعث ہو سکے، یہ دوسری مسجد میں جمعہ پڑھنا تو جب کہ چار آدمی جمعہ سے رہ جاویں، اور اگر چار سے کم یعنی دو تین آدمی رہ جاویں تو وہ ظہر پڑھیں اور الگ الگ پڑھیں جماعت نہ کریں، اس کے بعد مجموعۃ الفتاویٰ میں مولانا عبدالحی

کا فتویٰ بھی اس تحریر مذکور کے مطابق پایا، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، خانقاہِ امدادیہ ۹ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

فنائے مصر میں نمازِ جمعہ کی ایک صورت کا حکم

سوال (۵۶) - . . . .

(الف) سلیم سرائے ایک بستی ہے کہ جس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، اس سے متصل اور بھی بستیاں ہیں منجملہ ان کے میرا موضع بھی ہے (موضع ہر وارہ) مگر اور بستیوں میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ وہ بالکل ہی متصل ہیں، ایک مکان کا بھی فصل نہیں، اور میرا موضع قریبًا دو بیگہ کے فصل سے ہے، یا زیادہ سے زیادہ اتنا جیسا کہ خانقاہ شریف تھانہ بھون سے عیدگاہ ہے، لیکن یہ موضع حقیقتًا گاؤں ہے اس میں کوئی علامت مصر کی یا کثرتِ آبادی نہیں، تقریبًا پانچسو کی آبادی ہے، پس اس صورت میں اس موضع میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

(ب) شہر سے جو سڑک بیرونِ شہر کو جاتی ہے، اس پر اکثر اینٹوں کے بھٹے اور چونہ کی بھٹیاں سڑک کے کنارہ آبادیٔ شہر سے تین چار میل تک برابر ہوتے ہیں تو جہاں تک یہ بھٹے ہیں، یہ فنائے مصر میں داخل ہے یا نہیں؟

(ج) اگر یہ فنائے مصر میں داخل ہے تو وہ مواضعات جو بالکل ان بھٹوں سے متصل اور محاذی ہیں، کیا ان میں بھی جمعہ ہوسکتا ہے؟

الجواب: (۱) اگر ایسا اتصال ہو کہ دیکھنے والا اس گاؤں کو سلیم سرائے کا ایک محلہ سمجھے اور عام لوگ بستی سلیم سرائے کو اور ان سب بستیوں کو ایک ہی بستی سمجھتے ہوں تو ہر وارہ میں صحیح ہے ورنہ نہیں، اور پورا فیصلہ کسی مفتی کو موقع کا معائنہ کرا کر ہوسکتا ہے۔

(۲) فقہاء نے فنائے بلد کو بحکم بلد اس لئے فرمایا ہے کہ اس سے مصالح اہلِ بلد کے متعلق ہوتی ہیں، اور اہلِ بلد سے مراد عام اہلِ بلد ہیں، نہ خاص، اور فنائے بلد کی مثال میں میدان گھوڑ دوڑ اور غلہ گاہنے کے میدان، قبرستان، عیدگاہ، موضع تبریض وغیرہ کو بیان کیا ہے، جس میں قبرستان، عیدگاہ موضع تبریض تو ایسے ہیں جن سے عام اہلِ بلد کا تعلق ظاہر ہے، مگر گھوڑ دوڑ کے میدان اور غلہ گاہنے کے میدان سے عام اہل بلد کا تعلق نہیں، صرف گھوڑے سواروں اور کاشتکاروں کو تعلق ہے، مگر اس لحاظ سے کہ دیکھنے والے

گھوڑے والوں کے سوا بھی ہوتے ہیں، اسی طرح غلہ کاٹنے کے وقت کاشتکاروں زمینداروں کو مزدوروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور مزدوری پیشہ لوگ ہر شہر میں زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی فقہاء نے مصالح عامہ میں داخل کرلیا ہے، اسی لئے میرے نزدیک اینٹوں اور چونہ کے بھٹوں کو بھی مصالح اہل بلد میں داخل سمجھنا چاہئے، گو بظاہر ان سے تعلق بھٹہ لگانیوالوں ہی کو ہے، مگر درحقیقت مزدوری پیشہ لوگوں کو بھی تعلق ہے، اس لئے میں اس کو بھی فناء مصر کے حکم میں سمجھتا ہوں، مگر چونکہ یہ میرا قیاس ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ میں تحقیق تھانہ بھون سے بھی کرلی جائے،

(۳) ہاں، المجیب ظفر احمد عفا اللہ عنہ از رنگون، ۱۵ جمادی الاول ۵۱ھ

الجواب من الخانقاہ الامدادیۃ (۱) جواب سوال اول صحیح ہے، کما ہو المصرح فی البحر حیث قال واختلفوا فیما یکون من توابع المصر فی حق وجوب الجمعۃ علی اہلہ فاختار فی الخلاصۃ والخانیۃ انہ الموضع المعد لمصالح المصر متصل بہ ومن کان مقیما فی عمران المصر واطرافہ ولیس بین ذلک الموضع وبین عمران المصر فرجۃ فعلیہ الجمعۃ ولو کان بین ذلک الموضع وبین عمران المصر فرجۃ من مزارع او مراع کالقلع ببخاری لاجمعۃ علی اہل ذلک الموضع وان سمعوا النداء ج۲ ص۱۴۲

(۲) سوال دوم کے جواب میں غور کیا گیا اور حضرت مدظلہ العالی سے بھی دریافت کیا یہی طے ہوا کہ محض بھٹوں کی وجہ سے کوئی جگہ فناء مصر نہیں بن سکتی، بھٹے زائد سے زائد نظیر ہیں کھیتی کی اور کھیتی فناء میں داخل نہیں، جیسا کہ روایت مذکورہ بالا سے واضح ہے،

دنیز علامہ شامی نے فرمایا ہے (تحت قول الدر والمختار للفتویٰ تقدیرہ بفرسخ) اقول وبہ ظہر صحتہا فی تکیۃ السلطان سلیم بمرجۃ دمشق وکذا فی مسجدہ بصالحیۃ دمشق فانہما من فناء دمشق بما فیہا من الترتبۃ بسفح الجبل وان انفصلت عن دمشق بمزارع لکنہا قریبۃ لانہا علی ثلث فرسخ من البلدۃ (ص ۷۸۳ ج ۱)

اور کما حررہ ابن الکمال کے تحت میں تحریر فرمایا ہے: حیث قال واعتبر بعضہم فیہ الاتصال وقد خطأہ صاحب الذخیرۃ قائلاً فعلی قول ہذا القائل لاتجوز اقامۃ الجمعۃ ببخاری فی مصلی العید لان بین المصلی وبین المصر

مزارع ووقعت هذه المسئلة مرة وافتى بعض مشائخ زماننا بعدم الجواز ولكن هذا ليس بصواب فان احدا لم ينكر جواز الصلوٰة العيد فى مصلى العيد بخارى لامن المتقدمين ولا من المتأخرين وكما ان المصر اوفناءه شرط جواز الجمعة فهو شرط جواز صلوٰة العيد اھ (صفحہ مذکورہ بالا) ان دونوں عبارتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی فناء میں داخل نہیں، کما لایخفی، دراصل فناء وہ ہے جو آبادی یعنی سکونت کی ضروریات سے ہو، کیونکہ کچھ ضروریات اہلِ بلد کی بلد میں پوری نہیں ہو سکتیں وسعت نہ ہونے وغیرہ کی وجہ سے، اس لئے آبادی سے باہر ان ضروریات کے لئے جگہ مقرر کی جاتی ہے اور اس جگہ کو ایک قسم کی آبادی سمجھا جاتا ہے، لہٰذا وہ ملحق بالبلد ہو کر اقامتِ جمعہ کا محل ہو جاتی ہے، پس ضروریات سے خاص وہ ضروریات مراد ہیں جو متعلق بالسکنیٰ ہوں سب ضروریات مراد نہیں، ورنہ تمام کھیت، باغات اور لکڑیوں کے جنگل وغیرہ کا فناء میں داخل ہونا لازم آتا ہے، ولا قائل بہ،

(۳) تیسرا نمبر متفرع ہے، نمبر دوم پر اس لئے اس میں بھی ہمیں اختلاف ہے، واللہ اعلم بالصواب، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ تھانہ بھون ۱۵ رجمادی الاخری ۱۳۵۱ھ

سوال (۵۷)

آبادی سے باہر عیدگاہ تعمیر کی گئی، پھر وسعتِ آبادی کے سبب آبادی میں آجائے تو اسکی صحرائیت باطل ہوگئی یا نہیں

عرصہ چالیس پچاس سال کا گزرا کہ مسلمانوں نے قصبہ کے باہر ایک عیدگاہ تعمیر کی اور چہار دیواری تعمیر کر کے محفوظ کر دی، اور آج تک تمام مسلمان اس میں بلا اختلاف نمازِ عیدین ادا کرتے رہے، کچھ عرصہ سے اس کے تین اطراف میں مکانات تعمیر ہو گئے، (جس میں بعض ابھی احاطہ ہی ہیں اور بعض مکانات ہیں، اب کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ نمازِ عیدین صحراء میں پڑھنی افضل ہے، اور مکانات تعمیر ہونے سے صحرائیت باطل ہوگئی، لہٰذا اس عیدگاہ کو چھوڑ کر صحراء میں نماز پڑھنی چاہئے، اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب یہ عیدگاہ تعمیر ہوئی تھی تو اس وقت صحراء میں تھی وہی حکم باقی رہے گا اور تعمیرِ مکان کی وجہ سے اس عیدگاہ کو معطل نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ مصلیٰ نبوی کے پاس کثیر بن الصلت رضی کا مکان اور حضرت معاویہ رضی کا مکان تعمیر ہوگیا تھا، لیکن صحابہ کرام اس میں نمازِ عیدین برابر ادا کرتے رہے، نیز مکہ معظمہ میں باوجود بستی ہو جانے اب تک نماز

مسجد ہی میں ہوتی ہے، بواڑ غیر ذی ذرع کا حکم اب تک باقی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

تنقیحات: (۱) کیا صحراء میں جانے کا حکم ہر حال میں ہے، (۲) اس عیدگاہ موجودہ کو کس کام میں لانا چاہتے ہیں، (۳) کیونکہ مصلےٰ نبویؐ کے پاس الخ کا حوالہ مع عبارت کتاب درج کیا جاوے؟

جواب تنقیحات: (۱) کہتے ہیں کہ اگر عذر شرعی (بارش وغیرہ) نہ ہو تو صحراء میں جانا چاہئے، (۲) عید کی نماز صحراء میں پڑھی جائے، اس کے بعد اگر ضرورت ہوگی تو مجبور یا بیمار لوگ اس میں نماز پڑھیں گے یا جو مصرف نکل آوے، (۳) کتاب الاُم میں امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ مکہ والے برابر اسی مسجد میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے، اور صحراء کے بعد بستی کا ہونا آیت سے معلوم ہوتا ہے، و نیز شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مدارج النبوۃ میں تحریر فرماتے ہیں "واہل مکہ کہ ہم از زمن اوّل عادت بریں دارند کہ در مسجد گذارند و بصحراء بیروں نروند الآن خود اہل مدینہ نیز در مسجد میگذارند و در مفارقت از شرف و برکت راضی نمیشوند و وسعت مسجد شریف الآن بروجہ کفایت است بآبادانیِ ایں بلدۂ شریفہ بخلاف زمان مبارک وے صلی اللہ علیہ وسلم کہ وسعت مسجد کمتر بود و آبادانی شہر بیشتر، انتہیٰ، مدارج النبوۃ جلد اوّل، صفحہ ۴۴۸،

الجواب: اس کے متعلق کہیں تصریح تو ملی نہیں، مگر قواعد کا مقتضا یہ ہے کہ اگر نماز نمازِ عید کسی ایسے میدان میں ہوتی ہو جو بالخصوص نماز عید کے لئے وقف نہ ہو، بلکہ مصالح عامہ کے واسطے ہو، اور وہ آبادی میں شامل ہو جاوے، تب تو اس جگہ کو ترک کر کے کسی دوسرے میدان میں جو آبادی سے خارج ہو، نمازِ عیدین ادا کرنا سنت ہے، اور اگر خاص نمازِ عید کے لئے کوئی جگہ وقف ہو، جیسا کہ سوال میں درج ہے، اور اکثر شہروں میں دستور ہے تو عیدگاہ آبادی میں آجانے سے ترک نہ کی جاوے گی، کیونکہ مصالحِ وقف کی رعایت ضروری ہے گو اس کو صحراء نہیں کہہ سکتے، مگر سنتِ اصلیہ کو حفاظتِ وقف کی وجہ سے ترک کیا جاویگا لان تحفظ الوقف واجب وایتان الواجب اہم من فعل السنۃ، واللہ اعلم،

اور سوال میں جو دو دلیلیں لکھی ہیں ان میں سے دلیل اوّل تو ناکافی ہے، اور دلیل دوم بالکل ہی ناقابلِ ذکر ہے، دلیل اوّل اس واسطے ناکافی ہے کہ کثیر بن الصلت[۱] اور حضرت معاویہؓ

[۱] سائل نے جو حوالہ دریافت کیا گیا تھا جواب تنقیح میں اس سے تعرض نہیں کیا گیا، مگر فتح الباری میں دیکھا تو کثیر بن صلت کا مکان ہونا تو مذکور ہے مگر حضرت معاویہ رضؓ کے مکان کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ۱۲ منہ

کے ایک دو مکان بن جانے سے اُس جگہ کو آبادی قرار نہیں دے سکتے، بلکہ چند مکان بننے کو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مکان جنگل میں ہیں، آبادی اُس وقت ہوتی ہے جبکہ تمام اطراف میں مکانات ہو جائیں کما لا یخفی، اور مدارج النبوۃ کی عبارت کو صورت مبحوث عنہا سے کوئی تعلق نہیں وہ صرف اہلِ مدینہ کے فعل کی ایک تاویل ہے، ورنہ اس سے ایک سطر قبل شیخ خود مدارج النبوۃ میں تحریر فرما چکے ہیں "ودر بعضے امصار کہ در مساجد میگذارند خلاف سنت است مگر آنکہ عذرے باشد" علاوہ ازیں یہ خرابی ہے کہ اگر شیخ کی توجیہ مذکور فی السوال کو تسلیم کیا جاوے تو سنیتِ صحراء بالکل اُڑ جاتی ہے، ولا قائل بہ من الفریقین بلکہ صحراء میں نماز عید کی سنیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اختلاف ہو کہ صورت مسئولہ میں یہ جگہ صحراء کے حکم میں ہے یا نہیں، ونیز یہ کہ اگر صحراء نہیں تو قابلِ ترک ہے یا نہیں، خلاصۂ جواب کا یہ ہوا کہ حالت موجودہ میں عیدگاہ کو ترک کرنے کی ہمارے نزدیک گنجائش نہیں ہے، فقط کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

۲، ذوی الحجہ ۱۳۵۱ھ

الجواب صحیح اشرف علی ۲، ذیحجہ ۱۳۵۱ھ

جمعہ فی القریٰ کے متعلق مذہب امام اعظم کی تحقیق؛ از حبیب احمد کیرانوی

سوال (۵۸۱) فاقہم غیر مقلدین اور انکے متبعین نے جمعہ فی القریٰ کے باب میں امام المجتہدین کو نشانۂ ملامت بنا رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں امام صاحب کے اجتہاد کی حقیقت اغیار تو کیا خود ان کے اتباع بھی کما حقہ نہیں سمجھے، سو ان کے اجتہاد کی حقیقت جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور انشاء اللہ صحیح بھی ہوگی یہ ہے: "کہ جمعہ کے روز اصالۃً ظہر فرض ہے، اور جمعہ اس کا قائم مقام پس جس صورت میں جمعہ کی صحت یقینی ہے اس صورت میں وہ قائم مقام ظہر ہو کر مسقطِ فرض ظہر ہو کر یقیناً ہو سکے گا، اور جس صورت میں اس کی صحت مشتبہ ہو اس صورت میں وہ قائم مقام ظہر اور مسقطِ فرض ظہر نہ ہوگا" اب امام صاحبؒ نے دیکھا کہ صحتِ جمعہ فی المدن مع وجود الامام او نائبہ مجمع علیہ ہے، اس لئے یہ جمعہ ضرور قائم مقام فرض ظہر اور مسقط ظہر ہے اور صحتِ جمعہ فی القریٰ یا فی المدن بلا امام یا نائبِ امام مشتبہ ہے، اس لئے انھوں نے فرمایا کہ یہ جمعہ مسقطِ فرضِ ظہر نہیں ہے، اور جب وہ مسقطِ فرضِ ظہر نہیں تو جائز بھی نہیں، لان الجمعۃ الغیر المسقطۃ للظہر لم یعرف مشروعیتہا، پس یہ مبنیٰ ہے ان کے اس حکم کا کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں، اور نہ اُن شہروں میں جن میں امام یا نائبِ امام نہ ہو، سو یہ بات ایسی نہ تھی کہ امام الائمہ کو نشانۂ ملامت بنایا جاتا، بلکہ درحقیقت اپنی اس وقت فہم اور کمال تورع

واحتیاط پر آفرین کے مستحق تھے، مگر خدا برا کرے جہالت اور تعصب کا کہ انھوں نے امام صاحبؒ کے کمالات کو عیوب بنا دیا، لیکن اگر ہم اس وقت فہم سے بھی قطع نظر کریں اور صرف آثار ہی کو پیش نظر رکھیں تب بھی امام صاحب ہی کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، کیونکہ حضرت علیؓ اور حضرت حذیفہؓ کی روایات سے نہایت صحت اور صفائی کے ساتھ اشتراطِ امصار وَمُدن ظاہر ہے، برخلاف اس کے جو آثار انکے مقابلہ میں پیش کئے جاتے ہیں، ان سے عدمِ اشتراط اس صفائی کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً وہ جواثی والی روایت سے استدلال کرتے ہیں، لیکن اس میں قریہ کا لفظ محلِ کلام ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد گاؤں ہے ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد مطلق بستی ہے، چنانچہ تمام قرآن میں یہ لفظ مطلق بستی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، لہٰذا یہ روایت وضاحت میں حضرت علیؓ وحذیفہؓ کے برابر نہیں،

اسی طرح وہ الجمعۃ واجب علیٰ کل مسلم سے استدلال کرتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ اس کے معنی واجب بشرائطہٖ ہیں، لہٰذا یہ روایت بھی مفید مدعا نہیں، نیز وہ حضرت عمرؓ کے قول جمعوا حیثما کنتم سے استدلال کرتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ اس میں خطاب ولاۃ کو ہے نہ کہ عوام کو، نیز اس میں اتنا عموم مراد نہیں جتنا کہ وہ مراد لیتے ہیں، کیونکہ مجتہدین کے نزدیک صحاریٰ وبحار وغیرہ مستثنیٰ ہیں اور غیر مقلدین کے نزدیک اراضی مغصوبہ ومقامات نجس وغیرہ مستثنیٰ ہیں، پس جبکہ یہ لفظ اپنے عموم پر باقی نہیں ہے، تو اس کے عموم سے استدلال صحیح نہیں، پس جبکہ یہ اور اسی قسم کی روایات وضاحت میں حضرت علیؓ وحذیفہؓ کی روایات کو ترجیح ہوگی، کیونکہ جو لوگ اشتراطِ مصر کے قائل ہیں اُن کے قول کا مبنیٰ علم بالدلیل ہے، اور جو لوگ اشتراط کے قائل نہیں ان کے قول کا مبنیٰ عدم علم بالدلیل ہے، وہل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون، اور اگر ترجیح بھی ثابت نہ ہو تو غایت درجہ مساوی ہوں گی، اور مساوات کی صورت میں صحت وعدمِ صحتِ جمعہ مشکوک ہوجائے گی، اور اس سے فرضِ ظہر ساقط نہ ہوگا، اور جب فرضِ ظہر ساقط نہ ہوا تو یہ جمعہ مشروع نہ ہوگا، لان الجمعۃ ما شرعت الا مسقطۃ لفرض الظہر، وہذہ لیست بمسقطۃ فلا تکون مشروطۃ، اور اگر بالفرض مخالفین ہی کے دلائل کو ترجیح ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے تو غایت مافی الباب یہ کہ گاؤں میں جمعہ فرض ظنی ہوگا اور اس لئے وہ فرض قطعی یعنی ظہر کے قائم مقام نہ ہوسکے گا، وہو المدعی،

پس اس مقدمہ میں تو فیصلہ امام صاحب کے موافق رہا، اب رہا دوسرا مقدمہ یعنی

اشتراطِ امام یا نائبِ امام کا مسئلہ، سوا ابو سعید خدریؓ کی حدیث مرفوع اور ابو ہریرۃؓ حضرت عمرؓ کا سوال و جواب اور مولیٰ سعید بن العاصؓ اور ابن عمرؓ کے سوال و جواب اور عمر بن عبد العزیز کا عدی بن عدی کو حکم یہ تمام امور دلیلِ اشتراط ہیں، اور نافینِ اشتراط کے پاس کوئی دلیلِ نفیِ اشتراط پر نہیں، اور اگر ہو بھی تو پھر اس میں یہی بحث ہے کہ اشتراط مبنیٰ ہے علم بدلیل الاشتراط پر اور نفی کا مبنیٰ عدم علم بالاشتراط ہے، وہل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون اور اگر ہم تعارض بھی مان لیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ عدم امام یا نائب کی صورت میں صحتِ جمعہ مشکوک ہوگی اور بصورتِ رجحان دلائل مخالفین جمعہ بدونِ امام فرض ظنی ہوگا، جس کو واجب کہتے ہیں، اور واجب فرض قطعی کے قائم مقام نہ ہوسکے گا، پس یہ مقدمہ بھی امام صاحبؒ کے موافق طے ہوا اور ثابت ہوا کہ امام صاحبؒ کا مسلک ہر طرح صحیح ہے، اور ہرگز قابلِ اعتراض نہیں،

یہ گفتگو تو اغیار سے متعلق تھی، اب ہم کچھ اتباعِ امام صاحبؒ کے متعلق لکھنا چاہتے ہیں، اچھا سنئے، امام صاحبؒ نے دلائل کے ذریعہ سے جیساکہ اوپر معلوم ہوا صحتِ جمعہ کے لئے دو شرطیں لگائی تھیں؛ اوّل مصر، اور دوسری امام یا نائبِ امام، اور یہ دونوں مستقل اور علیحدہ شرطیں تھیں، لیکن مقلدین نے اپنے اجتہاد سے دونوں شرطوں کو حذف کر دیا، کیونکہ انھوں نے کہا کہ امام یا نائبِ امام کی شرط محض انتظامی ہے، اور یہ شرط صرف اس لئے لگائی گئی ہے تاکہ تقدیم و تقدم میں تنازع نہ ہو، اب اگر یہ مقصد کسی اور طریق سے پورا ہو جائے تو پھر امام یا نائبِ امام کی ضرورت نہیں،

نیز انھوں نے کہا کہ اگر امام کسی گاؤں میں موجود ہو تو وہاں وہ اقامتِ جمعہ کرسکتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ مصر کی شرط فی نفسہ ضروری نہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ عادتاً امام یا نائبِ امام شہر ہی میں موجود ہوتا ہے، پس اگر امام کسی گاؤں میں موجود ہو تو وہ بھی حکماً شہر ہے، پس جبکہ نہ مصر مقصود بالذات ہوا اور نہ امام یا نائب امام، بلکہ شہر مطلوب ہوا امام یا نائبِ امام کے لئے اور امام مطلوب ہوا انتظام کے لئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر گاؤں میں تنازع کا اندیشہ نہ ہو جیساکہ آجکل ہے تو اس میں جمعہ جائز ہے، اور اگر کسی شہر میں اندیشۂ فساد ہو جیساکہ اُس وقت ہوتا ہے جبکہ شہروں میں ہندو مسلم فساد یا کوئی دوسرا ہڑبونگ ہو تو وہاں جمعہ جائز نہیں، لفواتِ الشرط وہو الانتظام، لیکن غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر امام کا یہی مطلب

ہوتا جو یہ مقلدین بیان کرتے ہیں تو ان کو مصر اور امام یا نائب امام کی علیحدہ علیحدہ شرطیں لگانے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف شرطِ امن عن التنازع کافی تھی، اور جبکہ انھوں نے یہ شرط نہیں کی بلکہ مصر کو علیحدہ شرط کیا اور امام یا نائبِ امام کو الگ تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں شرطیں فی نفسہ مطلوب ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر شہر میں امام یا نائبِ امام نہ ہو جیسا کہ ہندوستان میں تو جمعہ جائز نہیں، لفوات الشرط الثانی، اور اگر گاؤں میں امام ہو تو وہاں بھی جمعہ جائز نہیں لفوات شرط الاوّل، اور اگر گاؤں میں امام یا نائبِ امام نہ ہو تب بھی جمعہ جائز نہیں لفوات الشرطین، پس ثابت ہوا کہ امام صاحبؒ کے مذہب کو غیر مقلدین تو کیا خود مقلدین بھی نہیں سمجھے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ کے مذہب کے موافق ہندوستان میں شہروں میں جمعہ صحیح ہے اور نہ گاؤں میں، اور دوسرے ائمہ کے نزدیک شہروں میں بھی صحیح ہے، اور گاؤں میں بھی، اور چونکہ اس وقت رواج عام کی وجہ سے امام صاحبؒ کے مذہب پر عمل ناممکن ہے اور اس کی دعوت دینے میں شدید فتنہ کا اندیشہ ہے، اس لئے موجودہ رواج کو جائز قرار دیا جاوےگا اور یوں کہا جاوےگا کہ ہم بضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے مذہب پر جمعہ پڑھتے ہیں، اور جبکہ مقلدین خود دوسرے ائمہ کے مذہب پر عمل کر رہے ہیں، تو جو لوگ دوسرے ائمہ کے مذہب کے موافق گاؤں میں جمعہ پڑھتے ہیں اُن پر تشدد نہ کرنا چاہئے، ہاں اگر کوئی امام صاحب پر طعن کرے اس کا جواب ضرور دیا جاوے،

نیز چونکہ موجودہ جمعے دوسرے ائمہ کے مذہب پر صحیح ہیں، اس لئے ظہر احتیاطی کی ضرورت نہیں، ہاں اگر کوئی امام صاحبؒ کے خلاف سے بچنے کے لئے پڑھ لے تو مضائقہ نہیں، لیکن اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں، اور غیر مقلدین کا فرض ہے کہ وہ امام صاحبؒ کے مقلدوں کو اپنے مسلک کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں، کیونکہ اگر اُن کے حق اجتہاد تسلیم کر لیا جاوے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اُن کو کسی امام کی تقلید کے لئے مجبور نہ کیا جا سکے گا، لیکن اُن کو یہ حق کسی طرح نہیں کہ وہ دوسروں کو اپنی تقلید پر مجبور کریں، سلف کا طریقہ یہ تھا کہ فتنہ کے موقع پر خود اپنے اجتہاد کو چھوڑ دیتے تھے نہ یہ کہ وہ اپنے اجتہاد کی اس طرح تبلیغ کریں جس سے شدید سے شدید فتن کا صرف خطرہ ہی نہ ہو، بلکہ ان کا مشاہدہ ہو رہا ہو، خدا کے لئے اُمتِ مرحومہ پر رحم کرو اور اپنے اجتہادات کو (بشرطیکہ ان کو اجتہادات کہا جاسکے) اجتہادات ہی کی حد میں رکھو اور ان کو وحی قطعی کا مرتبہ نہ دو، امید ہے کہ آپ میرے

مخلصانہ مشورہ پر غور کر کے اس کی قدر کریں گے، وما ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ،

جوابِ خانقاہ امدادیہ ملاحظہ فرمودہ حضرت اقدس دام مجدہم،

اقول وباللہ التوفیق، اشتراط مصر وسلطان پر جو استدلال کیا ہے وہ بظاہر بہت عمدہ ہے، اور احقر نے بہت روز ہوئے کسی کے کلام میں دیکھا بھی ہے، مگر غور کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے دونوں مقدموں پر کلام ہوسکتا ہے، پہلا مقدمہ یعنی جمعہ کے روز اصالۃً ظہر فرض ہی، اور جمعہ اس کا قائم مقام، یہ امام صاحبؒ اور امام ابی یوسفؒ کے قول پر توصیح ہے، مگر امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جمعہ اصل ہے، اور ظہر بدل، اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے، لاادری ما اصل فرض الوقت فی ہذا الیوم ولکن یسقط الفرض عنہ باداء الظہر والجمعۃ قال شمس الائمۃ فی المبسوط یرید بہ ان اصل الفرض احدہما لا بعینہ یتعین بفعلہ (ص ۳۳ ج ۲) اور مختلف فیہ مقدمہ سے خصم پر حجت قائم نہیں ہوسکتی، البتہ فی نفسہ اثباتِ مذہب کے لئے یہ مقدمہ کارآمد تھا، اگر دوسرا مقدمہ مخدوش نہ ہوتا، لیکن دوسرے مقدمہ میں یہ شبہ ہی کہ کچھ شرائطِ جمعہ ایسے بھی ہیں جو دیگر ائمہ نے لئے ہیں، مگر امام صاحبؒ نے نہیں لئے، مثلاً تعدادِ جماعت میں اختلاف ہے، امام صاحبؒ نے تین مقتدی ہونا کافی سمجھا ہے، حالانکہ دوسرے ائمہ اس پر متفق نہیں، پس اس تقریر سے لازم آتا ہے کہ امام صاحبؒ کا قول تعدادِ جماعت کے بارے میں معتبر نہ ہو، کیونکہ وہ مجمع علیہ نہیں، اسی طرح تعددِ جمعہ مختلف فیہ ہے، اس تقریر پر تعددِ جمعہ کو شرط کہنا ضروری ہے، حالانکہ امام صاحب علیہ الرحمۃ کا مذہب صحیح جو متونِ معتبرہ میں موجود ہے، اس کی بناء پر تعددِ جمعہ علی الاطلاق درست ہے،

اس کے بعد آثار میں سے اثر علی وحذیفہ رضی اللہ عنہما کو ترجیح کی وجہ جو بیان کی ہے وہ بالکل صحیح ہے، مگر معارضہ تسلیم کرنے کی صورت میں جو یہ لکھا ہے "جو لوگ اشتراط کے قائل ہیں اُن کے قول کا مبنیٰ علم بالدلیل ہے اور جو لوگ قائل نہیں ان کے قول کا مبنیٰ عدم علم بالدلیل ہے"، یہ محل تامل ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر مسئلہ میں مثبت شرطیت وقائل فرضیت کا قول معتبر ہو، حالانکہ ایسا نہیں، مثلاً فاتحہ خلف الامام کو جو حضرات فرض کہتے ہیں اس تقریر پر ان کے قول کو تسلیم کرنا ضروری ہے، درحقیقت ہر دو فریق علم رکھتے ہیں تمام دلائل کا مگر ایک فریق اس دلیل کو کافی خیال کرتا ہے دوسرا کسی وجہ

سے اس کو ناکافی قرار دیتا ہے، واللہ اعلم،

اور بعد ازاں جمعہ ظنی الثبوت کو اس بنا پر جو د کیا ہے کہ وہ فرض قطعی یعنی ظہر کے قائم مقام نہ ہو سکے گا اس میں بھی کلام ہے، اول تو اس لئے کہ یوم جمعہ میں ظہر کا اصل ہونا قطعی نہیں کیونکہ مختلف فیہ، دوسرا اس لئے کہ امام صاحبؒ کے قول پر بھی تو بعض جگہ ظنی جمعہ جائز ہے جس کی دو مثالیں اوپر گذر چکیں، پھر وہ مسقط و قائم مقام ظہر کیسے ہو جاتا ہے،

یہ گفتگو تو تقریر استدلال کے متعلق تھی، اب دوسرے جزو کی بابت عرض ہے وہ یہ کہ وہ فقہاء مقدمین پر جو ترکِ تقلید کا شبہ کیا گیا ہے وہ مبنی ہے اس پر کہ بمصر قریہ بوجود الامام او نائبہ اور نیز نصب الخطیب من العامہ للضرورۃ کو تخریج فقہاء سمجھا گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ پہلا مسئلہ خود جامع صغیر میں موجود ہے، ونصہ ہذا فی الجمعۃ بمنًا ان کان الامام امیر الحجاز او کان الخلیفۃ مسافرا جمع وان کان غیر الخلیفۃ وغیر امیر الحجاز وہو مسافر فلا جمعۃ فیہا وقال محمدؒ لا جمعۃ بمنا ولا جمعۃ بعرفات فی قولہم جمیعًا اھ

اور دوسرا مسئلہ امام محمدؒ سے منقول ہے کما صرح بہ فی المبسوط (ص ۳۴ ج ۲) اور شیخینؒ کا اس میں کسی نے اختلاف بیان نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اتفاق ہوگا یا کم ازکم اختلاف کی نوبت نہ آئی ہوگی، یعنی امام صاحب کے وقت میں یہ مسئلہ مسکوت عنہ رہا ہو، بعد میں بوقت ضرورت امام محمد رحمہ اللہ نے ظاہر فرمایا ہوگا، اور شیخینؒ سے جو امام یا اس کے نائب کی ضرورت اقامتِ جمعہ کے لئے اطلاق کے ساتھ مروی ہے وہ اطلاق اس روایتِ محمدؒ کے معارض نہیں، کیونکہ اطلاق کو "بلا ضرورت" کے ساتھ مقید کر سکتے ہیں، اور جہاں کوئی والی نہیں وہاں ضرورت ہے اس لئے اس کا حکم جدا ہو جانا بعید نہیں، اسی واسطے درمختار نے کہا ہے نصب العامۃ الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر اما مع عدمہم فیجوز للضرورۃ، اس میں دونوں روایتوں کی رعایت موجود ہے، اور یہی تفصیل قرینِ قیاس ہے، کیونکہ حکام و ولاۃ کی موجودگی میں عوام کو اس قسم کا اختیار دینا بالکل نامناسب ہے، اور جب حکام نہیں تو ان کو خود اپنا انتظام کرنا لابدی ہے، کما لایخفی بعد ادنیٰ تأمل،

بہرحال یہ مسئلہ بھی مشائخ و فقہائے متاخرین کی تخریج نہیں پس اُن پر اجتہاد و ترکِ تقلید کا الزام نہیں ہو سکتا، البتہ نفسِ مسئلہ پر اشکال متوجہ رہا جو باعث ہوا تھا الزام کا

سو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے مسئلہ کو یعنی تمصر قریہ بالا تام کو عام سمجھ کر یہ اشکال پیش آیا، حالانکہ فقہائے کرام کے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ ہر قریہ اس حکم میں نہیں بلکہ وہی قریہ ہے جس میں دوسری اوصاف شہریت بھی موجود ہوں، چنانچہ درمختار میں ہے وجازت الجمعۃ بمنیٰ فی الموسم فقط بوجود الخلیفۃ او امیر الحجاز او العراق او مکۃ ووجود الاسواق والسکک وکذا کل ابنیۃ نزل بہا الخلیفۃ، اس میں صرف خلیفہ وغیرہ کے وجود کو کافی نہیں کہا بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وجود اسواق وسکک کو بھی اس میں دخل ہے، اور اس سے زیادہ صریح فتح القدیر میں ہے ثبوت ولایۃ الاقامۃ للجمعۃ ہو المصحح بعد کون المحل صالحاً للتمصیر (الیٰ قولہ) بخلاف ما اذا کان المحل غیر صالح للتمصیر فلذا قالوا اذا سافر الخلیفۃ فلیس لہ ان یجمع فی القریٰ کالبراری اھ (ص ۲۶ ج ۲) اور تمصر قریہ کے لئے وجود سلطان کے ساتھ قابل تمصیر کی قید معلوم ہونے کے بعد وہ اشکال کسی طرح واقع نہیں ہوسکتا جو اس تحقیق میں فاضل محقق دام فضلہم نے وارد کیا ہے،

اس مختصر عرض سے واضح ہوگیا کہ بلاد ہند وغیرہ کے شہروں میں جمعہ پڑھنا عین مذہب احناف کے مطابق ہے، اس میں دوسرے ائمہ کا مذہب حنفیہ نے ہرگز اختیار نہیں کیا، ورنہ دوسرے شرائط ضروریہ کی رعایت کا حکم بھی دیا جاتا، مثلاً چالیس مقتدی کا قابل امامت ہونا، کیونکہ مذہب غیر اختیار کرنے کے واسطے اجتماع شرائط لازم ہے، اور جب یہ واضح ہوگیا تو معلوم ہوگیا کہ جمعہ فی القریٰ کی ممانعت میں ڈھیلا ہونے کا مشورہ قابل قبول نہیں،

ایک بات قابل گذارش یہ بھی ہے کہ ترک جمعہ میں کوئی تکلیف اور حرج پیش نہیں آتا جو مسوغ ہے خروج عن المذہب کا، اس لئے اگر مذہب حنفیہ میں امصار ہند محل جمعہ نہ ہوتے تو اس باب میں دیگر ائمہ کا مذہب اختیار کرنے کی گنجائش ہوتی، بس اس کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ گو امصار ہند میں مذہب غیر لینے کی نوبت نہ آئی ہو مگر جمعہ فی القریٰ میں لیلیا جاوے،

واللہ اعلم، احقر عبدالکریم از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۱۰ ربیع الثانی ۵۳ھ

آبادی متفرقہ متصلہ کے مجموعہ میں وجوب جمعہ کی ایک صورت کا حکم

سوال (۵۶)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موضع بسی ایسی بستی ہے کہ جو قریباً ساڑھے تین سو برس سے آباد ہے، اور پٹھانوں کی آبادی ہے، بفضلہ اس بستی نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کے اندر سے گیارہ موضع اور جداگانہ پٹھانوں نے آباد کئے، جکو قریباً تین سو برس کا زمانہ ہوچکا ہے، اور ان مواضعات کے اسماء جداگانہ کاغذات سرکاری میں درج ہیں اور

عوام الناس میں مشہور ہیں، اور موضع بسی سے مواضعات پلڑہ و پلڑی قریب قریب ایک ایک فرلانگ کے فاصلہ پر آباد ہیں، اور یہ ہر دو مواضعات بسی ہی میں سے جدا ہو کر آباد ہوئے ہیں، بلکہ پلڑی میں دو ہزار کی مردم شماری خود ہے، اور اس میں سے ایک اور گاؤں تھوڑے عرصہ سے جدا ہو کر آباد ہوا ہے، جو نیا گاؤں کے نام سے مشہور ہے جس کی مردم شماری پانچسو کی ہے، و نیز دیگر مواضعات آدم پور و کمال پور قریب ایک ایک میل کے فاصلہ سے موضع بسی کے آباد ہیں، اور یہ بھی ۳ و ۴ اسی موضع بسی کے اندر سے نکل کر آباد ہوئے ہیں، موضع بسی میں مستقل بازار دوکان پرچون و حلوائی و بزاز و قصائی و لوہار بھی موجود ہیں، اور جس وقت یہاں بسی میں اذان ہوتی ہے تو مواضعات پلڑہ و پلڑی میں بخوبی آواز پہونچتی ہے اور اس بسی میں ایک بازار ہفتہ وار بھی لگتا ہے، جس میں مویشیاں اور دوکان قرب و جوار کی آتی ہیں، مثلاً حلوائی، بزاز، قصاب جو لحم فروخت کرتے ہیں اور دیگر قصاب و سبزی و پنساری لوہے کی چیزیں، لکڑی کی چیزیں، بساتی، جوتوں والے، تیل، غلہ، گھی، برتن، رنگی ہوئی کھالیں و بلا رنگی ہوئی، مسلمان بھٹیار کی دوکان، ہندوؤں کا کھانا، پان والوں کی دکانیں، سوت، سناروں کی دوکانیں، جن پر بنا بنایا زیور ملتا ہے، پٹوؤں یعنی زیور بلنے والوں کی دوکانیں اور اس موضع میں ایک سرپنچ منجانب گورنمنٹ اہل ہنود بھی مقرر ہے، جو مقدمہ طے کرتا ہے، اور مردم شماری اس وقت سات سو کے قریب ہے، البتہ موضع پلڑی کی مردم شماری دو ہزار ہے اور پلڑہ کی مردم شماری پانچسو ہے،

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ جیسے اس موضع بسی میں قدیم الایام سے جمعہ و نماز عیدین ہوتی چلی آرہی ہیں کیا یہ جائز ہیں؟ اور یہ بھی دریافت طلب ہے کہ قصبہ شاہ پور موضع بسی سے ایک میل کے فاصلہ پر آباد ہے اور وہاں جمعہ ہوتا ہے، مردم شماری قصبہ قریباً چار ہزار کی ہے، بمقابلہ قصبہ مذکور موضع بسی میں نماز عیدین و جمعہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ۱۸ رشوال ۴۸ھ

تنقیح: (۱) مجھ سے جس وقت میں بسی گیا تھا، زبانی یہ بھی کہا گیا تھا کہ موضع بسی کے حدود میں پلڑی کے مکانات کا سلسلہ آگیا ہے، اسی طرح بسی کے مکانات سے ایک جانب میں پلڑہ کے مکانات کا سلسلہ مل گیا ہے، سوال میں یہ بات ظاہر نہیں کی گئی، اگر یہ صحیح ہے تو اس کو ظاہر کرنا چاہئے؟

(۲) مجھ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ جس جگہ بسی کا مدرسہ ہے وہ موضع ہے پلڑی کا حصہ ہے؟

اور اس کو بھی عرفاً پلڑی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور سرکاری کاغذات میں مدرسہ لسی کا کہلاتا ہے، اس کو بھی سوال میں ظاہر نہیں کیا گیا، فقط ظفر احمد عفا عنہ ۲۴ رشوال ۴۸ھ "

جواب تنقیح: حضرت مفتی دین شرع متین گزارش بابت تنقیح یہ ہے کہ فی الواقع موضع لسی کے حدود میں پلڑی کی آبادی کئی بیگہ بڑھ گئی ہے، اور اب بوجہ اس کے بڑھنی بند ہوگئی ہے کہ لسی کی جانب اب تالاب ہے، اور وہ رکاوٹ تعمیر مکانات پیدا کر رہا ہے، یہ تالاب لسی کی آبادی کے پچاس قدم فاصلہ پر پلڑی کی جانب واقع ہے اور پلڑہ کی آبادی لسی سے نہیں ملی، بلکہ خود لسی کی آبادی پلڑہ کے گوڑہ سے اور کچھ صحرا پلڑا سے مل گئی ہے، اور گوڑہ کا بھی آبادی کے کاغذات سے تعلق ہوتا ہے،

۲، موضع لسی میں کوئی مدرسہ سرکاری اسلامیہ نہیں ہے، البتہ پہلے جس کو عرصہ پانچ ماہ کا ہوا، اسلامی تعلیم ایک معلم بچوں کو .... دیا کرتے تھے، باقی موضع پلڑہ میں مدرسہ سرکاری درجۂ تین تک مقرر ہے، اور موضع پلڑی میں سے جو مزرعہ نکل کر آباد ہوا ہے جس کا نام نیا گاؤں عرف گوکل گڈھ ہے اس میں ایک مدرسہ میڈل جماعت تک سرکاری کھلا ہوا ہے، اور خود پلڑی میں مدرسہ امدادی قائم تھا، مگر اب نہیں ہے، اور نیا گاؤں پلڑی ہی کا مزرعہ ہے، باقی نئے گاؤں کے نام کوئی صحرائی نہیں ہے، نیا گاؤں جو ہے اس میں ایک کارخانہ کو لھوا ایکھ پیڑنے کا بھی ہے، جہاں پرچرخیاں کثرت سے ملتی ہیں اور دیگر حلوائی اور پنساری ولوہے کی دوکان بھی ہے، پلڑے میں بھی مستقل بازار ہے، پنساری بزازہ دپرچون ولوہا وا ناج وغلہ وجولاہے کی دوکان جو کہ کپڑا بنتا ہے موجود ہیں،

الجواب: میرے نزدیک لسی اور پلڑہ پلڑی کا مجموعہ ایک ہی بستی ہے بوجہ اتصال حسی کے، گو کسی وجہ سے نام الگ الگ ہوں، اس لئے میں ان تینوں کو ایک گاؤں قرار دیکر ان میں جمعہ جائز سمجھتا ہوں، واللہ تعالیٰ اعلم، ۵ ر ذیقعدہ ۴۸ھ

گاؤں میں جمعہ کا حکم | **سوال** (۵۷) زید ایک گاؤں کا باشندہ ہے گاؤں کے دیگر مسلمان اس کی دینی معلومات اور علمی قابلیت کی وجہ سے اس کو اپنے مقابلہ میں بمنزلہ عالم کے سمجھتے ہیں اور وہ حضرت والا کا معتقد ہے، اس کئے گاؤں میں نماز جمعہ وعیدین ہوا کرتی ہے، زید کبھی گاؤں میں حاضر رہتا تو وہی نماز جمعہ وعیدین پڑھایا کرتا تھا، کچھ عرصہ سے زید نے حضرت والا کا یہ فتویٰ دیکھ کر کہ گاؤں میں نماز جمعہ وعیدین درست نہیں، نماز جمعہ وعیدین پڑھنا پڑھانا

چھوڑ دیا ہے، مگر بخیالِ فتنہ دوسروں کو پڑھنے سے منع نہیں کرتا ہے، اور وہ لوگ برابر پڑھا کرتے ہیں، مگر ان کو یہ امر ناگوار گذرتا ہے کہ زید سا شخص جو علمِ دین سے نسبتہً زیادہ واقفیت رکھتا ہے نمازِ جمعہ وعیدین کیوں نہیں پڑھتا دپڑھاتا ہے، بعض لوگ زید کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نماز پڑھائے، کیونکہ قرب وجوار کے دیہات کے لوگ بھی نماز عیدین کو اس کے گاؤں میں آیا کرتے ہیں، ورنہ یہ لوگ آنا بند کردیں گے، اور دوسرے بھی جو کم از کم جمعہ یا عیدین کی نماز پڑھا کرتے ہیں وہ بھی چھوڑ دیں گے، پس ایسی صورت میں نمازِ جمعہ یا عیدین زید کا نہ پڑھنا اور نہ پڑھانا شرعًا کیسا ہے، کیونکہ زید اپنے پیشوا (یعنی حضرت والا کے) کے فتوے کے خلاف عمل کرنا نہیں چاہتا ہے،

(۲) یا لوگوں کے اصرار یا انتشار کے خیال سے زید کو بھی نمازِ جمعہ وعیدین پڑھنا وپڑھانا چاہئے؟

الجواب: اگر اس گاؤں کی آبادی تین چار ہزار سے کم ہے اور وہاں تمام ضروریاتِ معاش نہیں ملتیں تو وہاں جمعہ وعیدین کی نماز درست نہیں، پس اس صورت میں زید کو وہاں جمعہ وعیدین نہ پڑھنا چاہئے، اور جو لوگ پڑھتے ہیں اُن سے منازعت اور جھگڑا بھی نہ کرنا چاہئے، ہاں نرمی سے عقلاء کو سمجھا دیا جائے کہ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ گاؤں میں جمعہ وعیدین کی نماز درست نہیں اس لئے میں نہیں پڑھ سکتا، اور میری خواہش یہ ہے کہ آپ لوگ بھی نہ پڑھیں، تاکہ گناہ سے بچ جائیں، آئندہ تم کو اپنے فعل کا اختیار ہے اور اگر نرمی سے کہنے میں بھی فتنہ کا اندیشہ ہو، تو اُس سے بھی احتراز کیا جائے، صرف اپنے عمل کو درست کرلیا جائے، واللہ اعلم، ۲۶ ر ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فتوے سے جوازِ جمعہ فی القریٰ کے شبہ کا ازالہ اور شہروں میں احتیاطِ ظہر کا حکم

سوال (۵۸) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ فیوضِ قاسمی میں درج ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جمعہ حتی الوسع شہروں میں قائم کرنا چاہئے، اور ظہر بھی ضرور پڑھنا چاہئے، اور اگر کوئی شخص گاؤں میں جمعہ قائم کرے اس سے دست وگریبان نہ ہونا چاہئے، اس سے جوازِ جمعہ فی القریٰ ثابت ہوتا ہے، احناف کو اس پر عمل کرنا چاہئے یا نہیں، علماء احناف کی جوازِ جمعہ فی القریٰ مع التزام احتیاطِ ظہر کیا رائے ہے؟

الجواب: حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کا

حاصل صرف یہ ہے کہ چونکہ دیہات میں جمعہ کا صحیح ہونا نہ ہونا ائمہ میں مختلف فیہ ہے، اس لئے حنفیہ کو اس میں دوسرے مذہب کے لوگوں سے جھگڑنا نہ چاہئے، اور واقعی مسائل مجتہد فیہا میں جھگڑنا مناسب نہیں، مگر مولانا کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حنفیہ کو دیہات میں جمعہ قائم کرنا جائز ہے، کیونکہ جب اُن کے مذہب میں جمعہ فی القریٰ صحیح نہیں تو اُن کو ایسا کرنا کب جائز ہے،

رہا شہروں میں جمعہ کے ساتھ ظہر پڑھنے کا حکم یہ اس وقت کا ہے جبکہ ہندوستان میں شرطِ سلطان فوت ہونے کی وجہ سے صحتِ جمعہ میں علماء کو اختلاف تھا، کہ یہاں کے شہروں میں بھی جمعہ صحیح ہے یا نہیں، بعض لوگ اس وجہ سے شہر میں بھی جمعہ کو صحیح نہ مانتے تھے، اور بعض شہر میں بھی جمعہ کے ساتھ احتیاطِ ظہر پڑھتے تھے، ہمارے اکابر نے اس کو رَد کیا، اور عامّہ اہلِ اسلام کو قائم مقام سلطان کے فرمایا، مگر مولانا محمد قاسم صاحبؒ جمعہ کے ساتھ احتیاط ظہر کو بہتر سمجھتے تھے، اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فسادِ عقیدہ عوام کی وجہ سے اس کو منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب امصار میں جمعہ دلیل سے صحیح ہے تو ہندوستان کے شہروں میں جمعہ وعیدین درست ہیں احتیاطِ ظہر کی ضرورت نہیں، بلکہ فسادِ عقیدۂ عوام کے انسداد کے لئے احتیاط ظہر سے شہروں میں اور جمعہ قائم کرنے سے دیہات میں سختی کے ساتھ منع کیا جاتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی یہ تحریر بطور فتوے کے نہیں، بلکہ علل احکام سے بحث کے طور پر ہے، جیسا کہ اس کے مطالعہ سے واضح ہے، اور عالم کا فتویٰ تو عوام کے حق میں حجت ہو سکتا ہے، نہ کہ اس کی بحث اور تدقیق ردّ المحتار میں تصریح ہے کہ ابن الہمام کی ابحاث حجت نہیں، کیونکہ وہ عالمانہ گفتگو ہوتی ہے، نہ کہ فتویٰ اور فیصلہ۔ فقط ۲۲ محرم

اذن الحاکم بالجمعۃ یبقیٰ بعد موتہ او عزلہ ام لا

سوال (۵۹) ایک موضع میں صحتِ جمعہ کے متعلق اختلاف ہو رہا ہے، مگر اس موضع میں قدیم زمانہ کی شاہی جامع مسجد موجود ہے، جس کے لئے شاہی فرمان سے خطیب و امام کا تقرّر بھی ہوا ہے، اس صورت میں یہ موضع جمعہ کے لئے صالح ہے یا نہیں؟ اس جگہ جمعہ اب تک ہو رہا ہے، کبھی منقطع نہیں ہوا، آبادی دو ہزار سے زیادہ ہے، بازار باقاعدہ متصل نہیں؟

الجواب: فی الدر عن القہستانی اذن الحاکم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعۃ اتفاقا علی ما قالہ السرخسی واذا اتصل بہ الحکم صار مجمعا علیہ فلیحفظ اھ قال الشامی عن فتاوی الدیناری اذا بنی مسجد (ای جامع)

فی الرستاق بامر الامام فھو امر بالجمعۃ اتفاقا علیٰ ما قال السرخسی اھ والرستاق القریٰ کما فی القاموس وظاھر ما مر عن القہستانی ان مجرد امر السلطان او القاضی ببناء المسجد واداءھا فیہ حکم رافع للخلاف بلا دعویٰ وحادثۃ، وفی قضاء الاشباہ امر القاضی حکم وافتی ابن نجیم بان تزویج القاضی الصغیرۃ حکم رافع للخلاف لیس لغیرہ نقضہ اھ (ص ۸۳۶ ج ۱) قلت ومثل ھذا الحکم الذی لا یجوز لغیرہ نقضہ لا یبطل بموت الحاکم کما لا یخفی فلما کان حکم الحاکم رافعا للخلاف الذی کان بین الحنفیۃ والشافعیۃ فی صلاحیۃ الموضع للجمعۃ وصار الموضع بحکمہ صالحا للجمعۃ اتفاقا یصح اداء الجمعۃ فیہ واللہ تعالیٰ اعلم، صورتِ مسئولہ میں اس موضع میں جمعہ درست ہے، بلکہ لازم ہے
قلت وقد تردد سیدی حکیم الامۃ فی بقاء مثل ھذا الحکم بعد موت الحاکم فلیتأمل ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا، ظفر احمد عفا عنہ ۲۳ رج ا ۱۳۵۵ھ

نوٹ: پھر یہ فتویٰ تحقیق کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں بھی بھیجا گیا تو حسبِ ذیل جواب آیا اور وہی جواب صحیح ہے، میں اپنے پہلے قول سے رجوع کرتا ہوں، ظفر احمد

قال العلامۃ ابن عابدین علیٰ قول الدر المختار "اذن عام" ای لکل خطیب ان یستنیب لا لکل شخص ان یخطب فی ای مسجد اراد (ح) اقول لکن لا یبقی الی الیوم الاذن بعد موت السلطان الاذن بذلک الا اذا اذن بہ ایضا سلطان زماننا نصرہ اللہ تعالیٰ کما بینتہ فی تنقیح الحامدیۃ وسنذکرہ فی باب العیدین عن شرح المنیۃ ما یدل علیہ ایضا فتنبہ رد المحتار ص ۸۴۷ ج ۱ باب الجمعۃ وقال فی باب العیدین وما ذکروا من عمل العامۃ بقول ابن عباس لامر اولادہ من الخلفاء بہ کان فی زمنھم اما فی زماننا فقد زال فالعمل بما ھو المذھب عندنا کذا فی شرح المنیۃ وذکر فی البحر ان الخلاف فی الاولویۃ ونحوہ فی الحلیۃ،

عہ لم اجدہ فی المبسوط فی باب الجمعۃ وقال الطحاوی علی ھذا القول ما الذی فی القہستانی ابو القاسم اھ فالظاھر انہ تصحیف من الکاتب ثم رأیت القہستانی نفسہ فی آخر عبارۃ فتاوی الدیناری علیٰ ما قال السرخسی کما نقلہ الشامی ۱۲ سعید احمد غفرلہ

(تنبیہ) یؤخذ من قول شرح المنیۃ کان فی زمنھم الخ ان امر الخلیفۃ لایبقی بعد موتہ اوعزلہ کما صرح بہ فی الفتاوی الخیریۃ وبنی علیہ انہ لونھی عن سماع الدعوی بعد خمس عشرۃ سنۃ لایبقی نھیہ بعد موتہ، واللہ تعالیٰ اعلم اھ، ص ۱۰۸ ج ۱ فی تنقیح الحامدیۃ ص ۶ ج ۲ وص ۱۰۷ ج ۱)

ان عبارات اور جزئیات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے امور میں حکم حاکم حاکم کی موت کے بعد باقی نہیں رہتا، اور حضرت اقدس کی رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے، بقاءِ حکم کی کوئی صریح دلیل نہ آپ نے لکھی اور نہ ہم کو ملی، اور آپ نے صرف اس سے استدلال کیا ہے، کہ حاکم جو حکم کرے اس کے نقض کا کسی کو حق نہیں، یہ نقض نہ کرنا اس کی زندگی میں تو مسلّم ہے، اور ہر حکم جو قواعدِ شرعیہ کے مطابق ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، بالخصوص مجتہد فیہ میں، الثالثۃ اذا قضی فی مجتہد فیہ مخالف لمذہبہ فلہ نقضہ دون غیرہ اشباہ، ص ۳۲۱، لیکن جو احکام محض اطاعت خلیفہ کی وجہ سے قابلِ تسلیم ہوں، ان کا بقاء بعد الموت مسلّم نہیں بلکہ حاکمِ جدید کو اس کے نقض کا حق ہے، جیسا کہ عبارتِ بالا سے ظاہر ہے، اور تنقیح حامدیہ ص ۶ ج ۲ پر اس کی مفصل بحث موجود ہے، اور خصوصیت سے جمعہ کے متعلق بھی فقہاء تصریح کرتے ہیں الامام اذا منع اھل المصر ان یجمعوا لم یجمعوا کما ان لہ ان یمصر موضعا فان لہ ان ینھاھم قال الفقیہ ابو جعفر ھذا اذا نھاھم مجتھدا بسبب من الاسباب واراد ان یخرج ذلک المصر من ان یکون مصرا اما اذا نھاھم متعنتا او اضرارا بھم فلھم ان یجمعوا علی رجل ان یصلی بھم الجمعۃ (بحر ص ۱۴۶ ج ۲ خلاصہ ص ۲۰۸ ج ۱)

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس جگہ کے لئے جب حکم شاہی جمعہ کے لئے ہوا تھا تو کیا اس وقت بھی یہی حالت تھی، سوال میں اس کی تصریح نہیں، اگر یہی حالت تھی تب تو حکم شاہی سے استدلال بصورت بقاءِ حکم بعد الموت صحیح ہو سکتا ہے، اور اگر اُس وقت اُس میں مصریت کی شان تھی، اس کے بعد ویران ہوگیا، تو کیا پھر بھی حکم شاہی سے اس جگہ جوازِ جمعہ کا حکم دیا جائے گا، بظاہر فقہاء کے کلام سے اس کی تردید معلوم ہوتی ہے، ولو ان اماما مصر مصرا ثم نفر الناس عنہ بخوف اوعدو اوما اشبہ ذلک ثم عادوا الیہ فانھم لایجمعون الا باذن مستانف من الامام، بحر ص ۱۴۶ ج ۲ عن الخلاصۃ ص ۲۰۸ ج ۱، واللہ اعلم

حررہ سعید احمد غفرلہٗ دارالافتاء مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور،

صحیح، عبداللطیف، ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، ۹؍ جمادی الثانی ۵۵ھ

نوٹ: پھر یہ سوال دوسری صورت سے آیا تو جواب دوسرا دیا گیا، جو آئندہ فتاویٰ رمضان ۵۵ھ میں نقل ہے، دونوں سوالوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے میں آبادی کو دو ہزار اور بازار کو غیر متصل ظاہر کیا گیا، اور دوسرے سوال میں آبادی تین ہزار اور بازار کو متصل ظاہر کیا گیا، اور بازار میں ضروریات کے ملنے کی تصریح کی ہے، اور دونوں جوابوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے جواب میں صرف اذنِ حاکم ببناء الجامع پر اس قریہ کو بحکم مصر مان کر جوازِ جمعہ کا فتویٰ دیا گیا تھا، مگر یہ بناء صحیح نہ تھی، اور دوسرے جواب میں قریہ کی حالتِ موجودہ کو قریۂ کبیرہ میں داخل مان کر فتویٰ دیا گیا ہے، اور یہ بناء صحیح ہے، پس دونوں میں تعارض کا شبہ نہ کیا جاوے،

جس جگہ کی آبادی تین ہزار سے زائد ہو اور ضروریاتِ زندگی اس میں دستیاب ہوں، اس میں جمعہ کا حکم،

سوال (۶۰) میرے موضع چائل کی مردم شماری ۲۶۹۷ آدمیوں کی ہے، ہفتہ میں دو مرتبہ بازار لگتا ہے، پندرہ سولہ دوکانیں مستقل طور سے بازار میں روزمرہ رہتی ہیں، اور یہ سب ایک ہی لائن میں ہیں، دس بارہ ایک طرف جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، اور پانچ چھ دوسری طرف جو ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں، بیچ میں دس بارہ قدم کا فرق اس وجہ سے ہو گیا ہے کہ ایک مکان کا پچھواڑہ پڑتا ہے، اور آگے سڑک ہے ورنہ یہ سب مل جاتیں، یہ سب دوکانیں بازار کے نام سے موسوم ہیں، ضروریات کی ساری چیزیں مثل غلہ، کپڑا، جوتہ، لکڑی، تیل، تمباکو، چینی، گوشت وغیرہ بلا تکلف ملتی ہیں، حتیٰ کہ دوا وغیرہ بھی مل جاتی ہیں، دو طبیب مستقل طور سے گاؤں رہتے ہیں، ڈاک خانہ، سرکاری بڑا اسکول ہے، جس میں انگریزی وغیرہ بھی پڑھائی جاتی ہے، ہمیشہ سے جمعہ ہوتا چلا آیا ہے، شاہی زمانہ میں قلعہ بھی تھا، جس کے نشانات اب تک موجود ہیں، اور وہ زمین مع ایک تالاب کے شاہی نام سے مشہور رہے، جمعہ کے متعلق شاہی اسناد بھی ایک شخص کے پاس ہیں، انگریزوں کے شروع زمانہ میں تحصیل تھی، جب وہ الٰہ آباد چلی گئی، تو اسی عمارت میں تھانہ ہو گیا، بعد میں تھانہ اٹھ کر دوسری جگہ چلا گیا، تو اس میں اسکول ہو گیا، گاؤں کے اندر سات مسجدیں ایک دوسرے سے فاصلہ پر مختلف محلات میں واقع ہیں، اور سبھوں میں

نماز ہوتی ہے، گاؤں کے باہر بہت بڑی پختہ عیدگاہ ہے، اس کے علاوہ چار پورہ جات جن کی تفصیل حسب ذیل ہے، اسی موضع کی زمین میں واقع ہیں، ان سب کا نقشہ خسرہ ایک ہی ہے، مجموعی مردم شماری موضع کی مع پورہ جات متعلقہ کے ۳۱۰۳ آدمیوں کی ہے، لہٰذا اس میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

تفصیل پورہ جات

نام پورہ	مردم شماری	اصلی موضع سے ان کا فاصلہ	نوٹ
پورہ محمد نعیم	۲۱۹	تخمیناً ۳ فرلانگ	۸ فرلانگ کا ایک میل ہوتا ہے،
دریاپور	۳۴	تخمیناً ۳ فرلانگ	
ڈیہا	۸۳	۶ فرلانگ	
سرائے امام قلی	۱۷	۱ میل	

الجواب؛ صورت مسئولہ میں چائل قریۂ صغیرہ نہیں، بلکہ قریۂ کبیرہ ہے جس میں جمعہ بالاتفاق جائز بلکہ واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۰ رمضان ۵۵ھ

میری رائے میں بھی یہ موضع اقامت جمعہ کا محل ہے، اشرف علی، ۲۱ رمضان ۵۵ھ

خطبۂ جمعہ میں تطویل مکروہ ہے

سوال (۶۱) بعض لوگ خطبہ کو نماز جمعہ سے طویل کرتے ہیں، اس کے متعلق شرعی حکم سے مطلع فرمایا جائے؟

الجواب؛ عن ابی وائل عن عمار قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان طول صلوٰۃ الرجل وقصر خطبتہ مئنۃ من فقہہ فاطیلوا الصلوٰۃ واقصروا الخطبۃ الحدیث رواہ مسلم ص ۲۸۶ ج ۱، وفی الدر ویسن خطبتان خفیفتان وتکرہ زیادتہما علی قدر سورۃ من طوال المفصل وعبارۃ القہستانی وزیادۃ التطویل مکروہۃ اھ (ص ۸۴۷ ج ۱) وفی مراقی الفلاح ویسن تخفیف الخطبتین قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ طول الصلوٰۃ وقصر الخطبۃ من فقہ الرجل (قال المحقق فی الفتح من الفقہ والسنۃ تقصیر الخطبۃ وتطویل الصلوٰۃ) بقدر سورۃ من طوال المفصل ولکن یراعی الحال بما ہو دون ذلک ویکرہ التطویل من غیر قید بزمن ففی الشتاء

لفصل الزمان وفی الصیف للضرر بالزحام والحر اھ (ص ۲۹۹) احادیثِ نبویہ اور تصریحاتِ فقہاء اس پر متفق ہیں کہ خطبہ کو نماز سے طویل نہ کرنا چاہیے، اور یہ کہ خطبہ میں تطویل مکروہ ہے، پس اگر گاہے ایسا ہو جاوے تو مضائقہ نہیں، مگر اس کا عادی ہونا مکروہ ہے،
واللہ تعالیٰ اعلم، ظفر احمد ۲۳ رجب ۵۶ھ ۔ نعم الجواب وہو عین الصواب، کتبہ اشرف علی، ۲۳ رجب ۵۶ھ

تحقیق کراہۃ الخطبۃ یوم الجمعۃ بغیر العربیۃ .... (۶۲) ہر چند کہ خطبہ جمعہ میں مضامین تذکیر کا ہونا متوارث ہے، جیسا حمد و تشہد و صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ترضی عن الخلفاء واہل البیت و استغفار للمؤمنین والمؤمنات کا اس میں ہونا متوارث ہے، مگر مقصود محض تذکیر نہیں، بلکہ خطبہ جمعہ میں شانِ تعبد غالب ہے جس کی ایک دلیل حضرت عمرو بن مسعود رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد ہے، انما جعلت الخطبۃ موضع الرکعتین من فاتتہ الخطبۃ صلی اربعًا (اعلاء السنن، ص ۷۳ ج ۸ وذکرت ہناک معنی فوت الخطبۃ فلیراجع)

دوسری یہ کہ باتفاقِ علماء آیت اذ قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون کا نزول ترکِ قرأت خلف الامام وانصات فی خطبۃ الجمعۃ کے متعلق ہوا ہے، جس سے خطبہ جمعہ کا مثل صلوٰۃ ہونا ظاہر ہے،

اگر خطبہ جمعہ سے مقصود تذکیر محض ہوتی تو بحالت خطبہ کسی کو بات کرنے سے روکنا اور "انصت" کہنا ممنوع نہ ہوتا، کیونکہ یہ بھی تذکیر ہی کی تکمیل تھی، مگر بخاری و مسلم وغیرہما نے حدیث صحیح میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعًا روایت کیا ہے، اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ انصت والامام یخطب فقد لغوت، امام طحاویؒ نے اس حدیث کو متواتر کہا ہے، (اعلاء السنن، ص ۶۰ ج ۲)

اور نماز میں غیر عربی میں ذکر و دعاء مکروہ ہے ممنوع ہے، در مختار میں ہے ودعاء بالعربیۃ وحرم بغیرہا (نہر، ص ۵۴۳ ج ۱) یعنی درود شریف کے بعد نماز میں جو دعاء کی جاوے، وہ عربی میں کی جاوے غیر عربی میں دعاء (نماز کے اندر) حرام ہے، علامہ شامی نے لکھا ہے کہ "منقول مذہب میں کراہت ہے، پھر کراہت میں تفصیل کی ہے، مگر تحقیق یہ ہے کہ نماز کے اندر تو غیر عربی میں دعاء مکروہ تحریمی ہے اور نماز کے علاوہ مکروہ تنزیہی بمعنی خلاف اولیٰ ہے"
اور جن لوگوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول جواز قرأت بالفارسیہ سے جواز خطبہ بالعجمیۃ پر استدلال کیا ہے، ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ امام صاحبؒ اس قول سے رجوع فرما چکے ہیں

اور قول مرجوع عنہ بحکم منسوخ ہوتا ہے، جس سے استدلال باطل ہے" ملاحظہ ہو شامی صلہ ۵۴۳ ج ۱
واعلاء السنن، ص ۱۳۷ ج ۴)

بہرحال خطبۂ جمعہ عربی زبان میں ہونا چاہئے، مقامی زبان میں ہرگز نہ ہونا چاہئے، رہا یہ کہ جب سامعین نہیں سمجھتے تو فائدہ کیا ہوا؟ اس کا جواب دینے کی ہم کو ضرورت نہیں اگر سمجھنا ضروری ہے تو چاہئے کہ جب تک نماز کے اذکار وادعیہ کا مطلب معلوم نہ ہو اس وقت تک نماز بھی لغو ہو، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ خطبۂ جمعہ مثل نماز کے ہے، دوسرے یہ سوال وہاں نہیں کیا جاتا، جب کوئی ویسرائے انگریزی زبان میں شاہی پیغام سُناتا ہے اور سُننے والوں میں ہزاروں اور لاکھوں آدمی انگریزی سے ناواقف ہوتے ہیں، مگر وہاں اہلِ دنیا کی عقل خود جواب دے لیتی ہے کہ شاہی پیغام شاہی زبان میں ہی ہونا چاہیے، رعایا کی زبان میں نہ ہونا چاہئے، یہی جواب یہاں کیوں نہیں دیا جاتا، شریعتِ مقدسہ نے نماز اذان اور خطبۂ جمعہ کو عربی میں اس واسطے رکھا ہے تاکہ مسلمانوں کو عربی زبان سیکھنے کی طرف توجہ ہو جس کا سیکھنا فرض کفایہ ہے، اور تاکہ سب مسلمانوں کو قرآن کریم سے مناسبت فی الجملہ حاصل رہے، اجنبیت محضہ نہ ہو جائے، اگر خدانخواستہ یہ شعائرِ اسلام بھی مقامی زبانوں میں ہونے لگے تو مسلمانوں کو قرآن وحدیث سے بہت بُعد ہو جائے گا، جس کا دین کے لئے خطرناک ہونا ظاہر ہے، پس اس رواج کو بند کرنا چاہئے، جو بعض شہروں میں ہونے لگا ہے، کہ خطبۂ جمعہ اردو میں دیا جاتا ہے، واللہ اعلم بالصواب، ۳ رمضان ۵۸ھ

فصل فی صلوٰۃ الکسوف والاستسقاء ومتعلقاتہما

کسوف اور خسوف کے وقت کھانے پینے کا حکم،

سوال (۱) چاند گرہن یا سورج گرہن کے وقت کھانا کھانا یا کوئی اور کام سوائے نماز وغیرہ کے کرنا جائز ہے یا نہیں، (اذا رأیتم شیئا من ہذہ الاہوال فافزعوا الی الصلوٰۃ) میں امر وجوب کے لئے ہے یا ندب کے واسطے، بینوا توجروا؟ ۲۵ رجب ۴۲ھ

الجواب: فافزعوا الی الصلوٰۃ میں امر ندب کے لئے ہے، اکل وشرب بحالتِ کسوف مباح ہے، البتہ بہت بھوکا نہ ہو تو ترکِ اکل اولیٰ ہے، لانہ ینافی الفزع المندوب، واللہ اعلم، فقط،

حکم استسقاء بحالت قلت مطر | **سوال** (۲) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس وقت عریضۂ ہذا کے ارسال کا منشاء یہ ہے کہ عرصہ سے یہاں اور قرب وجوار میں امساکِ باراں ہے، اگرچہ خاص سہارنپور اور اس کے نواح میں اوائلِ موسم میں خاصی بارش ہوچکی تھی، مگر اب تقریباً بائیس روز سے بارش نہیں ہوئی، علاوہ سہارنپور کے دیگر اضلاع کے قرب وجوار میں مظفر نگر، میرٹھ، دہلی، انبالہ میں یا بالکل بارش نہیں ہوئی یا بقدرِ ضرورت نہیں ہوئی، اس بناء پر دہلی میں ۲۷ ماہ رواں کو صلوٰۃ استسقاء پڑھی گئی ہے، اب آپ سے یہ استفسار ہے کہ سہارنپور اور تھانہ بھون کے حالات میں جزوی فرق ہے، حالاتِ موجودہ اور فقہاء کے اقوال پر نظر کرتے ہوئے یہ تحریر فرمائیں کہ بحالتِ موجود صلوٰۃ استسقاء کی ضرورت ہے یا نہیں، خطبوں کے اندر یہاں دعاء ہوچکی ہے اور ہوتی رہتی ہے، حضرت سلمہٗ کی رائے اور جواب جو کچھ عنایت ہو مفصل تحریر فرمائیں، اور فقہا جو تین دن کے خروج کو لکھتے ہیں آیا صلوٰۃِ استسقاء تین دن تک کا کسی روایت سے ثبوت ہے؟ اگر کوئی تصریح مل جاوے تو حوالہ تحریر فرمائیں، مولانا عبد اللطیف صاحب، ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

الجواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ۔ قال الحافظ فی التلخیص الحبیر فی قول الرافعی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یصل صلوٰۃ الاستسقاء الاعند الحاجۃ ما نصہ لم اجدہ صریحا لکن بالاستقراء یتبین صحۃ ذلک اھ (ص ۱۴۹ ج ۱) نعم قد ثبت انہ صلی اللہ علیہ وسلم استسقی من غیر صلوٰۃ لقحوط المطر عن البلاد البعیدۃ ایضا کما فی حدیث ابن عباسؓ عند ابن ماجہ، قال جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ لقد جئتک من عند قوم ما یتزود لھم راع ولا یخطر لھم فحل فصعد المنبر فحمد المنبر ثم قال اللھم اسقنا غیثا مغیثا الخ وسندہ صحیح ومن ھھنا واللہ تعالیٰ اعلم قال فقہاؤنا ان صلوٰۃ الاستسقاء مسنونۃ عند الحاجۃ الیہ فی موضع لایکون لاھلہ اودیۃ وانھار وآبار یشربون منھا ویسقون مواشیھم وزروعھم اوکان ذلک لکن لا یکفیھم فان کان کافیا لایستسقون کذا فی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص ۳۱۸) واما دعاء اھل الخصب لاھل الجدب فیستحب مطلقا کما فی الشامی (ص ۸۸۵) لحدیث خیر الدعاء ان تدعو لاخیک

بظهور الغيث واستحب الشافعي ان يستسقى امام الناحية المخصبة لاهل الناحية المجدبة ولجماعة المسلمين ويسأل الله الزيادة لمن اخصب مع استسقائه لمن اجدب كما في الام (ص ۱۸، ج۱) وعزاه الشعراني في كشف الغمة الى الصحابة انهم كانوا يستسقون لنواحي الارض واطراف المدائن اذا بلغهم قحط بلادهم اھ (ص ۱۳۸، ج۱) ولعل ذلك محمول عند علمائنا على الاستسقاء بالدعاء فقط بدون الصلوٰة، وتفسير الحاجة عندي ان يخاف من قلة المطر غلاء السعر بحيث يضطرب به فقراء الناس وعامتهم ولا عبرة بامرائهم وظني ان مثل تلك الحاجة قد تحققت في بلادنا هذه فقد تشوشت العباد واضطربت الزراع وبلغت قلوب الفقراء الحناجر من مخافة الغلاء الشديد ان لم يمطروا في المدة القريبة والله المستعان فقد هلكت الزروع اوكادت تهلك لقلة المطر وهبوب الصبا فيستحب لائمة البلاد ان يستسقوا ولا شك في الجواز والله تعالى اعلم

(تتمة) واما انهم يخرجون ثلاثاً متتابعات فقد صرح الشافعي باستحبابه في الام وقال الشرنبلالي في نور الايضاح وشرحه ان اكثر من ذلك لم ينقل ولم يرد ذلك في الحديث لانه صلى الله عليه وسلم اذا استسقى سقى اولا وكذا الصحابة ايضاً والله اعلم، حرره ظفر احمد عفی عنہ ۲۹؍ صفر ۴۷ھ

الجواب صحيح، اشرف علی ۲۹؍ صفر ۴۷ھ

مسائل متفرقہ کتاب الصلوٰۃ

نمازی کے آگے سے گذرنا | سوال (۱) زید کو یہ معلوم نہیں کہ نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گذرنے والے کو عذاب ہوگا اور آگے زید گذر گیا تو زید کو عذاب ہوگا یا نہیں ہوگا؟

ع۵ اي عن السلف ولعل وجه ذلك ان الدعاء يستحب فيه التكرير واقله التثليث كما في الحصن الحصين وعزاه الى ابي داؤد فلم يتجاوزوا في الاستسقاء اقل عدد التكرير لكونه دعاء مخصوصاً على هيئة خاصة خلاف القياس فلا يكرر الا بدليل وقد ثبت عنه صلى الله عليه وسلم تثليث الدعاء صراحة في غير الاستسقاء فلا يزاد عليه ۱۲ منه

الجواب: مسئلہ کے نہ جاننے کا زید کو گناہ ہوگا، ۷ر شعبان ۴۱ھ

حالتِ رکوع میں الصاقِ کعب کی تحقیق | **سوال** (۲) الصاقِ کعب بالکعب فی الصلوٰۃ عند الرکوع والسجود للرجل صنا سنۃ لکھتے ہیں، حاشیۂ طحطاوی (ص ۳۱۳ ج ۱) شامی (ص ۳۳۴ ج ۱) مبسوط (ص ۹، ج ۱) بحر الرائق (ص ۳۱۵ ج ۱) ملتقی الابحر مع مجمع الانہر (ص ۹۶ ج ۱) کبیری (ص ۳۰۷) در مختار (ص ۳۷) حاشیہ مالابد منہ اور جناب نے بہشتی زیور میں الصاق کو عورتوں کے لئے تحریر فرمایا ہے، اور ہمارے بزرگوں کا عملدرآمد بھی اسی پر ہے، مگر کتب مذکورہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جناب کی تحقیق کے خلاف ہی، اس کی حقیقت کیا ہے اور صحیح کیا ہے؟

الجواب: الصاق الکعب بالکعب فی الرکوع کا رجال کے لئے مسنون ہونا تو محلِ کلام ہے، یہ صرف زاہدی کی روایت ہے، اور وہ نقل میں ضعیف ہی، بحالتِ تفرد اس کی روایت معتبر نہیں اور سب متون و شروح میں زاہدی ہی کی اتباع سے اس الصاق کو مسنون کہا گیا ہے، صرح بہ الشیخ مدظلہ فی ترجیح الراجح المطبوع مسلسلا فی رسالۃ النور، ص ۱۶ شعبان ۴۲ھ، بلکہ طحاوی کی معانی الآثار (ص ۱۳۴) سے رکوع و سجود میں تجافی کا مسنون ہونا اور الصاق کا مسنون نہ ہونا مصرح ہے، باقی عورتوں کے لئے بلحاظِ ستر بہشتی زیور میں اس الصاق کو باقی رکھا گیا، ودلیلہ ما فی الاشباہ من احکام الانثیٰ وتضم فی رکوعہا وسجودہا ولا تفرج اصابعہا فی الرکوع اھ (ص ۳۴۶) اس میں تضم رکوعہا وسجودہا، مطلقِ ضم کی مطلوبیت پر دال ہے، جس میں الصاق الکعب بالکعب بھی داخل ہے، واللہ اعلم، ۵ر ربیع الاول ۴۵ھ

اندھیرے میں تہجد پڑھنے کا حکم | **سوال** (۳) نمازِ تہجد روشنی میں پڑھنا اولیٰ ہے، یا اندھیرے میں، دونوں میں کونسی صورت بہتر ہے؟

الجواب: جہاں قبلہ مشتبہ ہونے کا اندیشہ ہو وہاں رات کی نماز اندھیرے میں مکروہ ہے، اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو وہاں بلاکراہت جائز ہے، البتہ عدمِ اشتباہ کی صورت میں بھی اگر اندھیرے سے قلب کو تشویش ہوتی ہو تو روشنی میں نماز پڑھنا اولیٰ ہی، ۲۳ر جمادی الثانی ۴۵ھ

کوئی شخص بالکل نمازی کے سامنے بیٹھا ہو تو اس کو کسی طرف سرک جانا جائز ہے؟ اور نمازی کے سامنے سے کوئی چیز اٹھانے کا حکم

سوال (۴) احقر نے غایۃ الاوطار میں دیکھا ہے کہ کسی کے پیچھے اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو داہنی یا بائیں طرف سرک جانا جائز ہے، کیونکہ وعید جو آئی ہے تو ایک طرف سے دوسری طرف گذرنے پر آئی ہے، اور اس میں وہ صورت نہیں، یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اور نمازی کے آگے سے داہنی طرف سے یا بائیں طرف سے ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: فی الشامی (ص ۶۶۵ ج ۱) اراد المرور بین یدی المصلی فان کان معه شئ یضعه بین یدیه ثم یمر ویاخذه ولو مر اثنان یقوم احدهما امامه ویمر الاخر ویفعل الاخر هکذا ویمران وان معه دابة فمر راکبا اثم وان نزل وتستر بالدابة ومر لم یاثم ولو مر رجلان متحاذیین فالذی یلی المصلی هو الأثم قنیه وایضا فی العالمگیریة ولو مر اثنان یقوم احدهما امامه ویمر الاخر ویفعل الاخر هکذا ویمران کذا فی القنیة (ص ۶۶ ج ۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ غایۃ الاوطار کا مسئلہ صحیح ہے، اور نمازی کے سامنے سے چیز اٹھانا جائز ہے، (کما علم من قول الشامی ویاخذہ) احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۵ ذی الحجہ ۴۳ھ

نمازی کے سامنے سے ہٹنے کا حکم

سوال (۵) اگر کوئی شخص پیچھے بالکل محاذات میں نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں وہاں سے الگ ہو جانا مرور بین المصلی میں داخل ہے یا نہیں، ہر دو صورتوں کا مع الدلیل جواب تحریر کیا جائے؟ ممتاز احمد گیاوی مقیم خانقاہ

الجواب: فی العالمگیریہ (ص ۶۶ ج ۱) ولو مر اثنان یقوم احدهما امامه ویمر الاخر ویفعل الاخر هکذا ویمران کذا فی القنیة، اس روایت فقہیہ سے معلوم ہوا کہ محاذاۃ مصلی سے ہٹ جانا مرور نہیں، لیکن ایسے فعل سے عوام کو مرور کی جرأت ہو جاتی ہے، اس لئے بہتر ہے کہ آگے سے نہ ہٹے بالخصوص جبکہ کوئی ضرورت ہٹنے کی نہ ہو، واللہ اعلم،

احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۶ رجب ۱۳۴۴ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۷ رجب ۱۳۴۴ھ

درود ابراہیمی میں کما صلیت علی ابراہیم میں تشبیہ کی تحقیق

سوال (۶) قادیانی کہتے ہیں کہ کما صلیت علی ابراہیم میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم

علیہ وعلیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذریت میں نبوت دی گئی، اسی طرح ہمارے حضرت کی اُمت میں بھی دی جاوے، اس تشبیہ کے متعلق کیا منقول ومعقول ہے؟

الجواب: قال فی الدر وخص ابراھیم ای التشبیہ بابراھیم دون غیرہ من الرسل الکرام علیھم السلام ۱۲) لسلامہ علینا ای لانہ مسلم علینا لیلۃ المعراج حیث قال ابلغ امتک السلام منی ۱۲ شامی) اولانہ سمانا المسلمین (کما اخبر عنہ تعالیٰ بقولہ ھو سماکم المسلمین من قبل ۱۲ شامی) اولان المطلوب صلوٰۃ یتخذہ بھا خلیلاً وعلی الاخیر فالتشبیہ ظاہر اھ قال الشامی واجیب (ای عن التشبیہ) باجوبۃ اخر من احسنھا ان التشبیہ فی اصل الصلوٰۃ لا فی القدر (کما فی قولہ تعالیٰ انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح وکتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم واحسن کما احسن اللہ الیک وفائدۃ التشبیہ تاکید الطلب ای کما صلیت علی ابراھیم فصل علی محمد الذی ھو افضل منہ اھ (ص ۵۳۶ ج ۱)

اور قادیانیوں نے جو وجہ بیان کی ہے وہ صحیح نہیں، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں نبوت دی گئی تھی، نہ کہ امت میں، اگر اس سے بقاء امّت کی طرف اشارہ ہوگا تو بہت سے بہت مثل ابراہیم علیہ السلام کے حضورؐ کی ذریّت میں اس کے بقاء کی طرف اشارہ ہوگا، امّت میں نبوّت باقی رہنے کی طرف اشارہ کی کیا دلیل ہے؟

دوسرے اگر ابراہیم علیہ السلام کی تخصیص اس اشارہ کی وجہ سے کی گئی ہے تو نوح علیہ السلام کا نام بھی درود میں ہونا چاہئے تھا، کیونکہ بقاء نبوّت فی الذریت کا شرف ان کو بھی حاصل ہے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اُن کو یہ شرف حاصل ہوا، قال تعالیٰ وان من شیعتہ (ای نوح ۱۲) لابراھیم (سورۃ الصّٰفّٰت) وقال تعالیٰ ولقد ارسلنا نوحاً وابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتٰب (سورۃ الحدید) پس یہ وجہ غلط ہے، اور کما صلیت علی ابراہیم میں بقاء نبوّت کی طرف اشارہ نہیں، بلکہ اشارہ خلّت کی طرف ہے، وقد استجاب اللہ دعاء عبادہ فاتخذہ اللہ تعالیٰ خلیلا ایضاً ففی حدیث الصحیحین ولکن صاحبکم خلیل الرحمٰن اھ شامی (ص ۵۳۶ ج ۱) ای وخلۃ نبینا اکمل وافضل کما دلت علیہ الآیات والآثار، واللہ اعلم، ۱۳ شوال ۴۶ھ

نماز باجماعت کے لئے لوگوں کی حاضری لینے کا حکم،

سوال (۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک موضع کے کل لوگوں کا نام رجسٹر میں درج ہے، اور نماز کے وقت مسجد کے اندر ہر شخص کا نام بنام پکار کر حاضری لی جاتی ہے، تاکہ لوگ جماعت سے نماز پڑھیں اور سستی نہ کریں، لہٰذا از روئے شرع کے اس قسم کی حاضری مسجد کے اندر لینی جائز ہے یا نہیں، بحوالۂ کتب مع عبارت کے ارقام فرمادیں، بینوا بالکتاب توجروا بالصواب۔

الجواب: اس قسم کی حاضری لینا جائز نہیں، کیونکہ جماعت کا وجوب بعض اعذار شرعیہ سے ساقط ہوجاتا ہے، اور بعض اعذار مخفی ہوتے ہیں جن کا علم بجز مبتلیٰ بہ کے کسی کو نہیں ہوسکتا، اور نام بنام حاضری لینے میں متخلف عن الجماعۃ کی بابت لوگوں کو ناحق بدگمانی پیدا ہوگی وقد قال تعالیٰ یا ایها الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا الاٰیۃ وهذا داخل فی التجسس المنهی عنه وانما جاز مثل ذلك للمزکی لمصلحة شرعیة وهی تعدیل الشهود وجرحهم ولا مصلحة فی ذلك الاٰن لعدم وجود الامام والقضاۃ، نیز یہ طریقہ سلف صالح سے ثابت نہیں، وکانوا سابقین الی الخیرات، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ شعبان ۴۷ھ

خانقاہ امدادیہ کے حوض پر بلاسترہ نماز پڑھنے والوں کے آگے سے گذرنے کے متعلق حکم،

سوال (۸) خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں بعض لوگ حوض کے اوپر نفلیں پڑھتے ہیں، اور سترہ سامنے نہیں ہوتا، ان نمازیوں کے سامنے سے پچدرہ میں چلنا اور گذرنا جائز ہے یا نہیں؟ صورت یہ ہے:-

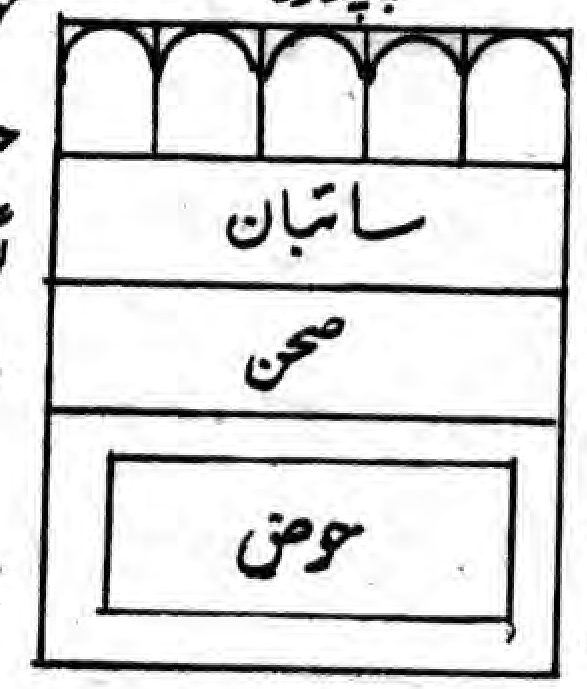

حوض پٹا ہوا ہے، ایک جانب وضو کیلئے کھلی ہے، لوگ حوض کے اوپر بلاسترہ نماز پڑھتے ہیں،

الجواب، قال فی القنیۃ شرح المنیۃ ثم اکثرهم کرہ المرور بین یدیه عند عدم الحائل اذا کان فی موضع سجودہ فی الاصح قال فی الکافی، وفی النهایۃ الاصح ان کان بحال لو صلی صلوٰۃ الخاشعین بان یکون بصرہ حال قیامه الی موضع سجودہ لا یقع بصرہ علی المار لا یکرہ هذا اذا کان یصلی فی الصحراء اما ان صلی فی المسجد ولم یکن حائل فان کان المسجد صغیرا کرہ المرور مطلقا

وان کان کبیراً فقیل کالصغیر لایمر بینه وبین حائط القبلة وقیل کالصحراء یمر فیما وراء موضع السجود وقیل یمر فیما وراء خمسین ذراعاً وقیل قدر ما بین الصف الاول وحائط القبلة قال الشیخ ابن الھمام ومنشاء ھذہ الاختلاف ما یفھم من لفظ بین یدی المصلی (الوارد فی الحدیث) فمن فھم ان ما بین یدیه یخص ما بینه وبین محل سجودہ قال به ومن فھم انه یصدق مع اکثر من ذلک نفاہ وعین ما وقع عندہ والذی یظھر ترجیح ما اختارہ فی النھایة من مختار فخر الاسلام وکونه من غیر تفصیل بین المسجد وغیرہ فان المؤثم المرور بین یدیه، وکون ذلک البیت برمته اعتبر بقعة واحدة فی حق بعض الاحکام (کصحة الاقتداء ونحوھا) لایستلزم تغییر الامر الحسی من المرور من بعید فیجعل البعید قریباً انتھٰی ملخصاً (ص ۳۵۴)

قلت فما ظنک بدار لم تعتبر بقعة واحدة فی حق صحة الاقتداء من غیر اتصال الصفوف فیھا، صورتِ مسئولہ میں بچدرہ کے اندر سے یا مسجد کے اندر سے ہو کر اُن نمازیوں کے سامنے سے گذرنا جو حوض پر یا حوض کے متصل نماز پڑھ رہے ہیں جائز ہے، کیونکہ بچدرہ اور حوض مکان واحد نہیں اور فصل بھی زیادہ ہے کہ نمازی کی نظر گذرنے والے پر نہیں پڑ سکتی، پس وہاں سے گذرنے والے کو ان نمازیوں کے سامنے سے گذرنے والا نہ کہا جائے گا، واللہ تعالیٰ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ ۲۳ رج ۱۳۵۵ھ، صح الجواب اشرف علی ۲۴ رج ۱۳۵۵ھ

کتاب الجنائز

فصل فی احوال الموتیٰ والقبور

عورتوں کے لئے زیارتِ قبور کا حکم

سوال (۱) اگر عورت ضعیفہ یا جوان پردہ کے ساتھ قبرستان جاوے اور اس جگہ کوئی خلافِ شرع کوئی کام نہ کرے تو اس کا جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قال فی الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص ۳۶۲ وان کان للاعتبار والترحم والتبرک بزیارة قبور الصالحین من غیر ما یخالف الشرع فلا بأس به اذا کن عجائز وکرہ ذلک للشابات کحضورھن فی المساجد للجماعات اھ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کام خلافِ شرع نہ کیا جاوے تو بوڑھی عورتوں کو زیارتِ قبور

جائز ہے، جوان کو نہ چاہئے کہ اس میں فتنہ ہے،

قبر پر کتبہ لگانا مکروہ ہے

سوال (۲) کیا قبر کا گردا پتھر یا اینٹ سے ایک بالشت تک اونچا اس غرض سے بنانا کہ نشان قائم رہے اور اوپر سے کھلی رہے جائز ہے یا نہ، اور کتبہ کندہ شدہ نام متوفی بمعہ تاریخ وغیرہ لگانا جائز یا نہ؟

الجواب: علامت باقی رکھنے کے لئے گردا بنانا یا کتبہ لگانا قبر پر مکروہ ہے قال فی العالمگیریۃ ویکرہ ان یبنی علی القبر ویعلم بعلامۃ من کتابۃ ونحوہ کذا فی التبیین اھ ملخصاً (ص ۱۰۷ ج ۱) ۲۶ ربیع الثانی ۴۰ھ

میت کی بعض رسومات کا حکم اور غسل اور کفن دفن کا طریقہ

سوال (۳) .... یہاں کی قدیمی رسم ورواج یہ ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے بعد دم نکل جانے کے لاش کو اتر سرہانے قبلہ رخ غسل دینے تک جیسے قبر میں رکھتے ہیں ویسے ہی رکھتے ہیں، اور چلیا قوم جو کہ اکثر شافعی مذہب والے اور نیلشاپوری لوگ جو کہ اکثر حنفی مذہب والے ہیں، یہ لوگ دم نکلتے ہی قصداً مُردے کو پورب سرہانا اور قبلہ رُخ پاؤں لاش اُٹھنے تک رکھتے ہیں، اور دم نکلتے ہی بیچارغسل اور کفنانے کے وقت تک غسل دلاتے ہیں اور لاش کو اونچے پلنگ یا تخت پر رکھتے ہیں، حالانکہ رنگون میں سب پکی عمارت یا تختے کے گھر ہیں، کہیں مٹی کے مکان نہیں ہیں، فی الحال آج چوتھا دن ہے، کہ ایک شخص ہمارے محلّہ میں فوت ہوا، تو فرقۂ اوّل یعنی محلّہ والوں نے جن میں دو پیش امام مسجد کے اور تین مولوی بھی ہیں اپنے قدیمی رواج کے مطابق مُردے کو اُتر سرھانے قبلہ رُخ لٹائے رکھا تھا، اتنے میں فرقۂ ثانی کے لوگ نے آکر جبراً میت کو غسل دلایا پھر پلنگ یا تختہ منگا کر اونچے پر قبلہ رُخ پاؤں اور پورب کی طرف سرھانا کرکے رات بھر لاش صبح اُٹھنے تک رکھا، اور بہت کچھ گفت وشنید ہوئی، اور کہتے ہیں اصح وصحیح طریق یہ ہے، ہزاروں دلیلیں ہم نے بتائی اور ثبوت دیا کہ میت کو اس رسم سے اُٹھنے تک رکھنا اھ اب پیش امام ومولوی لوگ فرقۂ ثانی سے عاجز ہیں کہ فضول بحث چہ کار آید، اب محلہ والے حضور سے دست بستہ خدمتِ عالی میں عرض کرتے ہیں کہ فرقۂ ثانی کی کارروائی سے فساد ہونے کا اندیشہ ہے، آپ برائے خدا ان شقوں سے نجات دلائیے:-

اوّل یہ کہ بلا ضرورت میت کو پورب سرھانے لاش اُٹھنے تک لٹائے رکھنا،

دوسرے بلاضرورت دم توڑتے ہی غسل دینا پھر کفنانے کے وقت بلاضرورت غسل دینا
سوم بلاعذر میت کو اونچے تخت پر رکھنا،
چہارم، جنازہ پر لے جاتے وقت مردمیت پر پھول کا ہار چڑھاتے ہیں، میت پر نہیں
جنازہ پر لیجاتے ہیں، یہ سب رسم درست ہیں یا نہیں، برائے خدا وبرائے کرم نوازی غریب
مسلمانوں پر نظر شفقت ڈال کر آنجناب مہر ثبت کے ساتھ مدلل جواب ارسال فرماکر سب
مسلمانوں کو مشکور وممنون فرمائیے، یہی یہاں کے مسلمانوں کی دست بستہ عرض ہے،
پنجم، جب میت کو جنازہ پر رکھتے ہیں ایکمرتبہ فاتحہ پڑھتے ہیں پھر قبرستان ہو چکر نماز پڑھنے کے بعد ایکبار فاتحہ پڑھتے ہیں
پھر دفن کے بعد لوٹتے وقت دروازہ قبرستان پر کھڑے ہو کر ایکبار فاتحہ پڑھتے ہیں، اعرض یہ کہ آیا اتنی مرتبہ فاتحہ دینا درست ہے یا نہیں؟

الاجوبة، قال فی الدر ویوجه المحتضر لقبلة علی یمینه هو السنة وجاز
الاستلقاء علی ظهره وقدماه الیها وهو المعتاد فی زماننا اھ قال الشامی ناقلا
عن البحر اختاره مشائخنا بما وراء النهر لانه ایسر لخروج الروح وتعقبه
فی الفتح وغیره بانه لا یعرف الا نقلا والله اعلم بالایسر منهما ولکنه
ایسر لتغمیضه وشد لحییه ومن امنع من تقوس اعضائه اھ (ص $\frac{888}{1}$)
وفی حاشیة الطحطاوی علی المراقی الفلاح قوله وجاز الاستلقاء ویوضع هکذا
فی الغسل والصلوٰة قال فی شرح الطحاوی وهو العرف بین الناس قال فی الزاد
والاول افضل لانه السنة کذا فی المضمرات اھ (ص ۳۲۵)
ان عبارات سے معلوم ہوا کہ قبلہ کی طرف پیر کرکے میت کو لٹانا خروجِ روح سے پہلے
بعض مشائخ نے مستحسن سمجھا ہے، کیونکہ اس میں اُن کے نزدیک خروجِ رُوح میں سہولت ہے،
مگر زاد فقیرا اور مضمرات میں تصریح ہے کہ افضل طریقہ موافقِ سنت یہ ہے کہ میت کو داہنی کروٹ
پر قبلہ رُخ کیا جائے، اس کی یہی صورت ہے کہ سر جانبِ شمال ہو اور پیر سمت جنوب، اور داہنی
کروٹ دے کر قبلہ رُخ کردیا جائے، پھر یہ اختلاف تو خروجِ رُوح کے وقت ہے، اور
خروجِ رُوح کے بعد قبلہ رُخ پیر کرکے لٹانا یہ تو محض لغو حرکت ہے، کیونکہ اب اس میں کوئی
بھی فائدہ نہیں اور جب وقتِ فائدہ کے بھی یہ صورت خلافِ سنت اور غیر افضل تھی، تو
اب بدرجۂ اولیٰ خلافِ سنت وغیر افضل ہوگی، فافهم،
(۲) قال فی مراقی الفلاح واذا تیقن بموته یعجل بتجهیزه اکرامالہ لما فی

الحدیث وعجّلوا به لانه لا ینبغی لجیفة مسلم ان تحبس بین ظهرانی اهله والصارف عن الوجوب الاحتیاط قال بعض الاطبّاء ان کثیرین ممن یموت بالسکتة ظاهرًا اٰیں فنون احیاء لانه یعسر ادراک الموت الحقیقی بها الا علی افضل الاطباء فیتعین التاخیر فیها الی ظهور الیقین بنحو من التغیر وقد مات النبی صلی اللّٰه علیه وسلّم یوم الاثنین ضحوة ودفن فی جوف اللیل من لیلة الاربعاء اھ قال الطحطاوی وظاهر کلامهم ان التاخیر مطلوب مطلقا لما رواہ من الحدیث رای ماروا ہ من التاخیر فی دفنه علیه افضل الصلوٰة والسلام) والمراد التاخیر الی تیقن الموت فانه ربما عرض علیه هذہ الداء اھ (ص ۳۲۹) ان عبارات سے معلوم ہوا کہ مُردہ کے غسل وغیرہ میں دم توڑتے ہی جلدی نہ کی جائے بلکہ کسیقدر تاخیر اتنی دیر تک کی جائے کہ موت کا یقین پختہ ہوجائے، اور سکتہ وغیرہ کا وہم نہ رہے، اور یقینِ موت کے بعد پھر دیر نہ کی جائے، پس دم ٹوٹتے ہی فوراً میّت کو غسل دینا اور کفن کے وقت دوبارہ غسل دینا لغو حرکت ہے، بلکہ محض کفنانے کے وقت غسل دینا چاہئے، اور بعض متون میں جو یہ الفاظ ہیں فیوضع کما مات علی سریر مجمّر الخ جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ پس مرتے ہی فوراً تختہ پر رکھ دیا جائے، اس کا مطلب یہ نہیں بلکہ مطلب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ تیقنِ موت کے بعد جب غسل وکفن کا ارادہ کریں تب تختہ پر رکھیں، صرح فی مراقی الفلاح وحاشیتہ للطحطاوی (ص ۳۳۰) وفیه لاباس بالتاخیر لعارض کما فی ابن امیر حاج،

(۳) قال الطحاوی فی حاشیة علی مراقی الفلاح روی انه صلی اللّٰه علیه علیه وسلم لما غسل وکفن ووضع علی السریر دخل ابوبکرؓ وعمرؓ وهما فی الصف حیال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم اھ (ص ۳۴۰) اس سے معلوم ہوا کہ میّت کو غسل وکفن کے بعد تخت یا پلنگ پر رکھنا سنت ہے، حضرات صحابہ نے حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو غسل وکفن کے بعد تخت پر رکھا تھا، اور بظاہر اس میں اکرامِ میّت بھی ہے اس فعل میں کوئی حرج نہیں، البتہ یہ ضرور نہیں کہ پلنگ اور تخت معمولِ معتاد سے اونچا ہو، تھوڑی سی بلندی سطحِ ارض سے کافی ہے، واللّٰہ اعلم قال فی الهندیة اذا حملوا علی سریر اخذوہ بقوائمه الاربع به وردت

السنۃ (ص ۱۰۳ ج ۱)

(۴) جنازہ پر پھول چڑھانا مکروہ ہے قال فی الھندیہ ویکرہ عند القبر ما لم یعھد من السنہ اھ (ص ۱۰۷ ج ۱) قلت والکفن والدفن کذلک فیکرہ فیھما ما لم یعھد من السنۃ ووضع الریاحین علی الکفن لم یعھد منھا، علاوہ ازیں یہ ہندوؤں کا طریقہ ہے، اس لئے تشبہ میں داخل ہے،

(۵) یہ تین بار میت پر فاتحہ پڑھنا خلاف سنت ہے، سنت یہ ہے کہ وقت نزع روح کے سورۂ یٰسٓ پڑھیں، اور بعد موت کے اس کے پاس قرآن پڑھنا بعض علماء کے نزدیک مستحب ہے، اور بعض نے غسل سے پہلے منع کیا ہے، بعد غسل کے ہر شخص آہستہ آہستہ جو توفیق ہو قرآن پڑھکر میت کو بخش دے، اور بعد دفن کے تھوڑی دیر قبر پر ٹھہر کر کچھ قرآن پڑھکر بخش دیں اور میت کے لئے دعاء کریں، باقی جس صورت سے بمبئی وغیرہ میں فاتحہ دیجاتی ہے یہ صورت بدعت ہے، ۹ر جمادی الاخریٰ ۴۲ھ

زوج کے لئے مردہ بیوی کو بلا حائل ہاتھ لگانا جائز نہیں،

سوال (۴) ھل یحل للزوج ان یقبل امرأتہ التی ماتت وکفنت بلا واسطۃ الثوب وغیرہ وھو لیس من قرابتھا ایضا؟

الجواب: لایجوز لہ مسھا بغیر حائل ولو کان من قرابتھا لعدم المحرمیۃ وبطلان النکاح بالموت قال فی الدر ویمنع زوجھا من غسلھا ومسھا لا من النظر الیھا علی الاصح قال الشامی عن الخانیۃ اذا کان للمرأۃ محرم یممھا بیدہ واما الاجنبی فبخرقۃ علی یدہ ویغض بصرہ عن ذراعھا وکذا الرجل فی امرأتہ الا فی غض البصر اھ قال ولعل وجھہ ان النظر اخف من المس فجاز بشبھۃ الخلاف اھ (ص ۸۹۷ ج ۱) قلت وجواز تیممہ ایاھا بخرقۃ یدل علی جواز مسہ ایاھا بحائل ولکنہ مقید ایضا بالضرورۃ فلا ینبغی المس بدونھا ولو بحائل ھذا واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۷ر صفر ۴۵ھ

ایام مخصوصہ میں ارواح کا گھروں میں آنا اور مقر ارواح کی تحقیق

سوال (۵) یہاں ہمارے علاقہ میں اکثر لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح جمعرات یا جمعہ کو مکانوں میں آتی ہیں، اور شب برأت میں تمام مردوں کی روحیں ضرور اپنے قرابت داروں کے یہاں

آیا کرتی ہیں، چونکہ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، اس لئے ان کا عقیدہ راسخ ہے، مگر آپ نے بہشتی زیور و نیز دیگر رسالوں میں لکھا ہے کہ روحیں مقید ہیں گھروں میں نہیں آتیں، اس لئے گذارش ہے کہ برائے مہربانی مطلع کریں، کہ آیا ارواح گھروں میں آتی ہیں یا نہیں، اور ایسا عقیدہ رکھنا از روئے شرع شریف کیسا ہے؟ برائے مہربانی کتابوں کا حوالہ بھی دیں،

الجواب: مقرارواح کے متعلق علماء میں بہت اختلاف ہے، انبیاء اور شہداء کے متعلق تو اتفاق ہے کہ وہ بعد وفات کے جنت میں رہتے ہیں، اور جسد عنصری سے بھی اُن کو تعلق قوی رہتا ہے، اور غیر شہداء یعنی عامۂ مؤمنین کے متعلق اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں وہ بھی جنّت میں رہتے ہیں، بعض کہتے ہیں جنّت سے باہر رہتے ہیں، بعض کا قول ہے کہ قبر کے پاس رہتی ہیں اور جہاں چاہیں چلتی پھرتی ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ ارواح مؤمنین بئر زمزم یا جابیہ میں رہتی ہیں (جو شام کا ایک شہر ہے) اور ارواح کفار حضرموت میں ایک کنواں برہوت ہے ان میں رہتی ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ ارواحِ مؤمنین علّیین میں رہتی ہیں اور ارواحِ کفار سجین میں رہتی ہیں، اور قبر و جسد عنصری سے بھی ان کو تعلق رہتا ہے، اور ممکن ہے کہ جابیہ و زمزم سے بھی کچھ تعلق ارواح مؤمنین کو اور بئر برہوت سے ارواحِ کفار کو بعد فوت کا ہوتا ہو، ذکر کل ذلک السیوطی فی شرح الصدور فی احوال الموتیٰ والقبور (ص ۹۱ تا ص ۱۰۲) وفیہ ایضا قال الحافظ ابن حجر فی فتاوٰہ ارواح المؤمنین فی علیین وارواح الکفار فی سجین ولکل روح بجسدھا اتصال معنوی لایشبہ الاتصال فی الحیٰوۃ الدنیا بل اشبہ شیٔ بہ حال النائم اتصالا قال ولھذا یجمع بین ما ورد ان مقرھا فی علّیین وسجین وبین ما نقلہ ابن عبد البر عن الجمھور ایضا انھا عند افنیۃ القبور قال ومع ذلک فھی ماذون لھا فی التصرف وتاوی الی محلھا من علیین اوسجین اھ ثم ایدہ السیوطی بما اخرجہ الحاکم عن ابن عباس قال بینما النبی صلی اللہ علیہ وسلم جالسا و اسماء بنت عمیس قریبا منہ اذ ردالسلام وقال یااسماء ھذا جعفر (بن ابی طالب) مع جبرئیل ومیکائیل مروا سلموا علینا واخبرنی

انہ لقی المشرکین یوم کذا وکذا الخ (ص ۹۶)

اور نصوصِ صحیحہ قرآنیہ وحدیثیہ سے حافظ ابن حجر کا قول زیادہ قوی ہے کہ مقر ارواح مؤمنین علیین ہے جو ایک مقام سماء سابع میں ہے، اور مقر ارواح کفار سجین ہے، جو ارض سابعہ کے نیچے ہے، لیکن ان مقامات میں ارواح مقید نہیں ہیں، بلکہ ان کو اپنے جسد اوّل سے اور قبر سے بھی تعلق رہتا ہے، اور بعض کو زمین میں تصرّف وسیر کا بھی اختیار دیا جاتا ہے، جس کے بعد وہ پھر اپنی مقر پر پہونچ جاتی ہیں،

باقی اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کہ سب ارواح جمعرات یا جمعہ کو یا پندرہ شعبان کو اپنے گھر آتی ہیں، کیونکہ اوّل تو زمین میں تصرّف کی سب ارواح کو نہیں ہوتی، بلکہ خاص خاص کو ہوتی ہے، دوسرے جن کو تصرف وسیر فی الارض کا اختیار بھی دیا جاتا ہے یہ ضرور نہیں کہ وہ جمعرات یا جمعہ ہی کو زمین میں تصرّف وسیر کریں، اور تصرف وسیر میں اپنے گھر بھی ضرور آئیں، پس یہ عقیدہ بلا دلیل ہے جس سے احتراز لازم ہے، حررہٗ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

اشرف علی عرض کرتا ہے کہ جب اس عقیدہ کا بے دلیل ہونا ثابت ہوگیا، اور عقیدۂ بے دلیل کے باب میں حکم شرع ہے لا تقف ما لیس لک بہ علم، پس بنا بر اس آیت کے ایسا عقیدہ رکھنے سے عاصی ومبتدع ہوگا، اس سے توبہ واجب ہے، اور کسی کتاب میں کوئی مضمون ہونا حجۃ شرعیہ نہیں تا وقتیکہ اس پر کوئی دلیل نہ ہو، اور یہ چونکہ یہ امر متعلق نقل کے ہے اس لئے دلیلِ نقلی ہونا شرط ہے، جو اصولِ شرعیہ کی رُو سے قابلِ استدلال ہو اور ایسی دلیل مفقود ہے، اس لئے ایسی کتاب کافی نہیں،

اشرف علی، یکم ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

حالتِ نزع میں محتضر کو پانی پلانا مستحب ہے

سوال (۶)............ بعض جگہ دستور ہے کہ بحالتِ نزع اس کے حلق میں شہد پانی میں ملا کر پلایا جاتا ہے، کیا اس کا شرعًا ثبوت ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا پلانا مفید ہے یا مضر؟

الجواب: حالتِ نزع میں محتضر کو پانی پلانا مستحب ہے، فقہاء حنفیہ نے اس کا استحباب ذکر کیا ہے، کیونکہ نزع کے وقت پیاس کا غلبہ اور شدّت ہوتی ہے، اور حضرات صحابہ سے بھی ثابت ہے کہ وہ معرکۂ قتال میں محتضرین کو پانی پلایا کرتے تھے،

قال فی نور الایضاح وشرحه ویستحب لاقرباء المحتضر واصدقائه وجیرانه الدخول علیه للقیام بحقه وتذکیرہ وتجریعه وسقیه الماء لان العطش یغلب لشدة النزع ولذلک یأتی الشیطان کما ورد بماء زلال (ای بارد) ویقول قل لا الٰه غیری حتی اسقیک نعوذ باللہ منه اھ (ص ۳۲۷) پس یہ دستور خلافِ شرع نہیں، بلکہ مستحسن ہے، ۱۹ ر رجب ۴۵ھ

حکم تحویل عظامِ میت

سوال (۷) یہاں پر ایک قبر ایک شخص کے مکان میں برآمد ہوئی جو بہت سی صدیوں کی معلوم ہوتی ہے، اور ہڈیاں اُن صاحب کی بدستور باقی تھیں، فتویٰ دیا گیا کہ اگر ان کو دوسرے قبرستان میں دفن کر دیں تو جائز ہے، بندہ عرض رسا ہے کہ یہ فعل مطابق شرع شریف کے ہوا یا کیا؟ آیا اسی جگہ رہنا چاہئے تھا، یا ہٹانے کے سبب کچھ گناہ ہوا اور خلافِ شرع ہوا دوسری جگہ جو دفن ہوئے تو کفن نیا دینا چاہئے تھا یا نہیں اور ان کے نمازِ جنازہ پڑھنی چاہئے تھی یا نہیں، اب یہ ہوا کہ وہ مکان جو بنایا گیا گر گیا، اور فتویٰ دہندگان کے لڑکے کا انتقال ہو گیا،

الجواب: مسلمان کی لاش اگر کسی جگہ زمین کھودنے سے نکل آوے تو اس کو اسی جگہ دفن کر دینا لازم ہے وہاں سے منتقل کرنا اور دوسرے قبرستان میں یا کسی اور جگہ دفن کرنا جائز نہیں، فقہاء نے اس سے منع کیا ہے، اور اس میں مسلمان میت کی بے حرمتی بھی ہے، جس شخص نے جوازِ نقل کا فتویٰ دیا اس نے بہت بُرا کیا، کہ قولِ فقہاء کو دیکھکر فتویٰ نہ دیا، لیکن اگر وہ مفتی اپنی غلطی کا اقرار کر لیں اور آئندہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دینے کا وعدہ کر لیں تو پھر اُن پر ملامت کرنا ایذاء پہونچانا جائز نہیں، اور اس صورت میں نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جا سکتی، کیونکہ نمازِ جنازہ کی صحت کے لئے جسم شرط ہے، اور ڈھانچ جسم نہیں، نیز تکرارِ صلوٰۃ جنازہ غیر مشروع ہے، الا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم حین فانہ صلوا علیہ مرۃ واخری فرادی وکان ذلک خاصا بہ، اور ظاہر یہ ہے کہ جس مسلمان کی لاش نکلتی ہے وہ نماز پڑھ کر دفن کیا گیا، قال فی مراقی الفلاح ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ ولا یجوز کسر عظامه ولا تحویلها ولو کان ذمیا[1] ولا ینبش وان طال الزمان اھ وذکر الطحطاوی فی حاشیته نحوہ وانکر علی فعل لحفار بن

[1] وفی حکم الذمی کما سیأتی ۱۲ منه

من نقل عظام الموتی او طمسہا او جمعہا فی حفیرۃ فلا یقال تضم او تجمع عظام الاول فی موضع دفعا للضرر عن موتی المسلمین وقال قبلہ ان ضم عظام المسلم یحصل بہ اخلال ولا تخلو بہ عن کسر بسبب التحویل رد لو شیئا اھ (ص ۷ ۳۵) واللہ اعلم

قبرستان میں لوبان سلگانا جائز ہے یا نہیں؟

سوال (۸) خیالِ ناقص خاکسار میں لوبان وخوشبو وغیرہ قبرستان میں سلگانا ناجائز معلوم ہوتا ہے، اکثر لوگ یہاں پر اس وجہ سے کہ آگ دوزخ کی ہوتی ہے منع کرتے ہیں لہذا جو حکم ہو، زیادہ حدِّ ادب،

الجواب: عن عمرو بن العاص قال لابنہ وھو فی سیاق الموت اذا انا مت فلا تصحبنی نائحۃ ولا نار الحدیث قال فی المرقاۃ ای للمباھاۃ والریاء کما کان عادۃ الجاھلیۃ قال ابن حجر ولانہا من التفاؤل القبیح وفیہ انہا سبب التفاؤل القبیح لا انہا بعضہ کما ھو ظاھر اھ (ص ۳۸۱ ج ۲) وفی حاشیۃ العلامۃ الطحطاوی علی المراقی فی علۃ کراھۃ الآجر فی القبر ما نصہ وبان الآجر بہ اثر النار فیکرہ فی القبر للتشاؤم بخلاف الغسل بالماء الحار فانہ یقع فی البیت فلا یکرہ الاجمار فیہ بخلاف القبر اھ (ص ۳۵۶)

اگر قبرستان میں خوشبو، لوبان وغیرہ سلگانا بغرض فخر وریا ہے تب تو کراہت ظاہر ہے، اور اگر یہ غرض نہیں جب بھی یہ فعل اچھا نہیں، کیونکہ اس میں قبر کے پاس آگ جلانا ہے، جو تفاؤلِ قبیح کا سبب ہے، اور گھر میں گرم پانی سے غسل دینا اور تختہ کو اور کفن کو دھونی دینا بضرورت ہے، نیز وہ گھر میں ہوتا ہے اس میں یہ محذور نہیں، اس لئے اس کو اس پر قیاس نہ کیا جاوے، فقط، ۱۹ر شعبان ۴۶ھ

محتضر کے لٹانے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

سوال (۹) ۔ جب کوئی مرنے لگتا ہے یا مرگیا، تو یہاں یعنی دکن میں سر اس کا مشرق کی طرف اور پاؤں مغرب کی طرف کر دیا جاتا ہے، اور سر تھوڑا اٹھا دیا جاتا ہے، تاکہ قبلہ کی طرف منہ اچھی طرح ہو جاوے، ممالکِ شمالی میں اس کے برعکس سر اس کا بجانبِ شمال اور پاؤں بجانبِ جنوب کرکے پہلوئے راست پر رُو بقبلہ لٹا دیا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں میں مشروع ومسنون طریقہ کون سا ہے، نیز

اس کے متعلق علماء ایں طرف نے مختلف رائے قائم کی ہے، جس سے از روئے شرع و احادیث معتبرہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون طریقہ معتبر ہے، لہٰذا آنجناب معلّٰی القاب سے التجا ہے کہ براہِ کرم متنازعہ فیہ مسئلہ پر اپنی خاصی رائے نیز بحوالہ کتبِ معتبرہ حنفیہ مدلّل و مبرہن ثبوتِ سنیت کس طریقہ میں ہے، تحریر جواب سے ہم راہ روانِ دین کی رہبری فرمادیں، مکرر آنکہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم کا جواب مندرجہ ذیل تھا، مگر اس پر یہاں کے لوگ حوالۂ کتب نہ ہونے سے معترض ہیں،

الجوابُ من المولوی المفتی عزیز الرحمٰن صاحبُ دیوبندی،

پہلا طریقہ سر بجانب شمال اور پیر بجانب جنوب اور منہ قبلہ کی طرف کر دینا یہی مسنون ہے

کتبہ عزیز الرحمٰن مفتی مدرسہ دیوبند، ۲۶ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۱ھ

الجواب صحیح، قال فی مراقی الفلاح یسن توجیه المحتضر ای من قرب من الموت علٰی یمینه لانه السنة وجاز الاستلقاء علٰی ظهره الخ قال الطحطاوی و یوضع هکذا فی الغسل والصلوٰة قال فی شرح الطحاوی وهو العرف بین الناس قال فی الزاد والاول افضل لانه السنة کذا فی المضمرات اھ ص ۳۶۵،

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ از تھانہ بھون ۱۶ر شعبان ۴۸ھ

کیا باپ کی موجودگی میں شوہر میت کا ولی ہو سکتا ہے؟

سوال (۱۰) میت کے باپ کی موجودگی میں شوہر اس کا ولی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا،

الجواب: زوج کو ولایت حاصل نہیں، ولایت عصبات کے لئے ہے، البتہ اگر میت کا کوئی ولی موجود نہ ہو تو زوج لوگوں سے مقدم ہے، پس صورتِ مسئولہ میں ولایت باپ کو حاصل ہے، اور اس باب میں وہ سب سے مقدم ہے، کما فی العالمگیریة (ص ۱۰۴ ج ۱) والاولیاء علٰی ترتیب عصبات الاقرب فالاقرب الا الاب فانه یقدم علی الابن کذا فی خزانة المفتیین قیل هو قول محمد وعندهما الابن اولٰی والصحیح انه قول الکل کذا فی التبیین وهکذا فی العنایة وفتح القدیر وفی الصفحة الاٰتیة ولا ولایة للزوج عندنا لانقطاع الوصلة بالموت کذا فی الجامع الصغیر لقاضی خاں فان لم یکن للمیت ولی فالزوج اولٰی ثم الجیران من الاجنبی، کذا فی التبیین، الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۸ر صفر ۴۵ھ

مرنے کے بعد بیوی کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا

سوال (۱۱) در مسئلہ مرقومہ علماء محققین چہ می فرمایند، بعد مرگ زوجہ ... با شوہر تعلق باقی ماندیا نہ ونیز دیدن و بدست گرفتن برائے شوہر جائز است یا نہ؟

الجواب: اگر عورت کا انتقال ہوجاوے تو شوہر کو اس کی طرف دیکھنا تو جائز ہے لیکن اس کو چھونا جائز نہیں، اور اس کو غسل بھی نہ دیوے، اور اگر مرد مرجاوے تو بیوی کو چھونا اور غسل دینا بھی جائز ہے، کذا فی الدر وغیرہ

فصل فی الغسل والکفن

میت کو غسل دیتے وقت کس طرح لٹایا جائے

سوال (۱۲) .... میت کو اُتر دکھن لٹا کے غسل دینا چاہئے یا کہ پورب پچھم، کسی کتاب میں بلکہ بہشتی زیور میں بھی اس کی تصریح نہیں ملی، امید کہ جواب باصواب مع حوالہ کتب تحریر فرمایا جاوے، فقط

الجواب: فی مراقی الفلاح فیوضع کما مات علی سریر مجمر وترا ویوضع المیت کیف اتفق علی الاصح) قالہ شمس الائمۃ السرخسی وقیل عرضا وقیل الی القبلۃ اھ وفی الطحطاوی (قولہ وقیل عرضا) ای کما یوضع فی القبر (قولہ وقیل الی القبلۃ) فتکون رجلاہ الیہا کالمریض اذا اراد الصلوٰۃ بایماء وفی القہستانی عن المحیط وغیرہ انہ السنۃ اھ ص ۳۳۰، خلاصہ یہ کہ غسل کے وقت جس طرح چاہیں میت کو لٹا دیں یہ اصح ہے، اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قبلہ کی طرف مُنہ کرکے عرضاً لٹادیں، جیسا کہ قبر میں رکھا جاتا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ قبلہ کی طرف طولاً لٹادیں، اس صورت میں پیر اور مُنھ دونوں قبلہ کی طرف ہوں گے، محیط وغیرہ میں اس طریقہ کو سنت بتلایا ہے، والامر واسع، واللہ اعلم، احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
ماشاء اللہ شفیت واشتفیت، اشرف علی

جنازے کا کپڑا پھاڑ دینے سے متعلق فتاویٰ عالمگیری کی ایک عبارت کا صحیح مطلب

سوال (۱) فتاویٰ ہندیہ ترجمہ عالمگیریہ کتاب الکراہۃ باب شانزدہم زیارتِ قبور کے بالکل آخر میں ہے، جنازے کا کپڑا پھاڑ دیا جاوے اس طرح کہ جس کام میں پہلے استعمال کیا جاتا تھا اس کام میں مستعمل نہ ہوسکے، اور متولی کو اس کا صدقہ کرنا جائز نہیں ہے

لیکن اس کو فروخت کرکے اس کے داموں میں کچھ مال زیادہ ملا کر دوسرا کپڑا خریدے، کذا فی جوہر الفتاوی، حضرتا! اس کا کیا مطلب ہے؟ پورا پورا مطلب و مفہومات ارقام فرماویں، جنازے کے کونسے کپڑے پھاڑ دیئے جاویں، یعنی پیراہن پائجامہ پگڑی وغیرہ یا فقط پیراہن، ہمارے یہاں تو فقط پیراہن پھاڑ کر اتارتے ہیں، کیونکہ میت کے عضو تنگ ہو جاتے ہیں، اس لئے پیراہن اتارنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے پھاڑ دیا جاتا ہے' باقی یہ قید کہ اس طرح پھاڑیں کہ پہلی طرح استعمال نہ آسکے اس کی کیا وجہ، غرضکہ بخوبی ارقام فرماویں، اور اصل کپڑا پھاڑ کر بیچنا اور نیا کپڑا خرید کرنا کیا ضروری ہے، سمجھ میں نہیں آتا؟

الجواب: فتاوی ہندیہ یں عالمگیریہ کی عبارت کا ترجمہ اس جگہ بالکل غلط کیا ہے عبارت عالمگیریہ یہ ہے ثوب الجنازۃ تخرق بحیث لایستعمل فیما کان یستعمل فیہ لایجوز للمتولی ان یتصدق بہ ولکن یبیعہ بثمن ویشتری بہ وبزیادۃ مال ثوبا اٰخر کذا فی جوھر الفتاوی، واللہ اعلم۔

(ترجمہ) جنازہ کا کپڑا پھٹ گیا، اس طرح کہ اب اس کام میں نہیں آسکتا جس میں استعمال کیا جاتا ہے تو متولی (وقف) کو یہ جائز نہیں کہ اس کو صدقہ کردے (کیونکہ اس میں وقف کو غیر مصرف میں صرف کرنا لازم آتا ہے) اور لیکن اس کو کسی قیمت پر فروخت کردے، اور اس قیمت میں کچھ اور ملا کر اس سے دوسرا کپڑا خریدلے الخ"، اور جنازہ کے کپڑے سے مراد اس عبارت میں وہ کپڑا ہے، جو کفن کے اوپر چادرہ کے طور پر ڈالا جاتا ہے، بعض لوگ جنازہ کی چارپائی اور اس کے اوپر کی چادر عام مسلمانوں کے لئے وقف کردیا کرتے ہیں، تاکہ ہر میت کے اوپر وہ چادر ڈالی جاوے، پس وہ چادر اگر پھٹ جاوے اور کام میں نہ آسکے تو اس کا حکم اس عبارت میں مذکور ہے، واللہ اعلم

۱۱ رمضان ۱۳۴۰ھ

کیا شوہر بیوی کے مرنے کے بعد غسل دے سکتا ہے؟

سوال (۳) اگر عورت مرجاوے تو اس کا خاوند اس کے جنازہ کا پایا پکڑ سکتا ہے یا نہیں، اور وہ اپنی بیوی کو اپنے ہاتھ سے قبر میں اتار بھی سکتا ہے یا نہیں، اور اگر کوئی عورت نہلانے والی موجود نہ ہو تو وہ اپنی بیوی کو اپنے ہاتھ سے نہلا سکتا ہے یا نہیں، اور اگر خاوند مرجاوے تو وہ عورت اپنے

خاوند کو نہلا سکتی ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی مسلمان کا مُردہ مر جاوے تو اس کے جنازہ کی نماز پڑھنی چاہئے یا نہیں جس نے کبھی نماز نہ پڑھی ہو، اس کے واسطے کیا حکم ہے؟

الجواب: مرد اپنی بیوی کے جنازہ کو ہاتھ لگا سکتا ہے لیکن اگر اس کے محرم موجود ہوں تو قبر میں نہ اُتارے، اور جو سب غیر محرم ہی ہوں تو شوہر بھی اس کو قبر میں اُتار سکتا ہے، اور اگر کوئی عورت نہلانے والی موجود نہ ہو تو عورت کو مرد غسل نہیں دے سکتا، نہ شوہر اور نہ محارم بلکہ شوہر اس کو تیمم کرا دے، اور شوہر کو تیمم کرانے کے لئے اس کے ہاتھ کو اور مُنہ کو دیکھنا جائز ہے، مگر چھوئے نہیں، بلکہ ہاتھ کو کپڑا لپیٹ کر تیمم کرائے، اور بیوی اپنے مرد کو غسل دے سکتی ہے، جبکہ کوئی مرد غسل دینے والا موجود نہ ہو،

مسلمان بے نمازی کے جنازہ کی نماز پڑھنا بھی ضروری ہے، بدون نماز کے دفن نہیں ہو سکتا، اگر بدون نماز کے دفن کیا گیا سب گنہگار ہوں گے، قال فی مراقی الفلاح والمرأة تغسل زوجها بخلافه ای الرجل فانه لا یغسل زوجته لانقطاع النکاح واذا لم توجد امرأة یغسلها تیممها (ای زوجها، ط) ولیس علیه غض بصره عن ذراعیها بخلاف الاجنبی اھ فانه یلف یده بخرقة وتیممها مع غض بصره عن ذراعیها الا ان تکون امة فلا تحتاج الی حائل اھ، (ص۳۳۳)
والله اعلم، ۲۴ ذی الحجہ س۴۴ھ،

کوئی عورت غاسلہ موجود نہ ہو تو بیٹا میت کو بہ نیت غسل تیمم کرادے، بیٹے کو غسل دینا جائز نہیں

سوال (۴۳).......... ایک عورت کا انتقال ایسی جگہ ہو کہ جہاں اس کا خاوند اور اس کا لڑکا دونوں موجود ہوں، اب میت کے غسل کے لئے کوئی عورت نہیں ملتی ہے، اور عنقریب دس میل یا پندرہ میل کے فاصلے پر نہ کوئی شہر ایسا ہے کہ جہاں مسلمانوں کے گھر ہوں، میت والوں کا شہر تین سو میل کے فاصلہ پر ہے اور میت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، حالانکہ جس جگہ میت ہے وہاں نمازی موجود ہیں، لیکن غسل میت کے واسطے تلاش کرنے سے بھی عورتیں نہیں ملتیں یہ حادثہ دھرم پور میں فی الحال درپیش ہوا ہے، اس لئے آپ کو تکلیف دی جاتی ہے،

الجواب: ایسی حالت میں میت عورت کا محرم یعنی لڑکا میت کو بہ نیت غسل کے تیمم کرا دے، یعنی دو مرتبہ مٹی پاک پر ہاتھ مار کر ایک بار تو میت کے مُنہ کو مل دے،

اور اس کے بعد ایک بار مٹی پر ہاتھ مار کر ہاتھوں کو کہنیوں تک مل دے، غسل نہ دیا جائے، کیونکہ اس میں بدن کھولنا اور جسم مستور کو ہاتھ لگانا پڑے گا، ولایجوز ذلك للرجال مع النساء قال فی مراقی الفلاح ولو ماتت امرأة مع الرجال المحارم وغیرهم یمموها کعکسه وهو موت رجل بین النساء وکن محارمة یممنه بخرقة تلف علی ید المیمم الاجنبی حتی لایمس الجسد یغض بصره عن ذراعی المرأة ولو عجوزا وان وجد ذو رحم محرم ییمم المیت ذکرا کان او انثی بلا خرقة لجواز مس اعضاء التیمم للمحرم بلا شهوة کالنظر الیهما منها له اه، ص ۳۳۳ مع الطحاوی والله تعالیٰ اعلم

۳ ربیع الاول ۴۶ھ

غسل میت کے متعلق بہشتی زیور کی ایک عبارت پر شبہ کا جواب

سوال (۵) بہشتی زیور مدلل مکمل طبع ثانی اشرف المطابع حصہ دوم ص ۷۷ میں اول مسئلہ یہ درج ہے "مسئلہ: اگر کوئی مرد مرگیا اور مردوں میں سے کوئی نہلانے والا نہیں ہے تو جو عورت اس کی محرم ہو وہی نہلاوے غیر محرم کو ہاتھ لگانا درست نہیں، اور اگر کوئی محرم عورت نہ ہو تو اس کو تیمم کرادو" الخ اس کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ کہاں سے اخذ کیا گیا ہے، بظاہر جہاں تک کتب فقہیہ کو دیکھا گیا، اس کے خلاف ہی ملا، فی البدائع وان لم یکن معهن ذلك فانهن لایغسلنه سواء کن ذوات رحم محرم اولا لان المحرم فی حکم النظر الی العورة والاجنبیة سواء فلما لا تغسله الاجنبیة فکذا ذوات محارمه ولکن تیممنه (ص ۳۰۵ ج ۱) وفی العالمگیریة (ص ۱۰۲ ج ۱) والاصل فیه ان کل من یحل له وطئها لوکان حیا بالنکاح یحل لها ان تغسله والافلا ومثله فی نور الایضاح، امید کہ حضرت اپنی رائے عالی سے مطلع فرما کر اس اشتباہ کو دور فرمائیں گے،

الجواب: عبارات فقہ تمام کتابوں میں قریبا وہی ہیں جو بدائع وعالمگیری میں ہیں جن کو آپ نے نقل کیا ہے، اس لحاظ سے نقلاً بہشتی زیور کا مسئلہ واقعی مخدوش ہے، مگر درایۃً اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ دو قاعدے کتاب الکراہۃ در مختار میں مصرح ہیں، تنظر المرأة من الرجل کنظر الرجل علیه وماجاز النظر الیه جاز لمسه ...... اس مجموعہ کا حاصل یہ ہے کہ ماسوی السرة الی الرکبة کا تو عورت محرم مس بھی

عہ البتہ طحطاوی کتاب الرضاع میں ہے وقیل تغسل فی ثیابها ۱۲ عبدالکریم عفی عنہ

کرسکتی ہے، اور ماتحت السرۃ الی الرکبۃ کا عدم مس جیسا عورت محرم کے لئے ممنوع ہے رجل کے لئے بھی ممنوع ہے، اور جس حیلۂ خرقہ سے مرد غسل دیتا ہے عورت بھی غسل دے سکتی ہے، اللّٰھم ان یقال ان حکم غسل المیت مفترق[ے] عن حکم النظر والمس[لے] فی الحیاۃ کما یدل علیہ قول البدائع الجنس یغسل الجنس ولا یغسل الجنس خلاف الجنس اھ واللہ اعلم، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا، ۲۰ر صفر ۴۸ھ

میت پھول جائے اور ہاتھ لگانے کے قابل نہ رہے تو اس کو کس طرح غسل دیا جائے؟

سوال (۶) بحوالہ کشف الغطاء ایک کتاب میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ اگر مردہ پھول گیا ہو اور اس کو غسل نہ دے سکیں تو پیٹ پر مسح کرنا کفایت کرتا ہے، انتہیٰ، مگر اس میں مسح کا کوئی طریقہ تحریر نہیں ہے، اگر یہ مسئلہ صحیح ہے تو طریقہ مسح تحریر فرمایئے، اور مقدار بھی واضح ہو،

الجواب: فی العالمگیریۃ ولو کانت المیت متفسخا یتعذر مسحہ کفی صب الماء علیہ کذا فی التاتارخانیۃ ناقلا عن العتابیۃ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر میت پھولنے کی وجہ سے ہاتھ لگانے کے قابل نہ ہو، یعنی ہاتھ لگانے سے پھٹ جانے کا اندیشہ ہو تو صرف پانی بہا دینا کافی ہے، کیونکہ ملنا وغیرہ ضروری نہیں، یہ روایت تو قواعد کے موافق ہے باقی جو روایت سوال میں درج ہے، اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ پیٹ اتنا پھول گیا ہے کہ اس پر پانی بہانا بھی ممکن نہیں تو باقی بدن کو دھو کر یعنی اس پر پانی بہا کر پیٹ پر صرف مسح کر دیا جاوے جیسا کہ زندہ کے لئے غسل و وضو میں حکم ہے تب تو صحیح ہے اور اگر یہ مطلب لیا جاوے کہ غسل کی جگہ صرف پیٹ پر مسح کافی ہے تو بالکل غلط ہے،

۱۷ر ذیقعدہ ۵۱ھ

فصل فی الصلوٰۃ علی المیّت

نمازِ جنازہ کے اندر ثناء، درود اور دعاء میں تقدیم و تاخیر کرنا

سوال (۱) نمازِ جنازہ میں قصدًا یا سہوًا آگے درود پیچھے ثنا یا اوّل دعاء تب درود پڑھے، غرض ایسی کچھ تقدیم یا

ے اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مظنہ شہوت کو بمنزلہ شہوت قرار دیا گیا، اور ضرورت شدید نہیں ہے، کیونکہ غسل کا خلیفہ تیمم موجود ہے، ۱۲ عبدالکریم عفا عنہ

لے فیہ ان المس یجوز بلا ضرورۃ فی الحیاۃ فبایّ وجہ لایجوز بعد الموت ۱۲ عبدالکریم عفی عنہ

تاخیر سے نماز درست ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب، نماز درست ہے، ۲۲ رجمادی الثانیہ ۴۱ھ

نمازِ جنازہ کو نمازِ جمعہ سے مقدم کرنے کا حکم،

سوال (۲)...... اگر جمعہ کی نماز کے کچھ قبل مسجد میں جنازہ آگیا، لوگ زیادہ ہونے کے واسطے اور سو آدمی لے کر جنازہ پڑھنے کے واسطے بعد نمازِ جمعہ کے جنازہ پڑھنا کیسا ہے، اگر امام کسی مصلحت سے جمعہ کی نماز کو معہ سنت پڑھ کر بعد اس کے نماز جنازہ پڑھے تو درست ہے یا نہیں، بینوا توجروا؟

الجواب، قال فی ردالمحتار وتقدم صلوٰة العید علی صلوٰة الجنازة والجنازة علی الخطبة والقیاس تقدیمها علی العید لکنه قدم مخافة التشویش کی لا یظنها من فی اخریات الصفوف انها صلوٰة العید، بحر، ومفاده تقدیم الجمعة علی الجنازة للعلة المذکورة ولانها فرض عین بل الفتوی علی تقدیم سنتها علیها ومر تمامه فی اول باب صلوٰة العید اھ (ص ۱۹۳ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ فتویٰ اسی پر ہے کہ نمازِ جنازہ کو نمازِ جمعہ اور اس کی سنتوں کے بعد پڑھا جائے، البتہ اگر جنازہ خطبہ سے پہلے آجائے، اور خطبہ سے پہلے جنازہ کی نماز پڑھنے میں نمازیوں کو انتشار وتشویش نہ ہو تو پہلے جنازہ کی نماز پڑھ دی جائے، اور اگر انتشار وتشویش کا احتمال ہو تو جنازہ کو نماز جمعہ اور سنتِ جمعہ کے بعد پڑھا جائے، واللہ اعلم، ۱۰ رجب ۱۳۴۲ھ

نمازِ جنازہ کی تکرار بدعت اور مکروہ تحریمی ہے،

سوال (۳)...... معروض اینکہ مسئلہ تکرار جنازہ میانِ علماءِ ایں دیار اختلافِ عظیم واقع گشتہ، فلہذا امید تام از تلطفِ عام ہمی دارد کہ مجرد وصول نیاز نامہ ہذا تحقیق تکرارِ جنازہ اگرچہ چار دفعہ باشد جائز و روا است یا چہ، برتقدیرِ اول بلا کراہت است یا با کراہت، واگر کراہت باشد تحریمیہ بود یا تنزیہیہ بزیر قلم فیض رقم مع حوالۂ کتب معتبرہ تحریر فرمایند،

الجواب، نمازِ جنازہ مکرر نہیں ہو سکتی، اس کا تکرار بدعت ہے، اور مکروہ تحریمی ہے، قال فی مراقی الفلاح فان صلی غیره ای غیر من له حق التقدم بلا اذن ولم یقتد اعادها هو ان شاء لعدم سقوط حقه وان تأدی الفرض بها ولا یعید معه ای مع من له حق التقدم من صلی مع غیره لان التنفل بها غیر مشروع کما

لا یصلی احد علیھا بعدہ وان صلیٰ وحدہ اھ قال الطحطاوی اما اذا اذن اولم یأذن ولکن صلیٰ خلفہ فلیس لہ ان یعید لانہ سقط حقہ بالاذن او بالصلوٰۃ مرۃ وھی لاتتکرر ولو صلی علیہ ولی وللمیت اولیاء آخرون بمنزلتہ لیس لھم ان یعیدوا لان ولایۃ الذی صلیٰ متکاملۃ اھ (ص ۳۴۴) البتہ ایک صورت میں تکرار نمازِ جنازہ جائز ہے، جبکہ اس شخص کے جو احق بالتقدم ہو بلا اذن کوئی دوسرا نماز پڑھا دے، اور احق بالتقدم نے اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی ہو تو یہ احق بالتقدم اعادہ نماز کر سکتا ہے، واللہ اعلم، ۱۲ ربیع الاول ۴۵ھ

نمازِ جنازہ میں سلام کے بعد ہاتھ چھوڑے یا پہلے،

سوال (۴) احقر کی نظر میں حضرت کے تتمہ فتاویٰ امدادیہ..... گذرا کہ صلوٰۃ جنازہ میں سلام پھیرنے سے آگے ہاتھ چھوڑنا، احقر کو خلجان ہوا کہ علماء دیوبند وغیرہ کے عمل اس کے خلاف دیکھا گیا، اور یہ مسئلہ لے کر اس دیار میں بہت ہی بحث وتکرار شروع ہو گیا، اور عوام میں فتنہ جگہ جگہ برپا ہو رہا ہے اب دریافت طلب یہ ہے کہ ایسے وقت میں عمل کس پر ہونا چاہئے، للہ رفع خلجان فرمادیں زیادہ والسلام مع الاکرام،

الجواب: اس مسئلہ میں اس سے زیادہ کچھ تحقیق نہیں ہو سکا جو تتمہ امداد الفتاویٰ میں ہے کہ یہ قول صحیح ہے، کہ دعائیں پڑھ کر ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، اور سلام بعد ہاتھ چھوڑنے کے کیا جاوے، کیونکہ وقت سلام کے نہ کوئی دعاء ہے نہ تحریمہ کا بقاء ہے، بلکہ سلام خروج من الصلوٰۃ کے لئے ہے، پس اس وقت نہ قیام لہ قرار فیہ ذکر مسنون کا تحقق ہے نہ حرمتِ صلوٰۃ باقی ہے، پھر ہاتھ باندھ کر سلام پھیرنے کی کیا وجہ ہے، مگر اس وقت تک علماء دیار کا معمول یہی دیکھا ہے کہ بعد تسلیم کے ہاتھ چھوڑتے ہیں، اور اس میں یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ سلام تکبیر رابع کے بعد معًا ہوتا ہے، اور سلام بھی دعاء ہے، اس لئے سلام کے وقت بھی وضع یدین بھی باقی رکھا گیا، لیکن ابھی تک شرح صدر نہیں ہوا، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا، واللہ اعلم، بہر حال یہ امر ایسا نہیں ہے جس میں نزاع وتکرار کیا جاوے کہ کلام محض اولویت میں ہے نہ کہ اباحت وحرمت میں، فقط ۱۳ ربیع الثانی ۴۵ھ

حکم نمازِ جنازہ بر فرقۂ قرآنیہ

سوال (۵) محلہ میں گاہ گاہ اموات ہو جاتی ہیں جن کا جنازہ مجھے پڑھنا ہوتا ہے، ان دنوں میں ایک شخص عبدالرحیم نامی اہل قرآن (فرقۂ معروفہ،

زمانۂ حال جس کا بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی ہوئے ہیں) کا انتقال ہوا، یہ شخص مجمع احباب میں یہ الفاظ کہتا تھا کہ صحاح ستہ محض خرافات ہیں، قرآن کے بعد کسی دوسری وحی کو ماننا صریح شرک ہے، اور ان احادیث کے ماننے والے اکفر ہیں، عوام میں تقیہ کرتا تھا، احقر نے مندرجۂ بالا الفاظ چار پانچ مرتبہ اس کی زبان سے سُنا تھا، چونکہ میرے محلہ کا تھا لوگوں نے نمازِ جنازہ پڑھنے کے لئے مجھ سے کہا، میں کنارہ کش ہوگیا، کیونکہ مجھ میں مخالفت کی جرأت نہ تھی، اب دریافت طلب یہ ہے کہ میں گنہگار تو نہیں ہوا؟ کیا مجھے جنازہ پڑھنا چاہئے تھا، لوگ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اُس نے توبہ کرلی ہو، تم نے اچھا نہیں کیا، آخر جماعت مسلمین میں شامل تھا؟

الجواب: قرآن کی طرح حدیث کا حجتِ شرعیہ ہونا اجماعی اور قطعی مسئلہ ہے، اور یہ فرقہ حجیتِ حدیث کا منکر ہے، خصوصاً جو شخص حدیث کو خرافات کہے اور قرآن کے بعد وحی حدیث کے ماننے کو شرک کہے وہ تو قطعاً کافر ہے، ایسے شخص کی نمازِ جنازہ پڑھنا آپ کو جائز نہیں تھا، اچھا کیا کہ ٹل گئے، فی العالمگیریۃ عن صدر الاسلام سئل عن من قرأ حدیثا من احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رجل همه روز خلشها خواند قال ان اضاف ذلک الی القاری دون النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینظران کان حدیثا یتعلق بالدین واحکام الشرع یکفر وان کان حدیثا لا یتعلق بہ لا یکفر ویحمل مقالتہ علی ان ارادتہ قراءۃ غیرہ اولی اھ (ص ۱۶۱ ج ۳) ومثلہ فی (ص ۱۶۳ ج ۳) والصحاح شاملۃ علی الاحکام وغیرھا فقط، ۶ر جمادی الاولی ۴۵ھ

متعدد جنازوں پر ایک نماز بھی کافی ہے،

سوال (۶) اگر چند جنازے موجود ہوں تو نماز ایک ہی کافی ہے یا متعدد؟ امید ہے مدلل و مشرح صاف صاف بیان فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

الجواب: چند جنازوں کی نماز ایک ساتھ بھی ہوسکتی ہے، اگر مردوں اور عورتوں کے جنازے مختلط ہوں تو امام کے قریب مَردوں کے جنازے ہوں اور عورتوں کے اُن کے پیچھے ہوں اور بچوں کے عورتوں اور مَردوں کے بیچ میں ہوں، اور دیندار کو غیر دیندار سے مقدم کیا جاوے، واللہ اعلم، ۲۶ر ذیقعدہ ۴۴ھ

دریا میں غرق ہوکر ایسی حالت میں لاش برآمد ہوئی کہ جسم کی صرف ہڈیاں باقی ہوں تو اُس پر نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں

سوال (۷) ایک دن دو عورتیں دریا میں ڈوب گئیں اور دوسرے دن تھانیدار نے کانٹا ڈال کر لاشیں نکلوائیں تو صرف ہڈی نکلی، یعنی سر سے پاؤں تک کل جسم کی ہڈیاں ایک میں ایک جڑی ہوئی نکلیں، تو اب اس کا جنازہ مثل اور مُردوں کے پڑھنا چاہئے یا نہیں یہاں تو اس کو صرف ایک کپڑے میں لپیٹ کر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا گیا تو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: قال الطحطاوی تحت قول مراقی الفلاح صلی علی قبرہ مالم یتفسخ مانصّہ ای تتفرق اعضاءہ فان تفسخ لا یصلیّ علیہ مطلقا لانہا شرعت علی البدن ولا وجود لہ بعد التفسخ اھ (ص ۳۴۵) وفی مراقی الفلاح فی شرائط الصلوٰۃ علی المیت والرابع حضورہ او حضور اکثر بدنہ او نصفہ مع رأسہ اھ (ص ۳۳۹) قلت والظاہر ان البدن یطلق علی مجموع اللحم والعظام لا علی العظام وحدھا، صورتِ مسئولہ میں ان ہڈیوں پر نماز پڑھنا نہ چاہئے تھا، بلکہ ویسے ہی کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دینا چاہئے تھا، واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۵/ ذی الحجہ ۴۳ھ

میّت کا جسم پھول اور پھٹ جائے تو نمازِ جنازہ ساقط ہو جاتی ہے؟

سوال (۸) .... حافظ محمد اسمٰعیل صاحب کے نمازِ جنازہ میں متعلق عوام کا یہ خیال ہے کہ چھ روز کے بعد پانی میں لاش ملی، اور لاش نکلنے کے بعد پانی کے باہر اُن کا پیٹ پھوٹ گیا، آیا اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی درست ہے یا نہیں؟ اس کا خلاصہ عنایت فرمایئے، باقی والسلام

الجواب، اس حالت میں نماز ساقط ہو جاتی ہے، کما یدل علیہ قول البحر (ص ۱۸۲ ج ۲) قول الکنز صلی علی قبرہ مالم یتفسخ لان الصلوٰۃ بدون الغسل لیست بمشروعۃ ولا یؤمر بالغسل لتضمنہ امرا حراما وھو نبش القبر فسقطت الصلوٰۃ اھ وقید بعدم التفسخ لانہ لا یصلی علیہ بعد التفسخ لان الصلوٰۃ شرعت علی بدن المیت فاذا تفسخ لم یبق بدنہ قائما اھ واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبدالکریم ۱۱/ محرم ۴۴ھ یوم جمعہ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۶/ محرم ۴۴ھ یوم جمعہ

اگر میّت کے جسم سے نجاست نکلنا بند نہ ہو تو اُس پر نماز پڑھی جائے یا نہیں؟

سوال (۹) ایک مُردہ کا پاخانہ بند نہیں ہوتا،

آیا اس کی نماز پڑھائی جاوے یا نہیں؟

الجواب: کفن دینے کے بعد اگر میت سے نجاست نکلے تو اس کو دھونے کی ضرورت نہیں اور اس پر اسی طرح نماز درست ہے، فی الشامی (ص ۵۸۵ ج ۱) (قوله وما خرج منه یغسله) ای تنظیفاً بحر قال الرملی ای لاشرطاً حتّی لو صلّی علیه من غیر غسله جاز وهذا مما لا یتوقف فیه اه وفی الاحکام عن المحیط یمسح ما سال ویکفن وفی کتاب الصلوٰة للحسن اذا سال قبل ان یکفن غسل وبعده لا اه قلت وسیأتی تمامه فی بحث الصلوٰة علیه (ای ص ۹۰۷)

کتبہ احقر عبد الکریم عفی عنہ ۲ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ، صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

جنازہ شرقاً و غرباً رکھ کر نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟

سوال (۱۰) میت کا جنازہ پڑھا گیا اور اس کی چارپائی شرقاً غرباً رکھی گئی، گویا پاؤں مغرب کی طرف اور سر مشرق کی طرف تھا، ایسا کرنے میں شرع محمدی مانع ہے یا نہیں؟

الجواب: سنت یہ ہے کہ امام کے سامنے جنازہ اس طرح رکھا جاوے کہ میت کا سر امام کے دائیں جانب ہو اور پاؤں بائیں جانب، اس کے خلاف کرنا بُرا ہے، کما فی الشامی وافاد ان السنة وضع رأسه مما یلی یمین الامام کما هو المعروف الاٰن ولهذا علل فی البدائع الاساءة بقوله لتغییرهم السنة المتوارثة ویوافقه قول الحاوی القدسی (ص ۹۰۸ ج ۱) احقر عبد الکریم عفی عنہ ۵ محرم ۱۳۴۵ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ، ۶ محرم ۱۳۴۵ھ

بے نمازی پر نماز جنازہ پڑھائی جائے یا نہیں؟

سوال (۱۱) .... غیر نمازی اشخاص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی جائے یا نہیں، قرآن خوانی کی جائے یا نہیں، محض اُن کو خوف دلانے کے لئے ہم ایسا کرسکتے ہیں یا نہیں، قبر میں دفن کردینے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن چند لوگ خفیہ طریقہ سے کسی وقت جاکر نمازِ جنازہ پڑھ لیا کریں، تاکہ غیر نمازیوں کو یہ راز نہ معلوم ہو، اور غیر نمازی سے کیا مراد ہے، بعض لوگ دو روز پڑھ کر دس روز غائب ہوجاتے ہیں اور پھر ایک روز پڑھ کر ایک ماہ غائب ہوجاتے ہیں، اگر ایسے غائب کردہ وقت میں فوت ہوگئے تو کیا حشر کیا جاوے، کیا غیر نمازی کی میت چالیس قدم گھسیٹنے کا حکم

بھی محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، بہر کیف جو کچھ حضور تحریر فرمادیں، غلام جواب کا دل و جان سے منتظر ہے،

الجواب: بے نمازی جو زیادہ تر نمازیں نہ پڑھتا ہو اس کے جنازہ کی نماز پڑھنا عام مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، بدون نماز کے دفن کرنا حرام ہے، زجر کے لئے اتنا کافی ہے کہ بستی کا عالم اُس کی نماز نہ پڑھے، باقی اور لوگوں کو پڑھنا ضروری ہے ورنہ سب گنہگار ہوں گے، اور قبر پر پڑھ لینا اس گناہ سے سبکدوش نہیں کرسکتا، لانہ جوز للضرورۃ واللہ اعلم
۲۲ر شعبان ۴۵ھ

جوتوں کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟

سوال (۱۲) اکثر لوگ جنازہ کی نماز جوتہ پہنے ہوئے پڑھتے ہیں، اور امام بھی، اور کوئی اوپر جوتے کے پیر رکھ لیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، اور بارش کے موسم میں جبکہ جوتے تمام ناپاکی سے اوپر تلے سنے رہتے ہوں، اور سب مٹی سے لتھے رہتے ہوں اس امام کے پیچھے جنازہ کی نماز پڑھے یا نہ پڑھے، اور اس میت کی نماز ہوگئی یا نہیں، جواز کی صورت کس طرح ہے،

الجواب: قال فی العالمگیریۃ ولو قام علی النجاسۃ وفی رجلیہ نعلان اوجوربان لم یجز صلوتہ کذا فی المحیط السرخسی ولو خلع نعلیہ وقام علیہما جاز سواء کان مایلی الارض منہ نجسا اوطاہرا اذا کان مایلی القدم طاہرا اھ (ص ۳۸ ج ۱) وفیہ ایضا الخف اذا اصابتہ النجاسۃ ان کانت متجسدۃ کالعذرۃ والروث والمنی یطہر بالحت اذا یبست وان کانت رطبۃ فی ظاہر الروایۃ لا یطہر الا بالغسل وعند ابی یوسف اذا مسحہ علی وجہ المبالغۃ بحیث لا یبقی لہا اثر یطہر وعلیہ الفتوی لعموم البلوی کذا فی قاضی خان اھ وفیہ ایضا والارض تطہر بالجفاف وزوال الاثر للصلوۃ لا التیمم کذا فی الکافی اھ (ص ۲۷ ج ۱)

(۱) اور جوتوں میں سے پیر نکال کر اوپر رکھ لئے تو یہ ضروری ہے کہ جوتوں کا اوپر کا حصہ جو پیر سے متصل ہے پاک ہو گو نیچے کا ناپاک ہو (۲) اگر جوتے پہنے پہنے نماز پڑھے تو یہ ضروری ہے کہ زمین اور جوتے کے اندر اور نیچے کی دونوں جانبیں پاک ہوں، لیکن نیچے کی جانب کو پاک کرنے کے لئے دھونے کی ضرورت نہیں، بلکہ زمین سے خوب اچھی طرح

رگڑ دینا بھی کافی ہے، اور اس صورت میں زمین کا پاک ہونا بھی شرط ہے،

(۳) اگر جوتہ نکال کر زمین پر کھڑے ہوں تو زمین کا پاک ہونا شرط ہے، اور زمین خشک ہو کر پاک ہو جاتی ہے، جبکہ ناپاکی کا اثر باقی نہ رہے، اس تفصیل سے تمام شقوق کے احکام معلوم ہو جائیں گے، واللہ اعلم ۲۳ر رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ

نماز جنازہ نماز عیدین سے مؤخر اور خطبہ عید سے مقدم کرنا چاہئے

سوال (۱۳) .... میت کی نماز عیدین پر مقدم ہونی چاہئے یا مؤخر،

الجواب: قال فی الدر وتقدم صلاتها ای العید علی صلاة الجنازة اذا اجتمعا وتقدم صلاة الجنازة علی الخطبة وعلی سنة المغرب وغیرها (کسنة الظهر والجمعة والعشاء ۱۲ شامی) والعید علی الکسوف اھ قال الشامی الاولی التعلیل بخوف التشویش علی الجماعة بان یظنوها صلاة العید ثم رأیته کذلک فی جنائز البحر عن القنیة اھ (ص ۸۶۵ ج ۱ باب العیدین)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کو نماز عید سے مؤخر اور خطبہ عید سے مقدم کرنا چاہئے، اور گو صاحب اشباہ نے نماز عید سے جنازہ کو مقدم کیا ہے ...... مگر راجح وہی ہے جو درمختار میں ہے، واللہ اعلم، قال فی الدر بعد العبارة المذکورة سابقا لکن فی البحر قبیل الاذان عن الحلبی الفتوی علی تاخیر الجنازة عن السنة واقره المصنف کانه الحاقا لها بالصلوٰة اھ (ص ۸۶۶ ج ۱) قلت وینبغی بناء علیه تاخیر الجنازة عن خطبة العید لکونها ملحقة بالصلوٰة العید وهو الارفق بالناس لما فی اجتماع الناس بعد الجنازة للخطبة من خشیة الانتشار والفرار، واللہ اعلم، اس روایت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نماز جنازہ کو خطبہ عید سے بھی مؤخر کیا جائے، اور یہی سہل ہے ورنہ لوگ نماز جنازہ کے بعد خطبہ نہ سنیں گے، واللہ اعلم،

۸ر شوال ۱۳۴۶ھ،

جس کی ختنہ نہ ہوتی ہو... مگر دیگر دلائل اس کے مسلمان ہونے کی موجود ہوں تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟

سوال (۱۴) .... ایک شخص مسمیٰ بھورے شاہ عرف موتی شاہ جو کہ مجذوب تھا اور ایک عرصہ دراز سے منصوری میں رہتا تھا، اور وہ قوم کا مسلمان تھا، جس گاؤں میں وہ رہتا تھا، ان سے تصدیق

ہوگیا کہ وہ مسلمان تھا، اور کم عمری میں دہلی کی طرف چلا گیا تھا، اور اب ایک عرصۂ دراز سے منصوری میں رہتا تھا، اور اس کا انتقال یہاں پر ہوگیا، اس کی ہم مسلمانانِ منصوری نے تجہیز و تکفین کرنا چاہی، اور نعش کو جامع مسجد منصوری میں لائے، تو ایک شخص کابلی جو کہ منصوری میں رہتا ہے، اور دوکانداری بساطخانہ وغیرہ کرتا ہے، اس نے کچھ مسلمانان یعنی قوم قصابان کو جو کہ وہاں پر موجود تھے بہکادیا، اور کہدیا کہ یہ شخص مسلمان نہیں ہی ہندو ہے، کیونکہ اس کی ختنہ نہیں ہوئی تھی، جبکہ وہ اس مکان سے نابالغی کی حالت میں نکل گیا تھا اس وجہ سے اس کی ختنہ نہیں ہوئیں، تو کیا اس سے یہ تصور کرلیا جاوے کہ وہ ہندو تھا، جبکہ تصدیق بیشتر ہی سے ہوچکی تھی کہ وہ مسلمان ہے، خیر یہ سب قصہ اس کابلی شخص نے کیا، اور کچھ مسلمانانِ منصوری علیحدہ ہوگئے، اور شریکِ جنازہ نہ ہوئے، پھر ایک شخص مرزا صاحب جو کہ محلہ راجمنڈی کی مسجد میں پیش امام ہیں انھوں نے اس کی تجہیز و تکفین کی، اور اُن کو بھی یہ کابلی شخص ہر قسم کی دھمکیاں دیتا رہا، کہ تم نے کافر کی تجہیز و تکفین کی ہے ہم تم کو جان سے ماردیں گے، اب اس قدر التجا ہے کہ اس مجذوب کی بابت جو کام ہم نے کیا وہ کس حد تک صحیح تھا؟

الجواب: جس شخص کے والدین مسلمان ہیں اور وہ نابالغی میں مجذوب یا مجنون ہوگیا، تو وہ مسلمان ہی مانا جاوے گا، اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھنی واجب تھی، ختنہ کے ہونے یا نہ ہونے سے اسلام و کفر کا حکم وہاں لگایا جاسکتا ہے جہاں اور کوئی صورت تحقیق اسلام و کفر کی نہ ہو، اور جہاں دوسرے دلائل موجود ہوں، وہاں صرف ختنہ کا نہ ہونے سے حکم کفر نہیں ہوسکتا، بس جن مسلمانوں نے اس میت کے جنازہ کی نماز پڑھی انھوں نے ٹھیک کیا، ایسا ہی کرنا چاہئے تھا، جو لوگ اس فعل پر انکار کرتے ہیں وہ احکامِ شرعیہ سے جاہل ہیں یا متجاہل، واللہ اعلم، ۶ر رمضان ۴۵ھ

غائبانہ نمازِ جنازہ کا حکم

سوال (۱۵) میت موجود ہوتے ہوئے باوجود قدرت شرکتِ نماز ایک قصبہ میں نماز غائبانہ ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: میت سامنے رکھے بغیر نماز جنازہ صحیح نہیں چاہے اس قصبہ وغیرہ میں پڑھی جاوے جس میں میت ہو، یا کسی دوسرے مقام میں دونوں کا ایک حکم ہے، فی العالمگیریۃ (ص ۱۰۵ ج ۱) ومن الشروط حضور المیت ووضعہ وکونہ امام المصلی فلا یصح

علی غائب ولا علی محمول علی دابۃ ولا علی موضوع خلفہ ھکذا فی النہر الفائق، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۸ صفر ۴۵ھ

نمازِ جنازہ میں کون شخص ولی سے احق بالامامت ہے،

سوال (۱۶) کدام شخص برائے نمازِ جنازہ لائق تر از ولی است بحوالہ کتب توجہ فرمایند،

الجواب؛ ولی سے مقدم سلطان وقاضی وغیرہ ولاۃ مسلمین ہیں، اور ان کی تقدیم والی پر واجب ہے اور امام محلہ وامام جمعہ کی تقدیم ولی پر مستحب ہے، فقط کتبہ الاحقر عبد الکریم ۲۹ ر ج ۱ ۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد

شوافع بلا عذر مسجد میں نماز جنازہ پڑھائیں توحنفیوں کو ان کی اتباع کرنی چاہئے یا نہیں

سوال (۱۷) میت کا ولی شافعی ہے، اور امام بھی، انھوں نے نمازِ جنازہ مسجد میں بلا عذر پڑھی توحنفیوں کو بحالتِ موجودگی اتباع کرنی چاہئے یا نہیں، نیز صورتِ مذکورہ میں موجود ہوتے ہوئے نماز ترک کرنے میں گناہ گار ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا عند اللہ،

الجواب؛ جب جماعت میں حنفی بھی ہوں اس وقت شافعی حضرات کو ان کی رعایت کرکے خارج مسجد انتظام کرنا چاہئے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو ایسے موقع پر مجبوراً حنفیہ کو شاملِ نماز ہو جانا چاہئے، اور عذر کی وجہ سے امید ہے کہ اُن پر مواخذہ نہ ہوگا، کما فی الفتاوی الشامیۃ ص ۹۲۶ ج ۱ تحت قول الدر (فلا صلوٰۃ لہ) تتمہ انما تکرہ فی المسجد بلا عذر فان کان فلا ومن الاعذار المطر کما فی الخانیۃ والاعتکاف کما فی المبسوط کذا فی الحلیۃ وغیرھا واللہ اعلم، اور جو شخص احتیاطاً شرکت سے پرہیز کرتا ہے اس کے لئے بھی گنجائش ہے، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۵ ربیع الاول ۵۱ھ

غیر من لہ حق التقدم نے نماز جنازہ پڑھائی، ولی اگر اعادہ کرے تو ولی کی نماز فرض ادا ہوگی یا نفل، اور جو لوگ سابق جماعت میں شریک نہ ہوسکے تھے اس میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

سوال (۱۸) سیدی المحترم ادام اللہ ظلال فیوضکم، بعد سلام مسنون معروض خدمت عالی اینکہ مسئلہ مندرجہ ذیل میں چند اشکال درپیش ہیں، امید ہے کہ ان کو حل فرماکر تسکین فرمائیں گے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ غیر من لہ حق التقدم نے اگر میت کی نماز پڑھائی تو ولی اعادہ کرسکتا ہے؟ اوّل اشکال یہ ہے کہ فرض جماعتِ اولی سے ساقط ہوگیا، اب ولی کی نماز فرض ادا ہوگی یا نفل، دوسرے یہ کہ ولی کے ساتھ وہ لوگ جنھوں نے اب تک نماز نہیں پڑھی شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریک نہیں ہوسکتے، اور ولی تنہا

نماز پڑھے، اس لئے کہ ولی کو اجازت اس لئے دیگئی ہے کہ اس کا حق باقی رہ گیا ہے، اور دوسرے لوگوں کا کوئی حق باقی نہیں رہا، لہذا جماعت ثانیہ ولی کے ساتھ نہیں ہو سکتی، اسی کی تائید اس مسئلہ سے ہوتی ہے، جو تیمم کے باب میں ہے، کہ ولی کے علاوہ اور لوگوں کو اگر فوتِ صلوٰۃ کا خوف ہو تو تیمم کرلیں اور ولی وضو کرے، اور لوگوں کو اگر ولی کے ساتھ نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی تو یہ چاہیئے تھا کہ اگر ولی کو وضو کرتے دیکھیں تو یہ بھی وضو کرلیں، اور ولی کے ساتھ شریک ہو جائیں اور جماعت ثانیہ کرلیں، اور تیمم نہ کریں، حالانکہ یہ کہیں نہیں ملتا، ادھر اس صلوٰۃ کا فرض کفایہ ہونا یہ بتلاتا ہے کہ فرض تو تھی ہر ایک پر مگر بعض کے ادا کرنے سے اوروں سے ساقط ہو جاتی ہے، اور اگر دوسرے بنفسہ ادا کریں تو ہر ایک سے فرض ہی ادا ہوگا، لہذا بعد میں ولی کی اور اس کے ساتھیوں کی نماز فرض ادا ہونی چاہیئے، جیسا کہ ایک شہر میں اگر کئی شخص اعتکاف کریں تو ہر ایک کی سنت ادا ہوگی، غرضیکہ بہت تردد ہے، بدائع و فتح القدیر و شامی وغیرہ بہت دیکھیں، جزئیہ مرقومہ کہیں نہیں ملتا، کہ تعددِ صلوٰۃ جنازہ اس طریقہ پر جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قال فی رد المحتار فالاحسن الجواب عما قاله المقدسی بان اعادة الولی لیست نفلاً لان صلوٰة غیره وان تأدى بها الفرض وهو حق المیت لکنها ناقصة لبقاء حق الولی فیها فاذا اعادها وقعت فرضاً مکملا للفرض الاول فلیس لمن صلی اولا ان یعیدها مع الولی لان اعادته تکون نفلاً من کل وجه بخلاف الولی لانه صاحب الحق اھ (ص ۹۲۳ ج ۱)

اس عبارت سے امور ذیل مستفاد ہوئے:۔ (۱) ولی کا اعادہ بطور نفل کے نہیں
(۲) جو لوگ پہلی جماعت میں شریک ہو چکے ہیں، اُن کو ولی کے ساتھ اعادہ مکروہ ہے
(۳) جو لوگ پہلے شریک نہ ہوئے ہوں ان کو ولی کے ساتھ نماز ادا کرنا جائز ہے، افادہ قید لمن صلی اولا وقیود الفقہ احترازیۃ، اور تیمم کے مسئلہ پر قیاس درست نہیں، کیونکہ جو لوگ جماعتِ اولیٰ کے وقت حاضر ہیں اور تیمم کر کے جماعت اُولیٰ کو پا سکتے ہیں، ان کو جماعتِ ثانیہ کا انتظار مکروہ ہے، اس لئے وہ مامور بالتیمم ہیں، کیونکہ انتظار جماعت ثانیہ میں جماعتِ ثانیہ کا گونہ اہتمام ہے، حالانکہ بعد ادائے فرض کے دوسری جماعت قابلِ اہتمام نہیں ہے، اور ولی کو تیمم کی اجازت اس لئے نہیں کہ وہ صرف اپنے حق کی وجہ سے

تنہا بھی نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے، اس کو انتظارِ جماعت کی ضرورت نہیں،

ایک ہی مکان میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو جل کر مرجائیں اور تمیز ممکن نہ ہو تو اُن پر نمازِ جنازہ کس طرح پڑھی جائیگی	**سوال** (۱۸) ایک گھر کے اندر کتنے مسلمان و ہندو رہتے تھے، اتفاق سے وہ گھر مع جملہ اشخاص جل گیا، ابھی مسلمان ہندو کا تمیز کرنا دشوار ہے اس وقت میں نمازِ جنازہ کس طرح

پڑھی جاوے ؟

الجواب : سب پر نماز پڑھ لی جاوے مگر نیت مسلمانوں پر نماز پڑھنے کی کی جاوے، کذا فی الشامیۃ، ص ۹۰۰ ج ۱ ورجح الصلوٰۃ فی الاحوال الثلث سواء کان الکفار اکثر او اقل او کانوا سواء ، واللہ اعلم ، ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ

فصل فی حمل الجنازۃ و دفنہا

تختے رکھ دینے کے بعد قبر پر مٹی ڈالنا مستحب ہے اور اس سے پہلے مکروہ ہے	**سوال** (۱) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میت کو قبر میں دفنانے کے بعد قبر میں مٹی

ڈالنا اندر کیسا ہے ؟

الجواب : جب میت پر تختہ وغیرہ رکھ دیئے جاویں، اس کے بعد تین مٹھی سے مٹی ڈالنا ہر شخص کو مستحب ہے، قال فی المراقی الفلاح و یہال التراب سترا لہ ویستحب ان یحثی ثلاثا اھ ، اور اگر تختے وغیرہ ابھی تک نہ رکھے گئے ہوں تو مٹی ڈالنا قبر کے اندر مکروہ ہے، کیونکہ اس میں تلویث میت ہے،

تدفین کے بعد ہاتھ اٹھاکر دعاء مانگنے کا حکم،	**سوال** (۲) ما قولکم علماء نا رحمکم اللہ، اس مسئلہ میں کہ بعد دفنِ میت کے جو دعاء ایصالِ ثواب کے لئے پڑھنا ثابت ہے'

اس دعاء میں رفع یدین کو مثل اور دعاؤں کے آدابِ دعاء سمجھنا اور عوام کا اسکو مثل واجب جاننا اور تارک کو قابلِ ملامت سمجھنا، اور دعاء میں اگر رفع ید کریں تو قبولیت میں منحصر کرلینا جائز ہے یا نہیں، اور بوجہ فسادِ عقیدہ عوام کے اس رفعِ ید کو ترک کرنا ضروری ہے یا نہیں' بینوا توجروا، بحوالۃ الکتب المعتبرۃ ؟

الجواب : بعد دفنِ میت کے دعاء بدون رفع یدین کے کرنی چاہئے، میں نے فقہ کی کسی کتاب میں اس موقع پر غیر رافع یدیہ کی قید دیکھی ہے، مگر اس وقت باوجود تلاش

بسیار کے وہ عبارت نہیں ملی، مگر قیاس اس کا مؤید ہے کیونکہ اس میں ایہام ہے، سوال من اہل القبور کا خصوصاً جبکہ عوام اس کو ضروری سمجھنے لگیں تو اس کا ترک کر دینا ضروری ہے،
۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۱ھ

میت کو قبر میں دائیں پہلو پر لٹانا چاہئے

سوال (۳) ہمارے اس ملک میں دستور پڑ گیا ہے کہ مردہ کو قبر میں چت لٹا کر فقط سر کو قبلہ رُخ کر دیتے ہیں، اور کتاب میں ہے دائیں کروٹ پر رکھ دینا اس میں کوئی خرابی ہے یا نہیں، اور حکم کتاب کس طریقہ پر ٹھیک رہے گا، ؟

الجواب: مُردہ کو قبر میں داہنے پہلو پر لٹانا چاہئے، اور کمر کو دیوارِ قبر سے سہارا دیدینا چاہئے، اور اگر لحد ہو تو کمر کے نیچے کوئی پتھر یا کچی اینٹ رکھ دینی چاہئے، تاکہ استقبال قبلہ باقی رہے، قال فی الدر ویستحب ان ید خل من قبل القبلة الیٰ ان قال و یوجه الیها وجوبا وینبغی کونه علیٰ شقه الایمن اھ وفی رد المحتار لکن صرح فی التحفة بانه سنة اھ ص ۹۳۵ ج ۱ مصری وفی حاشیة الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح وفی الحلبی ویسند المیت من المیت من ورائه بنحو تراب لئلا ینقلب اھ، ۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۱ھ

صندوقی قبر کی گہرائی کتنی ہونی چاہئے؟

سوال (۴) صندوقی قبر کی گہرائی زمین کی ہمواری سے میت کی نصف قد گہرائی ہو یا جہاں بانس قبر کا پاٹ بند کرنے کے لئے جس جگہ پر رکھا جاتا ہے وہاں سے میت کی نصف قد گہرائی مراد ہے ؟

الجواب: فقہاء نے جہاں گہرائی کا ذکر کیا ہے اس سے مراد زمین کی ہمواری سے ہی، گہرائی کا بیان کرنا ہے، لیکن گہرائی کا انحصار نصف قامت پر نہیں ہے، بعض نے نصف قامت لکھا ہے، اور بعض نے الی الصدر لکھا ہے، پس ہر جگہ کے مناسب جتنی گہرائی ہو اتنی گہرائی رکھنی چاہئے، قال فی نور الایضاح ویحفر القبر نصف قامة اوالی الصدر وان یزد کان حسنا لانه ابلغ فی الحفظ اھ (ص ۲۵۴) ۲ر صفر ۱۳۴۳ھ

قبر میں مُردے کو بٹھائے جانے کی وجہ سے قبر کو گہرا کرنے کا حکم، ، ،

سوال (۵) قبر میں مردہ کے پاس رومان فرشتہ آ کے مُردہ کو بٹھاتا ہے، اس بٹھانے پر گمان کر کے قبر کی پاٹ کا بانس کے نیچے دو ہاتھ یا ڈھائی ہاتھ گہرائی کھودتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مُردہ بیٹھنے میں پاٹ کے بانس سر میں نہ لگ جائے، یہ گمان گناہ میں داخل ہے یا نہیں ؟

اور اگر یہ دونوں مسئلے النور میں شائع کر دیئے جائیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوں گے،

الجواب: قبر کا قاعدہ یہ ہے کہ اوّل تو بغلی قبر افضل ہے، اگر بغلی نہ ہو صندوقی ہو تو بانس یا تختے وغیرہ میت کے جسم سے متصل ہونے چاہئیں، اور جس حصہ میں مٹی بھری جاتی ہے وہ زیادہ گہرا ہونا چاہیے، تاکہ جانوروں سے خوب حفاظت رہے، باقی میّت جو قبر میں اُٹھ کر بیٹھتی ہے تو وہ بیٹھنا برزخی ہے، جو اس جسم سے نہیں ہوتا، بلکہ جسم مثالی سے ہوتا ہے اس لئے اس بیٹھنے میں بانس وغیرہ اس کے سر میں نہیں لگتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی اس کے جسم سے قریب ہوں، باقی عذاب قبر جسم عنصری و جسم مثالی دونوں پر ہوتا ہے، اور میّت کے پاس رومان فرشتہ کوئی نہیں آتا بلکہ دو فرشتے آتے ہیں، جن کو منکر نکیر کہتے ہیں ہذا واللہ اعلم بالصواب، ۲ر صفر ۱۳۴۳ھ

میّت کو قبر میں رکھنے کا مسنون طریقہ،

سوال (۶) کوئی کہتا ہے کہ مردہ کو قبر میں چت کرکے رکھا جاوے اور مُنہ قبلہ کی طرف، کیا معنی؟ بلکہ اتمام وجود داہنی کروٹ کرکے قبلہ کی طرف کر دیا جاوے، اب کون بات صحیح ہے؟

الجواب: قال فی مراقی الفلاح ویوجه الی القبلة علی جنبه الایمن بذلك امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیاً لما مات رجل من بنی عبد المطلب فقال یا علی استقبل بالقبلة استقبالاً وقولوا جمیعا باسم اللہ وعلی ملة رسول اللہ وضعوه لجنبه ولا تکبوه علی وجهه ولا تلقوه علی ظهره کذا فی الجوهرة وفی الحلبی ویسند المیّت من وراءه بنحو، اس سے معلوم ہوا کہ میّت کو قبر میں داہنے پہلو پر قبلہ کی طرف کروٹ دے کر رکھنا چاہیئے، چت نہ لٹایا جائے اور اُس کی کمر کے نیچے سہارے کے لئے مٹی یا کچی اینٹ رکھ دی جائے تاکہ چت نہ ہو جائے اور استقبالِ قبلہ فوت نہ ہو جائے، واللہ اعلم ۷ر رجب ۱۳۴۵ھ،

میّت کو قبر میں رکھنے کے بعد سب بند کھولنے چاہئیں،

سوال (۷) . . . . مردہ کو غسل دے کر کفن پہنا کر ایک بند پیروں پر اور ایک کمر پر اور ایک سر پر باندھ دیتے ہیں، تو قبر میں رکھ کر یہ تینوں بند کھول دیئے جائیں یا کوئی سا بند نہ کھولا جائے، بعض صاحبوں کا یہ فرمان ہے کہ کمر کا بند نہ کھولا جائے، کیونکہ جب فرشتے مُردے کو حساب کے واسطے بٹھائیں گے تو مُردہ برہنہ ہو جائے گا،

الجواب: قبر میں مُردہ کو رکھ کر سب بند کھول دیئے جائیں کمر کا بھی اور سر و پیر

کا بھی اور برہنگی کا شبہ غلط ہے، مُردہ کا قبر میں بیٹھنا جسم مثالی سے ہوتا ہے، یہ جسم تو اگر کوئی پہرہ دے برسوں تک اسی طرح پڑا رہے گا، ۲۹ ربیع الثانی ۴۸ھ

فصل فی الشہید

جس شخص نے مرض ضیق النفس میں وفات پائی ہو وہ شہید کہلائیگا یا نہیں اور وہ شہید کامل ہے یا ناقص،

سوال (۱) کسی شخص کو مرض ربو ہو، جس کو ہندی میں دمہ کہتے ہیں، اس مرض میں اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ آدمی لیٹ نہیں سکتا، اور کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، کہ سانس کی بیماری بھی کہتے ہیں، اس بیماری میں سوائے بیٹھنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا اس مرض کی بابت کیسی ماہر حکیم سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ بیماری کس قدر تکلیف دہ ہے، اس کی بابت یہ دریافت کرنا ہے کہ جو شخص اس مرض میں مرجاوے تو آیا شہید مرتا ہے یا نہیں، شہید ناقص ہے یا کہ شہید اصلی ہے؟ یا کہ شہید نہیں ہے؟ کیونکہ ایک کتاب رسالہ رکن الدین مولوی رکن الدین صاحب کا ہے، اس رسالہ میں بہت سی ناقص شہید کی قسمیں بیان کی ہیں، یہ قسم نہیں ہے، اس لئے دریافت کرتا ہوں کہ شاید اس مرض والا بوجہ زیادہ تکلیف ہونے کے ناقص شہید کی قسم میں نکل آوے، اس کا جواب بہت ہی غور سے مطلع فرمائیں، آیا کوئی مستند حدیث سے ہے یا کوئی ضعیف حدیث ہے، یا کسی حدیث سے ثابت بھی ہوتا ہے یا کسی حدیث سے بھی ثابت نہیں ہوتا، اس کی بابت کوئی کتاب دیکھ کر پوری پوری طرح سے تحقیق فرما دیں؟

الجواب: علامہ سیوطیؒ نے احادیث مختلفہ کو جمع کر کے جو شہداء آخرت کو شمار کیا ہے تو ان میں من مات بالسل او بالصرع او بالحمی اور اس کے بعد من مات بالشرق کو بھی لیا ہے، کذا فی الطحطاوی علی المراقی، (ص ۳۶۷) تو مریض دمہ کی کیفیت موت شرق کے مشابہ ہے، بلکہ اشد ہے، اس لئے وہ بھی شہداء آخرت ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، ولا یصح الجزم فی مثلہ الا بنص صریح ولم یوجد اور سوائے مقتول فی سبیل اللہ فی المعرکہ کے اور سب اموات امراض شدیدہ شہداء ناقص ہیں، شہید کامل صرف مقتول فی معرکۃ القتال ہے، کہ وہ شہید دنیا و آخرت ہے، اور باقی شہداء صرف شہداء آخرت ہیں،